دیاباتی کی بیلا

ذکیہ مشہدی

ذکیہ مشہدی

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
New Delhi, INDIA

ذکیہ مشہدی

8 / فروری

نام	:	ذکیہ سلطانہ مشہدی
قلمی نام	:	ذکیہ مشہدی
پیدائش	:	یکم ستمبر 1944
تعلیم	:	ایم اے، نفسیات (لکھنؤ یونیورسٹی)
تصنیفات	:	طبع زاد افسانوں کے سات مجموعے دو ناول (تیسرا جلد اشاعت پذیر) تقریباً سولہ علمی و ادبی کتابوں کے ہندی/ انگریزی/ اردو میں ساہتیہ اکیڈمی، دہلی، نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، دہلی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے لیے ترجمے۔ دو درجن سے زائد چھوٹی چھوٹی کتابیں تعلیم بالغان کے ریاستی و ملکی رسورس سنٹرز کے لئے آسان ہندی و اردو میں۔
چند اہم انعامات	:	مرزا غالب ایوارڈ اقبال سمان ساہتیہ اکیڈمی، دہلی ایوارڈ برائے ترجمہ لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، یوپی اردو اکیڈمی لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، گورنمنٹ آف بہار تعلیم بالغان کے لیے لکھی گئی کتابوں اور نکڑ ناٹکوں کے لئے ریاستی و قومی سطح کے ایوارڈ

دیا باتی کی بیلا

ذکیہ مشہدی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

انتساب

ایک بزرگ شمس الرحمٰن فاروقی

اور

ایک خورد آصف فرخی کے نام

DIYA BAATI KI BELA

(Short Stories)

by

Zakia Mashhadi

Year of Edition 2022

ISBN : 978-93-94616-14-1

Price: ₹ 300/-

نام کتاب : دیا باتی کی بیلا (افسانوں کا مجموعہ)

مصنفہ : ذکیہ مشہدی

سنہ اشاعت : ۲۰۲۲ء

قیمت : ۳۰۰ روپے

مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

H.o. D1/16, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002 (INDIA)

B.o. 3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph: 45678203, 45678286, 41418204, 23216162

E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com

website: www.ephbooks.com

عنوانات

●●●

سکھیا سب سنسار، کھاوے اور سووے

دکھیا داس کبیر جاگے اور رووے

پیش لفظ

ایک مرتبہ میں نے ایک افسانہ (اپنی دانست میں عام سا) لکھا ''بکسا''۔ میں بہت متعجب ہوئی جب کئی لوگوں نے اسے بہت پسند کیا۔ ان میں شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، علی احمد فاطمی اور آصف فرخی شامل ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے فون کیا۔ کہنے لگے تقریباً ہر گھر میں ایسا ایک بکسا ہوتا تھا جس میں تہذیب بند ہوا کرتی تھی۔ ہمارے یہاں بھی تھا۔ اور بھی کچھ کہا۔ سب تو یاد نہیں ہاں دو چار منٹ کی اس دل خوش کن گفتگو میں انھوں نے کہا ''مگر ذکیہ تم روتی بہت ہو۔'' میں اس جملے پر بھی حیران ہوئی۔ ''کہاں روتی ہوں جناب۔'' انھوں نے اس کا جواب نہیں دیا ایک جملہ اور جڑ دیا ''اور آخر میں قاری کے سر پر ایک پتھر بھی دے مارتی ہو---'' اب ان سے کون بحث کرے میں تو ان کے افسانہ پسند کرنے کی وجہ سے سرور میں تھی۔

ایک سال کے مختصر سے عرصے میں اردو کے بہت سے لائق و فائق حضرات ہمارے درمیان سے اُٹھ گئے۔ سب کا بہت رنج ہے لیکن فاروقی صاحب کی رحلت کا زیادہ افسوس اس لیے ہے کہ ان کے سامنے میں اس رونے والی بات کا جواب نہیں دے سکی جو میں نے اس مجموعے کے اوّلیں صفحے پر درج کر دیا ہے ---سنت کبیر کے ایک دوہے کی صورت۔

کاش آج وہ ہوتے یا پھر مرنے والے ہم پیچھے رہ جانے والوں کی باتوں یا ان کے احساسات سے واقف ہوتے۔

ذکیہ مشہدی

5/ مئی 2022

دیا باتی کی بیلا

بہو- دیا باتی کی بیلا ہے بیٹا- ماں بھگوتی کو نمسکار کرو اور سب طرف بتی جلا دو- پھر پڑھائی کر لینا- بڑی ماں نے امبیکا کو اپنے مخصوص نرم اور محبت آمیز لہجے میں پکارا- امبیکا جب سے بیاہ کر آئی تھی، گھر کی پہلی روشنی وہی جلاتی تھی-

آئی بڑی ماں- امبیکا نے چونک کر دیکھا، واقعی شام گہری ہو چکی تھی- انگور کی بیل پر بسیرا لینے والی چڑیوں نے شور مچا رکھا تھا- سڑک پر اکا دکا روشنی ٹمٹمانے لگی تھی- نوٹس الٹ پلٹ کرتی امبیکا کو اندھیرے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا- اب امتحان بس مہینہ بھر دور تھے- امبیکا چاہ رہی تھی کہ شادی امتحانوں سے نبٹ لینے کے بعد ہو لیکن ایک تو انل کی دادی نے مہا متھ مچا کے رکھ دی تھی کہ ان کا چھ مہینوں کا کیا، چھ دن کا بھروسہ نہیں اوپر سے پنڈت جی بھی مہورت نکال کے بیٹھ گئے- پھر یہ دھمکی الگ دے ڈالی کہ انل کا بیاہ اسی مہینے نہ ہو گیا تو پھر پورے سال جوگ نہیں بنے گا، اگلے سال کی لگن کا انتظار کرنا ہو گا-

"ارے ہمارے پھونکے جانے کی تو لکڑیاں بھی چیری جا چکی ہوں گی- دادی نے بھنّا کر کہا تھا- یہاں یہ اگلے سال کی ساعت بچار رہے ہیں-"

پنڈت جی بھی ویسے ہی بوڑھے اور چڑچڑے اور خاندانی پنڈت ہونے کے سبب منھ لگے تھے- اتنا ہی بھنّا کر بولے "ہم کیوں بچاریں گے اگلے سال کی ساعت- اور جیسے ہماری لکڑی جہاں سے آئے گی وہاں کا تو ابھی پیڑ بھی نہیں لگا سمجھو- ارے یہ آپ کا لاڈلا- اس سے نمٹیے نا-"

شادی کی بات چل رہی تھی تو گھر والوں کی تفصیل سن کر امبیکا ذرا گھبرائی تھی۔ گھر میں دو بوڑھی عورتیں تھیں۔ ایک تو یہی اٹل کی تائی جنھیں وہ بڑی ماں کہتا تھا۔ دوسری دادی۔ دونوں بیوہ۔ شکل صورت اور لباس میں ایسی یکسانیت آگئی تھی کہ ساس بہو نہیں، چھوٹی بڑی بہنیں لگا کرتی تھیں۔ خزاں رسیدہ درخت پر لگے دو زرد پتوں جیسی۔ اب جھڑے کہ تب جھڑے اور موت ہاتھ میں جھاڑو لیے کھڑی تیار کہ بہار کے پھینکے۔ مردوں میں اٹل کے والد تھے اور ایک چھوٹے چچا جو چھ بھائیوں اور دو بہنوں کے بعد سب سے چھوٹے تھے اور کنوارے رہ کر اپنی بوڑھی، بیوہ ماں کے دکھوں میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ اٹل بھی بہت دن سے شادی ٹال رہا تھا اور خواتین کو ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں وہ چاچا کے نقشِ قدم پر تو نہیں چل رہا۔ اس لیے انھیں رات کو برے برے سپنے آنے لگے تھے۔ ان لوگوں کے علاوہ اٹل کے دادا کے وقت کے ایک بوڑھے پھونس منشی جی بھی تھے جو زمانہ قدیم سے ساتھ رہتے چلے آرہے تھے۔ اپنے گھر والوں کو انھوں نے آبائی گاؤں کے کسی کونے کھترے میں ڈال کر بھلا دیا تھا۔ منشی جی سے دور دراز کی رشتے داری بھی نکلتی تھی۔ کیسا عجیب و غریب اور غیر دلچسپ کنبہ ہے۔ امبیکا نے دل میں سوچا تھا لیکن اس غیر دلچسپ کنبے نے اسے اپنی محبت میں گلے گلے بھگو دیا۔ وہ سب کے سب اس نازک چھڑی سی کم عمر لڑکی کے احسان مند تھے۔ اس نے گھر میں رنگ بھر دیے تھے اور پائلوں کی رُن جھُن اور دلوں میں ایک امید کہ اب گھر میں ننھے بچے کی کلکاریاں گونجیں گی اور کڑے کے راجے زادوں کا خاندان اٹل پر آکر ٹھہر نہیں جائے گا۔ یہ اداس اجاڑ گھر بھی عام گھروں جیسا نظر آئے گا جہاں بوڑھوں کے ساتھ ننھے بچے بھی ہوں گے۔

ست رنگی آنچل سر پر ڈال کر امبیکا اٹھ گئی۔ ہاتھ جوڑ کر اس نے نظر نہ آنے والی لیکن کائنات میں جاری و ساری قوت کو پرنام کیا اور برآمدے کی لائٹ کا سوئچ آن کر دیا۔ بڑی ماں وہیں تخت پر سوپ میں ڈھیر سارا پالک لیے بیٹھی تھیں۔

"پہلے پالک بازار میں آتا تھا تو لگتا تھا کہ اب جاڑا آرہا ہے۔ ہرا ہرا پالک، لال سرخ ٹماٹر، سفید، دودھ جیسی مولیاں۔ اب مرا نہ جاڑے کا پتہ چلے نہ گرمی کی آمد کا۔ ہر سبزی ہر موسم میں لے لو۔ انتظار کر کے سبزی کھانے کا مزا ہی جاتا رہا۔" جب سے گھر میں بہو کے پیر پڑے تھے،

بڑی ماں خوب باتیں کرنے لگی تھیں ورنہ ان کی چپّی سے تو کلیجے میں ہوک اٹھتی تھی۔

امبیکا ہنسنے لگی۔ "تو اچھا تو ہے بڑی ماں ورنہ پالک پنیر کھانے کے لیے جاڑوں کا انتظار کرنا پڑتا، اور پالک کے کباب....." اس نے یوں ہی بے مقصد گفتگو آگے بڑھائی۔ اسے اپنی ان بزرگ چچیا ساس پر بڑا ترس آتا تھا۔ کوئی ان کی داستان لکھے تو لوگ کہیں گے کہ بے وقوف عورتوں کے آنسو گرانے کو دل سے گڑھی ہے۔ بڑی ماں کی داستان کسی نے نہیں لکھی تھی۔ کسی کہانی کا کردار نہ ہوتے ہوئے بھی وہ ہیروئن تھیں، ایک المیے کی ہیروئن۔

○

"کوئی پچاس سال سے بھی پہلے کی بات ہے۔ بڑی ماں کے پتا جی نے جنگھا دان کیا تھا۔ جنگھا دان یعنی بیٹی کو جانگھ پر بٹھا کر کیا جانے والا کنیا دان جسے گوری دان بھی کہتے ہیں۔ یہ اس وقت کیا جاتا تھا جب بیاہی جانے والی بچی بالغ نہ ہوئی ہو۔ تب اٹھارہ برس کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ایام شروع ہونے پر لڑکی بالغ قرار دے دی جاتی تھی۔

ہلدی والے دن بھی وہ اپنے پڑوس کے مراد علی چاچا کے باغ میں آم کے پیڑ پر چڑھی امیاں چرا رہی تھیں۔ وہاں سے انھوں نے اپنی سکھی کو آواز لگائی کہ وہ آکر نیچے دوپٹہ پھیلا کر کھڑی ہو جائے اور امیاں اکٹھی کرے۔

تاجو کی جگہ چھڑی کھٹکھٹاتے مراد علی برآمد ہوئے۔ بڑی ماں کو پتوں میں چھپے دیکھا تو حیران ہو کر بولے اری بٹیا پرسوں تو تیری بارات ہے نہ اور آج ہلدی؟"

"ہاں چاچا۔" انھوں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا پھر ایک سوال بھی کر ڈالا۔

"تاجو نہیں آئی؟ ہم امیاں ہاتھوں میں لے کر اتریں گے کیسے؟"

"بٹیا تو گھر جا ورنہ بڑے لالا ناراض ہوں گے۔ ضرور چپکے سے بھاگ آئی ہے۔ تاجو کی ماں اس کے بال گوندھ رہی ہیں۔ شام کو سب لوگ تیرے گھر جائیں گے۔ تاجو بھی اور تیری چاچی بھی۔ پھر انھوں نے اپنے بھانجے کو آواز لگائی، ارے سفرو۔ جا پارتی بٹیا کو چھوڑ آ جا کے۔ تھوڑی امیاں ساتھ لے لینا۔" وہ چھڑی کھٹکھٹاتے واپس ہوئے ادھر سفرو کا انتظار کیے بغیر پیڑ سے کود کے بڑی ماں یہ جا، وہ جا۔ لیکن کیا وہ اپنے گھر گئیں؟ نا جی، وہ سیدھی جا دھمکیں دوسرے

پڑوسی ہری رام کے باغیچے میں۔ ان دنوں ہر گھر میں دو چار پھلوں کے پیڑ ضرور ہوا کرتے تھے لیکن ان دونوں پڑوسیوں کے یہاں تو باقاعدہ باغیچے تھے۔ ہری رام کے یہاں کے امرود بے حد مزے دار ہوتے تھے اور ایک بڑی سی چتکبری تھی۔ اس سال امرود کچھ زیادہ ہی پھلے تھے۔ سبزی مائل سنہری، سڈول امرود جن پر ٹیں ٹیں کرتے طوطے منڈلاتے اور پڑوس کے سارے شرارتی بچے بھی۔

گھر میں بڑی ماں کی ڈھنڈیا مچ چکی تھی۔ ابھی انھوں نے امرودوں پر دو ایک پتھر چلائے ہی تھے کہ گھونگھٹ کاڑھے کوئی چاچی۔ تائی اچانک کسی جن کی طرح نمودار ہوئیں اور بڑی زور سے چلائیں، کلموہی آج تیری ہلدی ہے اور تو یہاں ہے کہ پیڑ کھسوٹ رہی ہے۔ مارے غصے کے انھوں نے پیٹھ پر ایک دھموکا بھی جڑا اور چٹیا پکڑ کر کھینچتی ہوئی لے گئیں۔ یہ لانبی، موٹی چوٹی تھی بڑی ماں کی جیسے ناگ لہریں لے رہا ہو۔ دادی بتاتی ہیں کہ جب وہ ان کے بال گوندھتیں تو ان کے ہاتھ درد کرنے لگتے انھیں سلجھاتے سلجھاتے لیکن نہ گوندھتیں تو کیا کرتیں اس چھوٹی سی لڑکی سے کہاں سنبھلتے گھناؤں ایسے بال۔ جھبری گھومتی۔ خیر یہ تو بعد کی بات ہے۔

بڑی ماں بیاہ کر باپ کے گاؤں سے شوہر کے گاؤں آ رہی تھیں۔ اپنی سسرال۔ وہ کوئی پانچ کوس دور تھی۔ دولہا گھوڑی پر تھا اور وہ پالکی میں۔ راستے میں لوگ ذرا کی ذرا آرام کرنے کو امرائیوں میں رکے۔ بڑی ماں نے پالکی کا اوہار ہٹا کر کاجل بھری آنکھوں سے دولہا کو تاکا۔ سر مور اور سہرے سے ڈھکی دولہا کی صورت ٹھیک سے دکھائی نہیں دی۔ قبل اس کے کہ وہ گردن کسی نیولے کی طرح باہر کو ذرا اور نکالیں ساتھ بیٹھی مہری نے کہنی سے ایک ٹہوکا دیا۔ گھبرا کر انھوں نے اوہار چھوڑ دیا۔

''بڑی ماں صرف پانچ کوس کی دوری طے کر کے نیہر سے سسرال پہنچیں تو بیوہ ہو چکی تھیں۔''

''آ ئیں!؟''

ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے بیٹھی، شوہر کے انداز بیان سے مسحور امبیکا کو اٹل جب یہ قصہ سنا رہا تھا تو اس کے اس جملے پر جو نہایت سادگی کے ساتھ بغیر کسی ڈرامائی کیفیت کے، ادا ہوا تھا امبیکا

بوکھلا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''اٹل!'' اس نے ہکلا کر اتنا ہی کہا۔ اس کی سمجھ میں قطعی نہیں آیا کہ اس نے جو سنا وہ ٹھیک ٹھیک سنا تھا۔

''بڑے چاچا کو راستے میں لو لگ گئی تھی یا شاید پہلے کبھی دل کی بیماری تھی جس کا اس زمانے میں آسانی سے پتہ نہیں لگ پاتا تھا۔ کچھ صورتوں میں تو آج بھی نہیں لگ پاتا۔ بہر حال گھر سے چند قدم پہلے وہ گھوڑے سے گر پڑے۔ اٹھا کر گھر لائے گئے تو صرف ٹھٹھر رہ گیا تھا۔ آتما جا چکی تھی۔ بیٹھ جاؤ امبیکا۔ اٹل نے ہولے سے کہا۔ میں تمھیں یہ قصہ صرف اس لیے سنا رہا ہوں کہ تم بڑی ماں کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کرو۔''

''پھر۔؟'' امبیکا نے دہل کر آنسو بھری آنکھوں سے نئے نویلے شوہر کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں اپنے لیے اکھنڈ سہاگ کی دعا مانگی۔

''پھر! پھر کیا؟'' بڑی ماں نے ساری زندگی اسی دہلیز پر گزار دی۔ صرف ایک بار مائکے گئی تھیں۔ وہ بھی اپنے پتا کی موت پر۔ دادی نے ہی انھیں عورت کی زندگی کی ان وارداتوں کو سمجھایا جو عموماً بڑی بہنیں یا بھابیاں سمجھایا کرتی ہیں۔ سب سے بڑے بیٹے کی موت، گھر کی ارمانوں بھری پہلی شادی کے اس انجام سے دادی بھی تھوڑی گئیں۔'' اٹل یک بہ یک خاموش ہو گیا۔

کچھ وقفے کے بعد جب امبیکا گلے میں پھنستا کچھ نگلنے میں کامیاب ہوئی تو اس نے سوال کیا۔ ''اٹل تمہاری ماں؟''

''اپنی ماں کی موت کی وجہ میں ہوں۔ اس کے لہجے میں تاسف تھا اور برہمی بھی۔ اماں کی جگہ میں مر جاتا تو انھیں دوسرا بچہ تو مل ہی جاتا۔ مگر مجھے ماں کہاں سے ملتی۔ وہ پھر پُرسکون ہو گیا۔ لیکن مجھے ناشکری نہیں کرنی چاہیے۔ بڑی ماں نے کبھی اماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جب بھی میں اماں کی موت کا رنج کرتا ہوں، بڑی ماں کے ساتھ بے انصافی کرتا ہوں۔ پھر بھی کہیں ایک پھانس سی کھٹکتی رہتی ہے۔ میں نے اماں کا منھ تک نہیں دیکھا۔ لوگ کہتے ہیں بڑی خوب صورت تھیں میری ماں۔ لانبی چھریری، سونے جیسی رنگت کی، اٹھارہ برس کی اماں۔ ہمارے گھر میں یوں پھرتی تھیں جیسے جیت بن میں ہرنی۔''

امبیکا نے دل میں کہیں رشک کا کانٹا سا چبھتا محسوس کیا۔ چھبیس، ستائیس برس پہلے زچگی کے چند دنوں بعد مرجانے والی ایک نوعمر، بدقسمت لڑکی سے مقابلے کا جذبہ۔ اس نے خود پر لعنت بھیجی۔

اٹل کی آواز پھر ویسی ہی تھی، پُرسکون، ملائم، کہیں دور سے آتی ہوئی۔ پھر بھی کسی جھرنے جیسی شفاف۔

''امبیکا میں اندھ وشواسی نہیں ہوں۔ ٹونے ٹوٹکے، پیر فقیر، پوجا پاٹھ میں یقین نہیں رکھتا۔ (ابھی تو نہ جانے برت ور برت آپ کب تک کھلتے رہیں گے۔ ابھی ہم آپ کو جانتے ہی کتنا ہیں۔ امبیکا نے سوچا اور ایک ٹک شوہر کا سلونا چہرہ تکتی رہی)

''مگر ایک بات میں نے بڑی عجیب سنی۔ اپنے ہی گھر میں۔ میری عقل نے کہا یہ اتفاق ہوسکتا ہے۔ تمہارا جو جی چاہے کہہ لینا۔ بور تو نہیں ہو رہی ہو امبیکا رانی؟'' اٹل نے اسے بڑی محبت سے دیکھا۔

''نہیں اٹل۔ بتاؤ نا کیا ہوا تھا؟''

''بڑی ماں پہلے تو حادثے کی شدت کو سمجھ ہی نہیں سکیں۔ نہ ہی اپنی بیوگی کو۔ دادی کے علاوہ کسی نے انھیں وہ محبت نہیں دی جو ایک کم عمر بچی کو ملنی چاہیے تھی۔ تب ہم لوگ گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ عورتیں انھیں کسی شبھ کام میں نہیں بلاتی تھیں۔ علی الصبح ان کا منھ نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ کئی بار عورتیں دادی کے پاس آئیں کہنے کہ بہو کو گھر میں بند کر کے کیوں نہیں رکھتیں۔ سہرے سہرے اَپ شگن ہوجاتا ہے۔ تب ان پر سخت نظر رکھی جانے لگی۔ شادی کے سارے زرق برق کپڑے تہہ کر کے صندوق میں رکھ دیے گئے۔ دادی نے انھیں گھر کے کمہار کی بیٹی کی شادی میں دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ کہا، کون اپنی بیٹی کا برا چاہے گا، ہم اپنے غریبا مئو کپڑوں میں سکھی رہیں یہی آشیرواد دیجیے۔ تب دادی نے انھیں مندر میں رکھوا دیا۔ جس کا جی چاہے، جو شگن اَپ شگن نہ بچارے وہ لے جائے۔ بڑی ماں سمجھ نہیں پاتی تھی کہ وہ یہ کپڑے کیوں نہیں پہن سکتیں، زور سے قہقہے لگا کر ہنس کیوں نہیں سکتیں۔ پھول کیوں نہیں پہن سکتیں۔ کسی ریت میں حصہ کیوں نہیں لے سکتیں۔ جب وہ سمجھ دار ہوئیں اور اس سنگ دل دنیا میں

اپنی جگہ پہچانی تو انھوں نے شاکر باڑی میں پناہ ڈھونڈی۔ بس مذہب کی اس افادیت سے میں انکار نہیں کر پاتا باقی تو...''

وہ یکایک ہنس پڑا۔ ''اب کیا میں اپنی نئی دلہن سے مذہب جیسے موضوع پر بات کروں گا۔ میں تو بڑی ماں کے بارے میں بتا رہا ہوں۔''

(کس قدر سست رفتار ہیں یہ۔ ارے جلدی سنایئے نا۔ امبیکا نے سوچا۔)

''بڑی ماں ہر وقت پوجا پاٹھ میں معروف رہتیں۔ کوئی سادھو فقیر دروازے پر آجاتا تو خالی ہاتھ نہ لوٹنا چاہیے وہ ڈھونگی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ عبدالرحیم خان خاناں کا دوہا دہرائی تھیں کہ جس نے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلایا وہ انسان گویا مرچکا لیکن اس سے پہلے وہ مرتا ہے جو سائل کو خالی ہاتھ لوٹا دیتا ہے۔ پھر میری ماں بیاہ کر آگئیں، بڑے چاچا اور میرے پتاجی میں عمر کا بہت فرق تھا۔ دونوں کے درمیان دادی کے کئی بچے تھے کچھ بچپن میں مر گئے تھے دو بیٹیاں بچی تھیں جو بیاہ کر اپنے اپنے گھر چلی گئی تھیں۔ پھر یہ کہ پتاجی کی شادی دیر سے ہوئی۔ ان کی ایک آنکھ میں پھولی تھی اس لیے رشتے نہیں آتے تھے۔ خیر نئی نویلی اماں گھر میں سولہ سنگھار کیے چھاجھر بجاتی گھوم رہی تھیں تبھی ایک مسلمان فقیر نے دروازے پر آواز لگائی۔ دادی اس کا حلیہ بتاتی تھیں اور دادی ہی اس قصے کی راوی ہیں۔ کالا بھجنگ۔ تمباکو کا چڑھا، لانبے لانبے سیاہ بال۔ لہراتی ہوئی، ناف تک پہنچتی داڑھی۔ نہایت لانبا چوڑا، سرخ آنکھیں، گلے میں ڈھیروں منکے اور ہاتھوں میں کشکول اور چمٹا۔ ہمارے احاطے میں آم، جامن، نیم اور نہ جانے کاہے کاہے کے درخت تھے۔ اماں ہی باہر نکلیں۔ انھیں نیم میں جھولا ڈلوانا تھا۔ فقیر پر نظر پڑی تو ڈر کر اُلٹے پیروں واپس بھاگیں۔ منھ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بڑی ماں نے آنچل پیشانی پر سرکا کر دروازے سے جھانکا تو فقیر نے نعرہ بلند کیا'' حق اللہ۔ جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔'' بڑی ماں نے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ بڑے سے سوپ میں بہت سے پھل اور گھر کے گیہوں کا گھر پر ہی تازہ پیسا آٹا رکھ کر لائیں۔ سارا سامان بڑی عقیدت سے اس کے کشکول میں اُلٹ دیا۔ اس نے ایک نظر بڑی ماں پر ڈالی اور بڑے نرم لہجے میں کہا'' اللہ کارساز ہے بٹیا۔ جا تیرے یہاں بیٹا ہوگا۔'' بڑی ماں کی ساری عقیدت ہوا ہوگئی۔ شرارے برساتی نظروں سے فقیر کو دیکھا اور بولیں

''ہم بال ودھوا ہیں اور ہندو ناری جو دوسرا بیاہ نہیں کرتی۔''

''جانتے ہیں، جانتے ہیں۔ دونوں باتیں جانتے ہیں۔''

''پھر؟'' بڑی ماں کی آنکھوں اور آواز دونوں میں شرارے برقرار تھے لیکن ان میں حیرت گھل گئی تھی۔

''من شانت رکھو بیٹی۔ پیدا کرنے والے سے پالنے والا بڑا ہوتا ہے۔ وہ اوپر والا سب کا داتا ہے کیا ہندو کیا مسلمان۔ اس کے کھیل نرالے ہیں۔ حق اللہ۔'' فقیر نے چمٹا بجایا اور بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے وسیع و عریض حاطے سے باہر نکل گیا۔ بڑی ماں بے چین ہو اٹھیں۔ فقیر کے سیاہ چہرے پر ایک جوت دہکی تھی انھیں اور آواز میں بلا کا اعتماد۔ ایک ایک لفظ نپا تلا۔ ایک ایک لفظ سچا۔''

امیکا کو بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ ''پھر!'' اس نے بہ دقت تمام کہا۔ کچھ کچھ سمجھ بھی رہی تھی کہ آگے کیا ہوا۔

''پھر۔ پھر میری نوجوان ماں نے مجھے نو مہینے پیٹ میں رکھ کر اپنے خون سے سینچا۔ زچگی کے درد سہنے کے بعد گود میں لے کر منہ چوما۔ میرے لیے بہت سے خواب بُنے، ارمان سنجوئے۔ چھ دن چھاتی سے دودھ پلایا اور ساتویں دن پرلوک سدھار یں۔ یہودیوں کے عقیدے کے مطابق خدا نے چھ دن میں دنیا بنائی اور ساتویں دن آرام کیا۔ اپنی ماں کی دنیا میں تھا امیہ!''

امیکا کے گلے میں پھر ایک گولا سا آن کر پھنس گیا تھا۔

''کیا ہوا تھا ماں کو؟'' اس نے بہ مشکل تمام آواز قابو میں رکھی۔

''پہلے عورتیں یوں ہی چپ چپاتے بچوں کی پیدائش میں مرجایا کرتی تھیں۔ گاؤں دیہات میں شاید اب بھی مرجاتی ہوں۔ ویسے دادی اسے پرسوتی کا بخار کہتی تھیں۔'' انل نے دور خلا میں دیکھا۔

''اماں کو اس دن لگ رہا تھا کہ وہ بچیں گی نہیں۔ انھوں نے بڑی ماں کو پاس بلایا اور مجھے ان کی گودی میں ڈال دیا۔ بڑی ماں بتاتی ہیں کہ ابھی میری آنول خشک ہو کر گری نہیں تھی اور میں کینہ۔ میں اکثر اپنی ماں کو ڈھونڈتا ہوں اور رنج کرتا ہوں کہ اپنی ماں کے ہاتھوں نہیں پلا

بڑھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ پیدا کرنے سے زیادہ پالنے والا بڑا ہوتا ہے، میرے ایمان میں کمی رہ جاتی ہے۔ یہ پڑھنے کے بعد مجھے بڑا صبر آیا کہ مہاتما بدھ جیسی ہستی کی ماں بھی انھیں چھ دن کا چھوڑ کر مرگئی تھیں اور ان کی خالہ نے، جو سوتیلی ماں بھی تھیں ان کی پرورش کی تھی۔ پھر بھی کبھی جب نیند نہیں آرہی ہوتی ہے تو میں سوچتا ہوں کہ کیا مرنے کے بعد میں اماں سے مل سکوں گا؟ کیا کہیں ان کا وجود باقی ہے؟ میرے دماغ میں جو شک کا کیڑا ہے اس کی وجہ سے مجھے لگتا ہے میں خلا میں ہاتھ پیر مارتا بھٹک رہا ہوں۔ کہیں کوئی زمین نہیں جس پر پیر ٹکا سکوں۔ مرنے کے بعد...''

امیکا نے دہل کر اس کے منھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ آئندہ ایسی بات منھ سے نہ نکالنا۔

ملائم ہاتھ کے ملائم لمس نے انل کا فطری کھلنڈرا پن واپس لا دیا۔ کیوں کیا میں کبھی مروں گا نہیں؟ بڑی مسخرگی کے ساتھ اس نے نئی نویلی دلہن کو چڑایا لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اسے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا اور ہولے سے کہا ''بے وقوف!''

○

پالک کے کباب ہی بنوا لیتے ہیں بڑی ماں۔ امیکا نے چونک کر کہا۔ شاید وہ کچھ دیر خیالوں میں ڈوبی کھڑی رہی تھی۔ ذہن کیسا جادوگر ہے۔ پل بھر میں پوری پوری کہانیاں دوہرا ڈالتا ہے لیکن کوئی جواب کا انتظار کرتا کھڑا ہو تو یہی پل گھنٹوں پر بھاری ہو اٹھتا ہے۔ سوپ میں پالک لے بڑی ماں وہیں کھڑی تھیں۔ 'جو جی چاہے بنوا لو بیٹا' امیکا نے مسکرا کر پالک ان کے ہاتھ سے لے لیا اور رسوئی کی طرف چلی گئی۔ اس نے چائے کی ٹرے سجائی۔ جب تک مہاراج چائے دم کرتے اس نے کبابوں کے لیے چنے کی دال اور گرم مسالہ نکال کر رکھا پھر سب کو چائے بھجواتی ہوئی اپنا پیالہ اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ آج انل ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اچھا ہی ہے 'گیا تو پڑھنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اسے سنت کبیر پر نوٹس مکمل کرنے تھے۔ لائبریری سے ایک اچھی کتاب مل گئی تھی۔ کاپیاں سرکا کر اس نے چائے کی پیالی کے لیے جگہ بنائی اور موٹی سی کتاب کے ابتدائی صفحات پلٹے۔

''کبیر کب پیدا ہوئے تھے اس کے واضح ثبوت نہ ملنے کے باوجود زیادہ تر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ کبیر سکندر لودی کے ہم عصر تھے۔ سکندر کی طاقت، اختیارات اور حوصلے لامحدود

تھے۔ اس کے لیے کسی اصول، کسی قانون کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ سلطنت اس کی خواہشات کے تابع تھی۔ ملک اور عوام، خاص طور پر ہندو عوام اس کی مہربانیوں کے محتاج تھے۔ انھیں کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ زندگی سوارت لگانے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ حکمراں کا حکم بجالانا۔

سکندر کی سیاست پر اس کا مذہب حاوی تھا۔ جہاں بھی ہندوؤں کی کوئی بغاوت ہوتی وہاں ہندوؤں کو جو سزا ملتی وہ تو ملتی ہی، ساتھ ہی اس علاقے کے سارے مندر تباہ کر دیے جاتے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی تھی۔ مندروں کی جگہ مسجدیں بنادی جاتی تھیں...''

چائے کا گھونٹ امیکا کی زبان پر تلخ ہو اُٹھا۔

فاضل مصنف نے یہ نہیں بتایا تھا کہ سکندر لودی نے کن علاقوں کے کون سے مندر توڑ کر وہاں مسجدیں بنائی تھیں اور اس کا تو کہیں ذکر تک نہیں کیا کہ سکندر کی سیاسی زندگی کا بڑا حصہ جون پور کی شرقی سلطنت کے آخری فرماں روا حسین شاہ شرقی کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے گزرا تھا۔ ان جنگوں میں جو ہزار ہا لوگ مارے گئے ان میں بیش تر مسلمان تھے۔ آخری فیصلہ کن جنگ نے تو شرقی سلطنت کو بالکل ہی تہ و بالا کر دیا۔ حسین شاہ ہار کر بنگال بھاگ گیا۔ سکندر نے اس مسلم سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ شرقی سلطانوں کی تعمیر کردہ پُرشکوہ عمارتیں اور عالی شان محلات زمیں بوس ہو گئے۔ پھر اس نے ان مسجدوں کو ہاتھ لگایا جو جمال و جلال کے انتہائی خوب صورت امتزاج کا مظہر تھیں۔ ہاتھی کی ہیبت اور ہرن کی سبک روی سے آراستہ جامع الشرق کا صدر دروازہ ٹوٹا۔ حسین شاہ کی ماں بی بی راجی کی بنوائی ہوئی لال دروازہ مسجد مجروح ہوئی۔ مسجد خالص مخلص کو داغ لگے۔ قریب تھا کہ ساری مسجدیں پوری طرح مسمار کر دی جاتیں کہ علمائے جون پور نے دخل اندازی کر کے سکندر پر کفر کا فتویٰ صادر کرنے کی دھمکی دی تب جا کے وہ رُکا۔ وہ بت شکن سے زیادہ مسجد شکن، پرا زرعونت سلطان تھا۔

لیکن امیکا کو یہ بتانے والا کم از کم اس وقت کوئی نہیں تھا۔ اس نے دانت پیسے اور مطالعہ جاری رکھا۔

''۱۲۰۰ء سے ۱۳۰۰ء کے دوران ہندو تہذیب اور سماج پر متواتر حملے ہوتے رہے۔ ہندو مذہب کو تباہ و برباد کر دینے کی ہر ممکن کوشش اختیار کی گئی۔ وعظ و پند، لالچ و عقوبت، تفرقہ

اندازی۔ سارے ہتھکنڈے آزما لیے گئے۔ حالات یہ بتا رہے تھے کہ بت پرست کتنے بے سہارا کمزور اور قابلِ رحم بن چکے تھے اور بت شکن کتنے طاقت ور، جابر اور دنیاوی جاہ و حشمت سے آراستہ۔''

امیکا نے کتاب بند کر دی۔

''بھوجی۔ پالک کا پانی پورا سکھا دیں کہ تھوڑا رہنے دیں۔'' یہ پالک کے کباب جیسی چیزیں مہاراج نے کبھی بنائی نہیں تھیں۔ وہ کھیسیں نپورے کمرے میں جھنک رہے تھے۔ ادھر سے بڑی ماں کے چلانے کی آواز آئی۔ ''ارے مرے بہو کو کیوں پریشان کر رہا ہے۔ پڑھنے دے نا۔ ادھر آ، ہم سے پوچھ لے کیا کرنا ہے۔''

''جو جی چاہے کیجیے۔ ہمارے آنے سے پہلے کچھ نہیں بناتے تھے کیا؟ مٹی پھنکاتے تھے لوگوں کو؟'' امیکا کسی کٹ کھنی بڑھیا کی طرح غرائی۔ مہاراج حیران رہ گئے۔ ایسا میٹھا بولنے والی بہورانی اس وقت اتنا کڑوا کیوں بولیں۔ وہ غصہ کر بھی سکتی ہیں وہ تو یہ یقین کرنے کو بھی تیار نہیں تھے۔ آنکھیں پھاڑے وہ موٹی عقل والا مونا رسو یا وہیں کھڑا رہا جیسے زمین نے اس کے پیر پکڑ لیے ہوں۔ امیکا مزید ناراض ہوئی۔ ''اب یہیں کھڑے رہیں گے کیا۔ جائیے پان سکھا لیجیے ٹھیک سے۔'' بہو کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے سٹک لیے۔

امیکا نے میز پر سر ٹکا دیا۔ اب سے وہ تاریخ اور ادب کو کھانے سے پہلے نہیں اٹھائے گی۔ یہ سارا کچھ پڑھ کر بھوک مر جاتی ہے اور خون آگ پر چڑھی ہنڈیا کی طرح کھدبد کھدبد کرنے لگتا ہے۔ ان لوگوں نے تتنے مندر توڑے اور آج اگر اجودھیا میں ایک ڈھانچہ گرا دیا گیا تو تب واویلا؟ کہنے کو تو مسلماں اور ان کے ووٹ بٹورنے والے سیاسی پٹھو، سب مسجد۔ مسجد رٹتے رہتے ہیں لیکن پچھلے پچاس برسوں سے وہاں نماز نہیں پڑھی گئی تھی۔ اس پر بھی ڈھانچہ گرا تو بنگلہ دیش اور پاکستانی بلڈوزر لے لے کے اپنے یہاں کے مندروں پر چڑھ دوڑے۔ پچاس مندر توڑ ڈالے، ان کی بات کوئی نہیں کرتا نہ مسلمان نہ جھوٹے سیکولرزم کا ڈھنڈورا پیٹنے والے، ہر وقت مسلمانوں کے غم میں مگرمچھ کے آنسو بہانے والے۔ کروڑوں میں ایک تسلیمہ نسرین کی آواز اٹھی تھی تو اس کے سر پر انعام مقرر کر دیا۔ دیس نکالا دے دیا۔ کیسی کٹر قوم ہے۔ ہے بھگوان

انھیں ہمارے سر پر کیوں تعینات کر دیا، ان ملیچھوں کو... کبھی کبھی لگتا ہے یہ اٹل بھی ان کی طرف سے بہت بولنے لگتا ہے۔ مگر کتنی محبت کرتا ہے ہم سے۔ غصہ بھول کر امبیکا مسکرائی۔ یہ ہماری ہندو تہذیب، ہمارا ہندو سماج ہے کہ دو اجنبی انجان لوگ بیاہ کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے اتنی محبت کرنے لگتے ہیں۔ محبت نہ ہو پائے تو بھی ساتھ نباہ دیتے ہیں۔ ایک مغربی تہذیب ہے۔ ٹھوک بجا کے، گھوم پھر کے بلکہ ساتھ سو کے بیاہ کریں تب بھی ایک تہائی شادیاں پانچ سال بھی نہ ٹک پائیں۔ رہے مسلمان تو ایک کے رہتے دوسری لے آویں آرام سے۔ بلکہ تیسری اور چوتھی بھی۔ بیسوں برس کی بیاہتا کو کھڑے گھاٹ طلاق طلاق طلاق کہہ کے نکال باہر کریں۔ یونیفارم سول کوڈ کی بات کرو تو لگے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا۔

''اے۔'' اٹل نے محبت میں شرابور لہجے میں پکارا۔ کتنا پڑھتی ہو بھائی؟''

امبیکا چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اٹل نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ کیا بات ہے؟ اس نے متفکر ہو کر پوچھا۔ وہ اپنی اس چند مہینوں کی دلہن کے سارے رنگ پہچاننے لگا تھا بازوؤں میں آ کر امبیکا نے نہ تو بے ساختہ انداز میں اس کے شانے پر سر ٹکایا تھا نہ اس کے چہرے پر وہ میٹھی مسکراہٹ ابھری تھی جو اس کی سادہ سی صورت کو ایک دل فریب حسن بخشا کرتی تھی۔

''امتحانوں کو لے کر پریشان ہو؟'' اس نے پھر محبت بھرے لہجے پوچھا۔ ''کیا پڑھ رہی تھیں؟ ہندی ساہتیہ؟ کبیر؟''

کبیر کی بے چین روح کہیں آسمانوں میں چکراتی پھر رہی تھی۔ ''ہم نے جس چیز کے لیے ساری زندگی انتھک کوششیں کیں، لوگ ہمارے اوپر کتابیں لکھ کر اسی میں سیندھ لگا رہے ہیں۔ ہم نے گیان پر بہت زور دیا امبیکا رانی لیکن ادھورا گیان جہالت سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔''

''پاپا کو کبیر سے بہت دلچسپی ہے۔ اٹل کہہ رہا تھا۔'' اور ان کے ایک دوست ہیں منان صاحب۔ انھوں نے کبیر کا گہرا مطالعہ کیا ہے حالاں کہ وہ سائنس کے آدمی ہیں۔ ہم تمھیں ان کے پاس لے چلیں گے۔ تمھارا مقالہ ہے نا کبیر پر؟''

''ہم نہیں جا رہے ہیں کسی منان صاحب کے یہاں۔'' امبیکا نے بگڑ کر کہا۔

''ہم ایسے مت کہو ہے رانی۔ بڑے عالم آدمی ہیں اور بزرگ بھی۔''

''ہوں گے۔''

''واقعی خفا ہو۔ کیوں ہو یہ تو نہیں بتاؤ گی۔ اچھا امتحان کی باتیں ابھی اٹھا کر رکھ دیں۔ یہ بتاؤ رات کے کھانے میں کیا کھلا رہی ہو؟''

اب کی امبیکا مسکرائی۔ وہی دل کش مسکراہٹ۔ ''پالک کے کباب اور...''

''ارے باپ رے۔'' اٹل کراہا۔ ''پالک کے کباب۔ یار کباب تو صرف ایک چیز کے ہوتے ہیں۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ گوشت کے۔ چلو بقرعید نزدیک ہے بہترین کباب ملیں گے کھانے کو۔''

''مسلمانوں کے محلے میں رہتے ہو۔ انھیں کی طرح ہوتے جا رہے ہو۔'' اس نے نفرت سے ناک سکوڑی۔

''کائستھ تو ہوتے ہی ہیں آدھے مسلمان۔ مسلمانوں کے محلے میں رہیں یا نہ رہیں۔'' وہ ہنس پڑا۔ ہمیں تو یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ تم گوشت نہیں کھاتیں۔ خیر ست کھاؤ لیکن یار یہ پالک کے کباب اور کٹہل کی بریانی۔ نیرد چودھری جیسا مسلمانوں سے بدکنے والا براؤن صاحب بھی ان کے باورچی خانے کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ بلکہ یہاں تک کہہ گیا کہ ہندوستانیوں کو کھانا پکانے اور کھانے کا فن سنٹرل ایشیا سے آنے والے ان حملہ آوروں نے ہی سکھایا ورنہ اگر کہیں کھانے میں کچھ اچھا تھا تو بنگال میں ہی تھا۔ اٹل نے قہقہہ لگایا۔ علاقائی عصبیت سے اوپر نہیں اٹھ سکے۔ پورا مطبخ صرف رس گلوں پر منحصر تھا، اور ہاں سندیش۔ چلو ماچھیر جھول اور جوڑ دو۔ وہ پھر ہنسا۔ بنگالی پن نہ گیا کبھی نیرد بابو کا۔ راکھ صاحب بنے اور انگلینڈ میں جا کر بس گئے۔''

''یہ کہاں کی ہانک رہے ہو اٹل۔ خالص مسلمانوں کی زبان بولتے ہو اور یہ نیرد بابو کون تھے اور یہاں ان کا کیا کام؟''

ہاں یہ تو ہے۔ تم جیسی پری بغل میں ہو اور یہ اوٹ پٹانگ بکواس کی جائے! اس نے شرارت سے آنکھ دبائی اور بیوی کا ایک بھر پور بوسہ لیا۔ محبت کی مٹھاس میں پگا اور خواہش کی حدت میں تپا گرم رسیلی امرتی جیسا اچانک بغیر کسی تمہید کے لیا جانے والا سر سے پاؤں تک ایک

ازلی مستی میں شرابور کر دینے والا ایک بھرپور مرد کا طویل بوسہ امبیکا کی شرم سے جھک جانے والی نظریں لمحے بھر کو شوہر کی آنکھوں سے چار ہونے کے بعد ہی جھکی تھیں۔ گرتی شام کے ملگجے دھندلکے میں ڈھولک کی تھاپ پر خسرو کی آواز گونجی ''موہے سہاگن کینی رے، موسے نینا ملائے کے۔'' ایک مرد اور ایک عورت۔ اردھ ناریشور کی تصویر بنے جیسے منجمد ہو اُٹھے۔ کیا اسی سکھ کو کن پہنچے جوگیوں نے خدا کی ذات میں ضم ہونے کے سکھ کا مترادف قرار دیا ہے اور کیا واقعی کچھ نظریں ایسی ہوتی ہیں محض جن کے ملنے سے ایک دوشیزہ سہاگن ہو اُٹھتی ہے؟

○

متان صاحب سے ضرور مل لینا، کبیر پر ان کے پاس کئی اچھی کتابیں ہیں اور ان کا مطالعہ بھی بہت ہے۔

''ان کے پاس اردو میں ہوں گی؟'' امبیکا کے لہجے میں قدرے تحقیر تھی۔

سوشیل کمار تم ہنسے۔ اردو والوں نے کبیر کو کب اپنایا جو اردو میں کبیر پر کتابیں ملیں گی۔ علی سردار جعفری کی کبیر بانی کے علاوہ میرے علم میں اور کوئی کتاب نہیں ہے جو اردو میں ہو۔ متان صاحب ہندی ہی نہیں سنسکرت بھی جانتے ہیں۔

''اچھا؟'' امبیکا کو حیرت ہوئی۔

''اگر تم کبیر کے حوالے سے نہ ملنا چاہو تو بھی مل لینا۔ بڑے عالم انسان ہیں اور بڑے منکسر، بڑے شفیق۔ پھر قدرے مسکرا کے بولے۔ ان سے ہماری رشتہ داری بھی ہوتی ہے۔ تمہاری شادی پر منہ دکھائی میں ایک گنی دے گئے تھے اور دو بھاری بنارسی ساڑیاں۔''

گنی اور بنارسی ساڑیاں تو امبیکا کے ذہن نے رجسٹر نہیں کیں اس لیے کہ حیرت کے وفور سے اس کا ذہن گنگ ہو گیا تھا۔ متان صاحب سے رشتہ داری کی بات پر وہ ہکا بکا رہ گئی۔ انکل کے کم عمر ہونے کے باوجود اس کے والد خاصے معمر تھے اس لیے کہ ایک تو شادی دیر سے ہوئی پھر اولاد میں مزید دیر لگی۔ امبیکا کو وہ اپنے باپ، چچا جیسے نہیں بلکہ دادا سے قریب لگا کرتے تھے۔ نہایت سنجیدہ مزاج بھی تھے۔ رشتہ، عمر، سنجیدگی کسی اعتبار سے بھی وہ بہو سے پھوہڑ مذاق نہیں کر سکتے تھے۔ سر ڈھک کر ان کے قریب کھڑی، حیران حیران نظروں سے انھیں دیکھتی امبیکا اپنے

کمرے میں آ گئی۔ اس کا ذہن بے حد کنفیوزڈ تھا۔

ایسے رشتے تو شادیوں کے ذریعے بنا کرتے ہیں۔ اگر انکل کے گھر کے کسی فرد نے مسلمان عورت ڈال لی تھی تو اس کے بچے تو ہندو ہی ہوتے۔ ضرور ان کے یہاں کی کوئی لڑکی نکل لی ہوگی۔ لیکن ایسا ہوتا تو پھر لوگ اس پر مٹی ڈال کر بلی کے گو کی طرح واقعے کو چھپاتے۔ اتنے اطمینان سے متان صاحب سے رشتہ داری کا اعتراف نہ کرتے۔ پھر اس نے قیاس کیا کہ لوگ اکثر گاؤں جوار کی رشتہ داریاں لگا لیتے ہیں۔ انکل آئے گا تو پوچھوں گی۔ نی الحال تو کالج جانا ہے۔

سر پر پلو ڈال کر امبیکا نے ناک پر رومال رکھا اور ذیلی سڑک سے نکل کر مین روڈ پر آ گئی۔ گھر کے آس پاس جگہ جگہ بکرے ممیا رہے تھے۔ کہیں گول مٹول کہ ایک لات مارو تو گیند کی طرح لڑھک جائیں اور کہیں ایسے لانبے چوڑے تگڑے کہ ڈر ہو وہ آپ کو ہی لات نہ مار دیں۔ فضا میں بقر عید کی مہک تھی۔ بکروں پر کچھ لوگوں نے رنگ سے چھاپے بھی لگا دیے تھے۔ ایک صاحب دروازے پر ایک کم عمر لیکن تندرست بکرے کو المونیم کے تسلے میں بڑی محبت سے چنے مل چور کر کھلا رہے تھے۔ کچھ دن میں ہی سے کاٹ دیں گے۔ بے رحم کہیں کے۔ امبیکا نے چڑ کر سوچا۔ یہی کیوں بقر عید کے تین دنوں میں لاکھوں جانور ذبح کر دیے جائیں گے۔ ان میں گائیں بھی شامل ہوں گی۔ اس کے جسم میں پھریری آ گئی۔ پتہ نہیں اس کے سسرال والوں نے اس محلے میں رہنا کیوں اور کیسے منظور کر لیا۔ ڈرتے بھی نہیں۔ کیا پتہ کب یہ سب چڑھ دوڑیں۔ مانا کچھ گھر ہندوؤں کے بھی ہیں لیکن یہ بتیس دانتوں کے بیچ میں زبان۔ کچھ دن گزر جائیں تو انکل سے کہوں گی یہ گھر بیچ کر کہیں اور چلو۔ ابھی بولوں تو لوگ کہیں گے بہت ہی تیز لڑکی ہے۔ زمانے سے جہاں رہ رہے ہیں اس جگہ کو بدلوانے کی بات کر رہی ہے۔ ہاں لیکن ایسا گھر اب کہیں نہیں ملے گا۔ اب تو حال یہ ہے کہ بڑے گھر بیچو تو بدلے میں فلیٹ ہاتھ آتا ہے۔ گھر واقعی بہت بڑا ہے۔ پیچھے کچن گارڈن، سامنے سرسبز لان اور پھول۔ حویلی جیسا کنسٹرکشن ہے۔

وہ دراصل حویلی ہی تھی۔

○

کبھی اصل مالک مکان جگدیش پور میں رہا کرتے تھے۔ سید تہور علی ایڈووکیٹ۔ یہ

مکان جو شہر والی حویلی کہلاتا تھا عموماً خالی ہی پڑا رہتا۔ بس دو چار نوکر رہا کرتے تھے جو اسے اس لائق رکھتے کہ کوئی کبھی بھی آ جائے تو دقت نہ ہو۔ لوگ اکثر علاج کے سلسلے میں آتے یا مقدموں کے لیے۔ کام ہو جاتا تو واپس ہو جایا کرتے تھے۔

انل کے پردادا کے بڑے لاولد بھائی فتح جنگ بہادر تہور علی کے بزرگوں کے وفادار ضرور تھے لیکن بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا وقت آیا تو اس میں اعتراض نہیں ہو۔ ان کی منطق بہت معقول تھی۔ مالکوں کے کوٹھار، دھان، تلہن اور گیہوں سے بھرے رہا کرتے تھے۔ سید تہور علی نے باپ کی خواہش پوری کرنے کو وکالت پڑھی تھی۔ ورنہ گھر میں ہمیشہ سے بغیر انگلی ہلائے اتنا پیسہ آتا تھا کہ پشتوں سے بیٹھ کر کھا رہے تھے۔ اگر کسی کی انگلی ہلی تھی تو فتح جنگ بہادر کی جو مارے مارے پھر کر زمینوں کی دیکھ بھال کرتے اور بٹائی داروں سے لگان وصول کر کر کے لاتے۔ اس میں انھوں نے کبھی ڈنڈی نہیں ماری تھی۔

تہور علی کانگریس کے حمایتیوں میں سے تھے۔ لیگ کی پالیسیوں سے ہمیشہ اختلاف رہا لیکن بہار کے بھیانک فسادوں نے انھیں ہلا کر رکھ دیا۔ ان کی اہلیہ کا تعلق بہار شریف سے تھا۔ وہاں قریبی عزیزوں کا پورا کنبہ صاف کر دیا گیا تھا۔ ان فسادات میں پٹنہ کی کئی سربرآوردہ ہستیوں نے فساد کی منصوبہ بندی میں حصہ لیا تھا۔ گاندھی جی اس وقت نواکھالی میں مصروف تھے۔ لوگوں کی پوری کوشش رہی کہ وہ بہار کا دورہ نہ کریں لیکن وہ پھر بھی آئے۔ اس وقت تک زبردست جانی و مالی نقصان ہو چکا تھا۔ بنگال کے فساد میں وہاں کے مسلمان وزیر اعلیٰ نے چشم پوشی سے کام لیا تھا۔ لیکن ایک غلطی کے بدلے دوسری غلطی کو حق بہ جانب نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اب کیا ہم اپنے اپنے علاقوں کی اقلیتوں کو یرغمال بنا کر برصغیر میں رہیں گے؟ تہور علی نے بے چین ہو کر سوال کیا۔ مسلم اکثریتی علاقوں کو علیحدہ کر کے ان کی ایک فیڈریشن بنانے کا منصوبہ پیش کرتے وقت جناح نے ان علاقوں میں رہ جانے والی اقلیتوں کو ایک دوسرے کے یہاں یرغمال بنانے کی بات کہی تھی۔ اس سے زیادہ ذلیل خلاف انسانیت بات اور کیا ہو سکتی تھی تو کیا واقعی یہ اچھا نہیں ہے کہ ایک حصہ مکمل طور پر الگ ہو جائے۔ تہور علی اچانک ہی پاکستان کے حق میں ہو گئے۔ فساد کے دوران زمینوں پر لوگ قابض ہو گئے تھے۔ جو بچ گئی تھیں وہ اونے پونے بیچیں۔ یہ شہر والا بڑا مکان ان کی

اہلیہ آبادی بیگم کے نام تھا۔

"بیگم صاحبہ!" فتح جنگ بہادر نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "چار پانچ ہزار سے زیادہ کوئی نہیں دے رہا۔ شاید تھوڑے انتظار کے بعد چھ مل جائیں۔" اس افراط و تفریط اور آپادھاپی میں بھی اس حویلی کے دس ہزار آرام سے مل رہے تھے یہ سب کو معلوم تھا۔

"گماشتہ جی! ہم اپنی بیش تر زمینیں، اپنے اجداد کی قبریں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ان کے سامنے اس مکان کی کیا ہستی رہ گئی۔ مُوا چڑیوں رین بسیرا، نا گھر تیرا نا گھر میرا۔ آپ پرانے وفادار ہیں، جائیے آپ ہی رہیے۔" انھوں نے کہا۔ "ہاں بس امام باڑے کی دیکھ بھال کر لیجیے گا۔ اسے یوں ہی رہنے دیں تو بہتر ہوگا۔ کل آئیے پکا کاغذ لکھ دیا جائے گا۔"

فتح جنگ بہادر ہکا بکا رہ گئے۔ انھوں نے تو صرف چار چھ ہزار درمیان سے خرد برد کرنے کی سوچی تھی۔ گرچہ وہ اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ لیکن اتنا بڑا پورا کا پورا مکان! یہ تو ایسا ہی ہوا کہ آگ لینے کو جائیں اور پیغمبری مل جائے۔ اتنا بڑا مکان! ان کے ضمیر نے کچوکا دیا۔ سورگ باسی ماں کہا کرتی تھیں کہ ہانڈی کا منھ کھلا ہو تو بھی بلی کو لحاظ کرنا چاہیے۔ اس لیے انھوں نے پہلے انکار کیا اور واقعی دل سے کیا تھا۔ لیکن آبادی بیگم نے ایک بات کہہ دی سو کہہ دی تھی۔ مکان ان کے نام لکھ کر ہی سدھاریں۔ بعد میں ان کی ساری جائداد اولاد نہ ہونے کے سبب دونوں بھائیوں کے درمیان تقسیم ہوئی تو انل کے دادا کے حصے میں یہ حویلی آئی۔

حویلی کی دوسری منزل پر جھاڑ فانوس سے آراستہ ایک وسیع و عریض ہال تھا جو امام باڑہ تھا۔ جگہ جگہ قرآنی آیات دھفرے آویزاں تھے۔ ایک کونے میں دیوار سے لگے علم کھڑے تھے۔ گھر کی بی بی یعنی انل کی بوڑھی پھونس دادی اسے سال کے سال محرم میں کھولا کرتی تھیں۔ جھاڑ پونچھ کرانے کے بعد وہاں اگربتیاں اور گھی کے چراغ جلاتیں۔ فانوس روشن کرتیں۔ عاشورے کے روز ملیدہ اور شربت بٹوانے کے بعد امام باڑہ بند ہو جایا کرتا تھا۔

اسیکا کو یہ سارا کچھ معلوم نہیں تھا اور نہ ہی یہ کہ اوپری منزل پر بالکل الگ تھلگ یہ بڑا سا ہال نما کمرہ، جسے اس نے ابھی تک کھلا ہوا نہیں دیکھا تھا، اس کے اندر کیا تھا۔ شاید وہ قصے کہانیوں میں پائے جانے والے کسی حجرے جیسا تھا جسے گھر کے کسی بزرگ نے طویل عرصے

کے لیے پردیس جاتے وقت گھر کی بی بی کو سختی سے منع کیا تھا کہ اسے کھولا نہ جائے کہ کھولا تو آفت آجائے گی۔

اس کمرے کو کھولنے سے کبھی آفت نہیں آئی، بلکہ لوگوں کا خیال تھا کہ برکت ہی رہی۔ دوی کا تو یہاں تک کہنا تھا کہ اٹل کے والد تو بولے ہی حضرت زوالجناح کی برکت سے تھے ورنہ ان کے گونگے رہ جانے میں کیا کسر تھی۔

فتح جنگ بہادر نے مکان اپنے تصرف میں رکھا۔ دو بھائی اور تھے شمشیر جنگ بہادر اور آفتاب جنگ بہادر۔ دونوں شادی شدہ، بال بچوں والے۔ (ان میں سب سے چھوٹے یعنی آفتاب جنگ بہادر اٹل کے پردادا ہوئے) حویلی فتح جنگ بہادر کے قبضے میں آنے سے پہلے تینوں بھائیوں میں اچھے تعلقات تھے۔ چھوٹے دونوں اپنے بال بچوں میں مگن تھے اس لیے زیادہ وقت بڑے بھائی کے پاس تھا۔ لیکن حویلی انھیں ملنے کے بعد سے تعلقات میں بڑے ہولے ہولے، لیکن دراڑ پڑنے لگی۔

منجھلے اور چھوٹے کا کہنا تھا کہ بڑے بھیا کے آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا۔ یہ حویلی ہم دونوں کے نام لکھ دیں یا بیچ ڈالیں اور رقم بانٹ دیں۔ اب اس کے صحیح دام بھی مل جائیں گے اس لیے کہ جنھیں جانا تھا وہ چلے گئے۔ جو کسٹوڈین کے قبضے میں آنا تھا وہ بھی فیصل ہو چکا اس لیے پکے کاغذوں والے، شہر میں ایستادہ مکان کے صحیح دام ملنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ تینوں بھائی ساتھ ہی رہتے تھے۔ گاؤں میں کھیتی باڑی تھی اس لیے شہر جا کر رہ پڑنا ممکن نہیں تھا۔ اس وقت یہ عام بھی نہیں ہوا تھا کہ لوگ جگہ زمین چھوڑ چھوڑ کر نئی بستیاں بسائیں۔ بھیا کو کھیتی کسانی سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ آخر ان کا خرچ بھی تو دونوں چھوٹے بھائی اُٹھا رہے تھے۔ ان کی بیویاں ماتھے تک گھونگھٹ کھینچ کر بہوؤں کی طرح سیوا ٹہل میں مصروف رہتیں۔

منجھلے ذرا زیادہ منہ پھٹ اور قصین تھے۔ کہتے تھے آخر بڑے بھیا حویلی کے ساتھ چتا پر چڑھیں گے کیا۔ شہر میں وہ ڈھنڈار مکان انڈے بچے تو دے نہیں رہا۔ پیڑ نہیں کہ کھڑا کھڑا بڑھ ہی رہا ہو تو بعد میں زیادہ لکڑی دے جائے اور آخر چتا میں کتنی لکڑیاں لگیں گی۔ گھی اور چندن سے زیادہ کاہے سے جلے گی، سونے سے؟

مذاق مذاق میں یہ باتیں تلخ ہونے لگیں۔ فتح جنگ بہادر جو عرف عام میں بھتے بھائی صاحب کہلاتے تھے حویلی اور شہر کا نام سنتے ہی بھتے سے اکھڑنے لگے۔ کہتے یہ لوگ گدھوں کی طرح ہمارے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک دن کہہ بیٹھے۔ چمار کے منائے ڈانگر نہیں مرتا (چمار کے کوسنے سے جانور نہیں مرتا کہ اسے ہڈیاں اور کھال ملیں)۔ اب دونوں بھائی بھتے سے اکھڑ گئے کہ بھائی صاحب نے کلین لوگوں کو چمار سیار بنا دیا۔

کچھ تو فتح جنگ بہادر ہمیشہ کے خرد ماغ تھے۔ کنوارے رہ گئے تھے اس لیے اور زیادہ جھکی ہو گئے تھے۔ رہی سہی کسر بڑھاپے نے پوری کر دی۔ آبادی بیگم کی ہبہ کی ہوئی حویلی تو بلا شرکت غیرے ان کی تھی ہی پھر بھی اب وہ آبائی جائداد کے بٹوارے پر تُل گئے۔ بھائیوں نے دانتوں تلے انگلی دبائی۔ ڈر بھی گئے۔ کہیں کوئی رکھیل نہ چھپا رکھی ہو۔ اکثر دن دن بھر گھر سے غائب رہتے۔ جب سے ان کے زمیندار مالک پاکستان سدھارے تھے، ان کے پاس کام بھی نہیں رہ گیا تھا کہ زمین جائداد کے سلسلے میں باہر رہیں۔ کہیں اپنا حصہ الگ کر کے کسی کو دے نہ دیں۔ وہ اڑ گئے کہ بٹوارہ نہیں ہوگا۔ شمشیر جنگ بہادر نے مقدمہ ٹھوک دیا۔

اب ہوتے یہ لگا کہ تینوں بھائیوں کے کورٹ کے چکر لگنے لگے۔ پہلے میل دو میل پیدل چلتے۔ پھر وہاں سے بیل گاڑی ملتی۔ بیل گاڑی کے بعد بس اور تب کہیں ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر۔ دن بھر وہیں رہنا پڑ جاتا۔ شمشیر جنگ اور آفتاب جنگ مدعا علیہ بنائے گئے تھے۔ جس دن تاریخ پڑتی تینوں الگ الگ پوٹلیوں میں روٹی سبزی لے کر کندھوں پر گمچھا ڈال کے نکل لیتے۔ جاڑے ہوتے تو روئی کی صدری پہنتے، اور ایک ساتھ کچہری کے دھول اڑاتے کمپاؤنڈ میں بیٹھ کر کسی ایک کا گمچھا بچھا کر ساتھ کھانا کھاتے۔

کسی نے ایک بار ساتھ کھانا کھانے کا مذاق اڑایا تو فتح جنگ بڑی زور سے بھڑکے۔

"لڑائی جائداد کی ہے۔ رشتے ناطوں کی نہیں۔ تم کیا جانو گے۔"

ایسے ہی ایک بار کسی نے مزا لینے کے لیے کہہ دیا۔ یہ بھتے جنگ کیوں مال کا سانپ بنے بیٹھے ہیں۔ آخر کو تو مریں گے تو مال متاسب بھائیوں کو ہی جائے گا۔ دونوں چھوٹے اس کے گلے پڑ گئے۔ یہ ہم بھائیوں کا معاملہ ہے۔ تم سے مطلب۔ خبردار جو ہمارے پتا سمان بڑے بھائی

کو کچھ کہا۔

عجیب لوگ ہیں۔ گاؤں والے کہتے۔ رشتے ناطے والے ہنستے۔ مذاق اڑاتے لیکن دو چار بار منہ کی کھانے کے بعد اب جو کہا جاتا وہ پیٹھ پیچھے۔

واقعی لوگ تو عجیب و غریب تھے، اور دنیا ایسے ہی عجائب و غرائب سے عبارت ہے بھی۔ دونوں چھوٹے بھائی جو ایک پارٹی میں تھے، وہ آپس میں لڑ پڑے۔ اب علیحدگی ہونی ہے تو ہو جائے۔ پھر بھی کا حصہ کیوں نہ الگ ہو جائے۔ دراصل جو سب سے چھوٹے تھے، آفتاب جنگ وہ کثیر العیال تھے، شمشیر جنگ کے صرف دو اولادیں تھیں۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ آفتاب جنگ کی منطق یہ ہوئی کہ انھیں زیادہ زمین دی جائے اور فصل جب کٹ کر آیا کرے تو ان کا حصہ زیادہ لگے تاوقتیکہ زمینیں بٹ نہ جائیں اور بڑے سے کچے پکے مکان میں دیواریں نہ کھڑی ہو جائیں۔

انھوں نے ایک مقدمہ الگ ٹھوک دیا۔ کچہری میں اس دن ان کی پیشی ہی نہیں ہوئی۔

ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔ شمشیر بہادر بس کے بعد لیڑوا اور پھر پیدل والے رستے پر چلے آرہے تھے۔ ساتھ میں بوتل میں پانی رکھا کرتے تھے آج جھنجھلاہٹ میں بوتل وہیں کچہری کے احاطے میں کہیں چھوٹ گئی۔ بیوی کو سبزی میں نمک بھی اسی دن زیادہ کر دینا تھا۔ سسری، پھوہڑ، کلے دراز۔ لیکن اسے گالیاں دینے کا کیا فائدہ۔ پیاس سے بے حال تھے۔ انگوچھا سر پر باندھا لیکن ہوا میں لو کی آہٹ تھی۔ بے بضاعت انگوچھا کچھ ایسی سپر ثابت نہیں ہوا۔ سر کے اندر دماغ حلوائی کے کڑھاؤ کی طرح کھولنے لگا۔ تب ہی آم کا وہ باغ " یا جو ہمیشہ ہی راستے میں آتا تھا لیکن آج یہ سرسبز و شاداب ننھی ننھی امیوں سے بھرا باغ ان کو جھلساتا چلا گیا۔

باغ شیخ محمد نور عالم کا تھا۔ اس سے لگے لگے ان کے ارہر کے کھیت بھی چلے گئے تھے۔ باغ میں رہٹ چل رہا تھا اور ان کا برا ہل مجید ڈول بھر بھر کے نکال رہا تھا۔ ٹھنڈا میٹھا پانی شفاف نالی سے گزرتا ہوا اچل رل کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ پانی جو نمو ہے، پانی جو حیات ہے، پانی جو چہار صورت میں فنا ہے۔ پانی جو اس زمین کے وجود کا سبب ہے ہاں، پانی

شمشیر بہادر رک گئے۔ انھوں نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

کاکا تنی سستا لیو۔ مجید کے تنومند بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکیں۔ اس نے ڈول نکالا اور

پانی اٹھا۔

شمشیر بہادر کو لگا وہ اب چکرا کر گر جائیں گے۔

پانی نے ان سے کہا ہمارے اوپر کوئی لیبل چسپاں مت کرو۔ ہم سب کی پیاس بجھاتے ہیں۔ ننھے اسمٰعیل کی ایڑیوں سے پھوٹا زمزم بھی ہم ہیں اور عظیم الشان شیو کی جٹاؤں سے اُلجھتی دھار بھی ہم۔ ساری تہذیبیں ہمارے کنارے پنپیں۔ پھر وہ دجلہ فرات ہوں یا ماں گنگا۔ سارے مذاہب کی جڑ میں ہم ہیں۔ تم بے بضاعت انسان ہم سے تم ہو تم سے ہم نہیں۔ کس سوچ میں پڑے ہو۔ پانی بول رہا تھا۔

شمشیر بہادر مجید کی مڑیا کے اندر چلے آئے۔ چوکنّی آنکھوں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ پپڑی پڑے خشک ہونٹوں سے ہاتھ اوک بن کر لگ گئے۔ مجید نے ڈول بلند کیا۔ وہ قیمتی شے جس کا کوئی مول نہیں تھا، وہ جو ہر ذات، ہر فرقے، ہر مذہب سے اوپر تھی، دھاروں دھار گر کر ایک پیاسے کی جان بچانے کا سبب بنی ورنہ اس دن جانے کیا ہو جاتا۔

لیکن جانے کیا تو ہو گیا پھر بھی!

شمشیر بہادر پرانی دیوار کی طرح ڈھے کر وہیں مڑیا کی دیوار سے ٹیک کر بیٹھ گئے۔ خالی پیٹ، شدید پیاس۔ غٹ غٹ کر کے اتنا پانی پی گئے تھے کہ اٹھنے کی سکت نہ رہی۔ ایسا لگا کوئی اندر ہی اندر آنتیں متھ رہا ہے۔

لا سے خالی پیٹ پانی نہیں پینا تھا۔ تنی چبینا چبا لیتے۔ چلو اب بھی چبا لیو۔ مجید نے پوٹلی کھول کر چنے نکالے۔ ساتھ میں گڑ تھا اور ایک پڑیا میں دھنیا مرچ موٹا کوٹ کر بنائی گئی خشک چٹنی۔

ہم چمڑے کے ڈول سے پانی پی کر دھرم بھرشٹ کر چکے تو یہ تو سوکھی چیزیں ہیں۔ انھوں نے برگد کے پتے پر رکھ کر پیش کیے گئے چنے گڑ کے ساتھ کھائے اور پھر پانی پیا۔ اب کی لگا اندھی ہوتی آنکھوں میں روشنی واپس آ رہی ہے۔ "مجید بیٹا، کسی سے کہنا نہیں۔"

"نہیں کہیں گے کاکا۔ ہم نے آپ کو اس وقت ایسا حال سے بے حال دیکھا کہ ہمیں خیال ہی نہ رہا کہ آپ کو ڈول سے پانی نہیں پلانا تھا۔ دوش تو ہمارا ہی ٹھہرا۔"

نہیں بیٹا۔ جہاں بھی کچھ غلط ہوتا ہے وہاں بھاگیہ کا بھی دوش ہوتا ہے۔ اب لکشمن

مہاراج نے سوپ نکھا کی ناک کاٹی۔ بھاگیہ کچھ ایسا ہی رچا گیا تھا۔"
"پھر تو کاکا، کوئی بھی دوش، دوش نہیں رہ جائے گا۔"
"ایسا بھی نہیں ہے۔ یہ سب مایا ہے۔ ہماری سمجھ سے پرے، تمہاری سمجھ سے دور۔
سیتارام، سیتارام۔ وہ سیتارام جپتے،، اٹھ کھڑے ہوئے۔ دیکھ بیٹا یاد رکھے گا۔"
نشچنت رہیں کاکا۔ ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔

شمشیر جنگ بہادر گھر کی طرف چلے تو دل میں دُبدھا تو تھی لیکن جسم اچھا محسوس کر رہا تھا۔ چبینا کھا کر وہ شفاف امرت جیسا پانی پی کر آنکھیں کھل گئی تھیں۔ جسم سے پرواز کے لیے پر تولتی روح مستقر پر واپس آ گئی تھی۔

اب وہ کہانی تو شمشیر جنگ بہادر کو ان کی دادی نے سنائی تھی ور شمشیر جنگ بہادر اٹل کے پردادا کے بڑے بھائی تھے۔ تو دادا کی دادی..... راجہ کے سر پہ سینگ نکل آئے تھے تو انھوں نے اسے پگڑی میں چھپایا تو لیکن نائی سے کیسے چھپاتے۔ انھوں نے شاہی نائی پر بھروسہ نہ کر کے ایک عام نائی کو پکڑا کہ رعب کے مارے غش کھا کے گر جائے گا۔ شاہی نائی تو کچھ زعم میں مبتلا رہا کرتا ہے۔ وہ تھا تن حجام۔ راجہ نے کہا میرے بال بناؤ، داڑھی ترشو لیکن جو کسی کو خبر ہوئی کہ سر پہ سینگ ہیں تو سمجھ لو سر کاٹ کے فصیل پر لٹکا دیا جائے گا۔ تن تھر تھر کانپنے لگا۔ حضور کیا مجال۔ پھر اس نے راجہ کی حجامت بنائی اور تھر تھر کانپتا ہی محل سے واپس نکل آیا۔ لیکن یہ کیا۔ صبح ہوتے ہوتے تن کا پیٹ پھولنے لگا۔ بات ہضم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ راجہ کے سر پہ سینگ۔ ہاہاہا..... اس نے سوچا بانس باڑی میں جا کے بانسوں سے کہہ دینے میں کیا حرج ہے۔ بانس کسی سے کچھ کہہ تھوڑی سکتے ہیں۔ وہ ٹھہرے بے جان اجیو۔ اور اس نے بانسوں سے بتا دیا کہ راجہ کے سر پہ سینگ ہیں۔

اب یہ کہانی تو سب کو معلوم ہے کہ پھر کیا ہوا۔ اس لیے کہ یہ ابتدائے آفرینش سے چلی آ رہی ہے۔ غیر متوقع کے متوقع ہو جانے کی کہانی۔ ایسی جگہوں میں، روزن بننے کی کہانی جو سیسہ پلائی دیوار کی طرح مضبوط سمجھی گئی تھیں۔

مجید چغل خور نہیں تھا نہ دل کا برا۔ لیکن اس کا پیٹ پھولنے لگا۔ اس کی بیوی بالکل منہ بند اللہ میاں کی گائے، سر پر دوپٹہ لپیٹے سر نہوڑائے جھاڑو بہارو، ڈھور ڈنگر کرتی دن بھر مصروف رہا کرتی تھی۔ گائے کی سانی بنا رہی تھی کہ مجید نے آ کر اس سے کہا اری نیک بخت آج پتہ ہے کیا ہوا؟ نیک بخت نے آنکھیں اٹھائیں۔ کیا ہو؟ بڑے ٹھاکر کے یہاں کیا بیائی بڑے جنتر منتر کے باوجود اس بار بھی چھڑا دیا۔ ادھر بیٹے کے یہاں پھر بٹیا ہو گئی۔ عجب کھیل ہیں دنیا کے کیا کے بٹیا ہو تو خوش اور بیٹے کے بٹیا ہو تو ناخوش۔ لیکن وہ بولی نہیں تھی۔ اس نے صرف آنکھیں اٹھائی تھیں۔

لالاؤں کے یہاں تو ہیر پڑے ہیں۔ اب منجھلے لالہ کورٹ کچہری کے بعد جلتی دھوپ میں لوٹ رہے تھے تو ہمارے ڈول سے پانی پی لیا۔ ہمارے انگوچھے کا چبینا بھی کھا لیا۔ مرتے مرتے بچے۔ لیکن بے چارے ڈر رہے تھے پٹی داروں کو خبر نہ ہو جائے۔ ہم کسی سے کیوں کہیں گے۔ تو بھی نہ کہنا۔

بیوی نے سر ہلایا۔ وہ کیوں کہے گی۔ ویسے بھی کم بولتی ہے۔ اسے کیا پڑی لوگوں کو بتانے کی کہ لالاؤں کے گھر کے ایک بزرگ نے بڑھتی عمر میں چمڑے کے ڈول سے وہ بھی مسدن کے ہاتھ سے پانی پیا اور اسی کے گمچھے میں بندھا چبینا کھایا۔ لیکن ہونی کو کون ٹالے۔ بھوسے کے ڈھیر کے پیچھے مجید اور کلثوم کا نو سالہ بیٹا چھپا ہوا تھا جو آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے اس طرف آ نکلا تھا ادھر ماں سانی کرنے آ گئی تو ڈانٹ کھانے کے ڈر سے وہیں چھپا رہا اور نکلا جب، جب ماں باپ دونوں وہاں سے چلے گئے۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شمشیر دادا کے اپنے باپ کے گمچھے سے گرو چبینا لے کر کھانے اور ڈول سے پانی پینے کی بات ہمجولیوں کو بتائی جو دیر سے اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ اس کی اہمیت کیا تھی یہ اسے بالکل نہیں معلوم تھا۔ اسے صرف یہ احساس تھا کہ یہ ایک ایسی بات تھی جو کسی کو نہیں بتانی تھی اس لیے بتانا ضروری ہو گئی تھی۔ ایک راز افشا کر کے وہ ہیرو بن رہا تھا۔ لڑکوں کے ساتھ ایک جوانی کی سرحدوں میں داخل ہوتا لمڈ ھک جیسا لونڈا اٹھا ہریا۔ کوئی اٹھارہ انیس برس کا۔ اسے مجید کے ڈول سے پانی لے کر پینے میں مضمر قباحت کا علم تھا۔ علاوہ ازیں وہ بڑے لالہ کے یہاں بہت جاتا تھا۔ گھریلو رنجش بھی اسے معلوم تھی۔ وہ جا کر مزے لے لے کر، کچھ کلی پھندنے ٹانک کر پوری داستان للائن کے گوش گزار کر آیا۔ علاوہ کلی پھندنوں کے یہ بھی ٹانک دیا کہ انھوں نے مجید کی پوٹلی سے لے کر روٹیاں اور لوکی آلو کی رس

دار کچی بھی کھائی۔ دراصل خشک چیزیں کھانے میں اکثر پرہیز نہیں برتا جاتا تھا۔ ہریا نے جان بوجھ کر شیلنٹ نہیں برتی تھی۔ اس نے مجید کے بیٹے سے زیادہ بڑا ہیرو بننے کے لیے داستان کو بڑھا دیا تھا۔

مجید کو سب سے بڑے لالہ نے طلب کیا۔ وہ غریب ہکا بکا۔

کیوں بے مجیدے۔ تو نے شمشیروا کو ڈول سے پانی پلایا۔ تیرا ڈول بیل کی کھال سے بنا ہوا ہوگا۔ سب کو پتہ ہے۔ پھر پوٹلی سے سبزی روٹی نکالی۔

مجید نے ہکا بکا رہ جانے والی کیفیت پر قابو پایا تو اسے محسوس ہوا کہ یہ معاملہ مجھلے لالہ کو لے ڈوبے گا۔ ویسے کچھ نہ ہوتا لیکن آج کی مقدمے بازی میں آفت بن جائے گا۔ اب بیوی سے تو گھر جا کے نمٹے گا پہلے یہاں نمٹا لے۔

اس نے صاف انکار کر دیا۔

کھا قسم۔

قسم سے۔

ابے قسم سے نہیں کھا قسم اللہ رسول کی (لالہ سب آدھے مسلمان کہلاتے تھے۔ مسلمانوں کے یہاں اٹھ بیٹھ تھی۔ سارا کچھ جانتے تھے۔)

مجید ہل گیا۔ زندگی میں کچھ اچھا نہ کیا، نہ کیا لیکن اتنا بڑا گناہ۔ اللہ رسول کے نام سے اسے بڑا ڈر لگتا تھا۔

"پیاسے کو پانی پلانا ثواب ہے مالک۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ آپ کے دھرم میں بھی کہا جاتا ہے۔"

"ہے تو ثواب لیکن ہر دھرم کی اپنی مرجاد بھی تو ہوتی ہے۔"

"مالک جب دم نکل رہا ہو تو ایک ہی مرجاد رہ جاتی ہے، آدمی کو بچانا۔"

"فلسفہ پڑھاتا ہے۔ ابھی دس جوتے مارے جائیں تو سب سمجھ لے گا۔ کلین آدمی کو بیل کے چمڑے کے ڈول سے..."

"چمڑ، بیل کا تھا کہ گائے کا کہ بھینس کا یہ ہم کیا جانیں ور مالک آپ بھی..."

مالک گاؤں کا بنا ہوتا، چر ودھا جو تا ٹال کے پیچھے تو مجید جان لے کے بھاگا۔ گھر آ کے نہ کچھ پوچھا نہ کچھ بولا بیوی کو ذھن کر رکھ دیا۔ پہلے بھی مجیدے ایک آدھ لپڑ مار لیا تھا لیکن آج تو حد کر دی وہ بھی نہ سبزی میں نمک تیز تھا نہ اس نے ساتھ سونے کو منع کیا تھا نہ مجید کی ماں سے گالی گلوج کی تھی۔ آخر ہوا کیا تھا؟ اتنی مارا پیٹی کہ مجید کی ماں کو رحم آ گیا۔ بیٹے کو ڈانٹ کر ہاتھ رکوایا اور بولی "ارے اتنا کیوں مار رہا ہے؟ کیا چھنالا کر لیا اس نے۔ دن بھر تو ہمارے سامنے ہی رہتی ہے۔" مجید ہاتھ سے چپل پھینک کر منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔ پھر پسند کا 'گوس بھات' بھی ٹھکرا کر بھوکا سونے چل دیا۔ اب کیا ہو گیا تھا ایسا۔ بیوی غریب روتی رہی اور سوچ سوچ کے ہلکان ہوتی رہی۔

"ایسے ہی حرام زادوں نے بھاکوی تلسی داس کا جینا بھی حرام کیا ہوگا جو انھوں نے تنگ آ کے کہا تھا" مانگ کے کھا بو" مسیت سوئبو اور کیا پتہ مسجد میں جا کے کبھی بیٹھ بھی گئے ہوں۔ لوگ تب دوڑ پڑے ہوں گے وہ ٹھہرے اتنے بڑے سنت۔ رام چرت مانس رچ گئے تو ہماری ان کے آگے کیا بساط۔ لیکن ٹھہرو حرام زادو، ہمارا حقہ پانی بند کر رہے ہو ہم بھی بتاتے ہیں تمہیں۔ ہم بھی جا کے کہیں ایسی ہی جگہ بیٹھ جائیں گے۔"

اپنے آنگن میں کھڑے شمشیر جنگ بہادر گرج رہے تھے۔ غصے کے مارے منھ سے کف نکل رہا تھا۔ جس بھائی کو باپ کی جگہ سمجھتے تھے اسے آج گالیاں دے رہے تھے۔ بیوی بچے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ گھر سے نکلنے لگے تو بیوی نے پیر پکڑ لیے۔

"ارے الگ ہٹ بھاگوان۔ ہمارا حقہ پانی بند کرا دیا ہے۔ ابھی تُو ہمارے ساتھ رہ کے کیا کرے گی۔ ذرا انھیں مزا چکھا لیں بڑکو منجھلکو دونوں کو، پھر آ جائیں گے۔"

اٹل کے دادا آفتاب جنگ تم شمشیر جنگ ان کے چھوٹے بھائی، بڑے فتح جنگ کنوارے، بے اولاد۔

○

گاؤں میں ملکی میاں کی کٹیا تھی۔

ان کا اصل نام کسی کو نہیں معلوم تھا۔ کبھی کہیں سے گھومتے گھامتے آ نکلے تھے۔ اس وقت جو بزرگ تھے وہ آج سب مر کھپ چکے۔ جوان ادھیڑ یا بوڑھے ہو گئے، بچے جوان ہو گئے۔ کئی

میاں اس وقت جوان ہی رہے ہوں گے۔ جو بڑے بزرگ بھی بتاتے تھے وہ یہ تھا کہ ان کے گلے میں کئی طرح کی مالائیں پڑی رہا کرتی تھیں اور ایک ٹین کے بکسے میں صرف ایک لنگی تھی اور ایک بستہ جس میں کعبہ شریف اور مکے مدینے کی کچھ زیارت گاہوں کی تصویریں تھیں۔ کہا جاتا ہے جس دن وہ گاؤں میں وارد ہوئے اس ہفتے کوئی چار عورتوں کے یہاں جو اولاد پیدا ہوئی وہ سب لڑکے تھے۔ اور اتفاق یہ تھا کہ ان عورتوں کے یہاں پہلے سب یا بیٹیاں پیدا ہوئی تھیں یا بیٹے ہوئے تھے تو بچے نہیں تھے۔ کی میاں کو لوگ ڈھونگی سمجھتے۔ ایسے کئی ہٹے کٹے مسٹنڈے مانگتے کھاتے گاؤں میں چلے آتے تھے لیکن ایک تو یہ لڑکوں والی کرامت دوسرے وہ کسی سے منھ سے کچھ نہیں مانگتے تھے۔ بس ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھے تسبیح پڑھتے رہتے تھے۔ ان کے سر پر ایک معتقد نے چھت ڈالنی چاہی تو منع کر دیا، ہاں پھوس کے چھپر کے لیے راضی ہو گئے۔ وہ بہت کم بولتے تھے اور بہت کم کھاتے تھے۔ زیادہ تر روزے سے رہتے۔ لوگ جو نذرانہ انھیں پیش کرتے، پھل پھلاری، اناج وہ ضرورت مندوں میں بانٹ دیا کرتے تھے۔ جڑی بوٹیوں کا علم رکھتے تھے۔ ان سے مفت علاج کر دیا کرتے۔ زیادہ تر صورتوں میں شفا ہوتی۔

اب وہ بالکل سن سفید ہو گئے تھے۔ سفید بھویں، سفید پلکیں، روئی جیسے سفید بال، گورا رنگ یعنی خود بھی سفید۔ کی میاں کے پاس ہندو مسلمان دونوں جاتے۔ بچوں کو پھنکوانے، مقدمے میں جیتنے کی اور گائے کے یہاں بچھیا یا نے اور بہو کے یہاں بیٹا ہونے کی دعا کرانے، جانور کو اپھارہ ہو یا آدمی کو، اس کے لیے جڑی لانے۔ کی میاں نے کٹیا کے ارد گرد بہت سی جڑی بوٹیوں کے پودے لگا رکھے تھے ان کا فیض سب کے لیے تھا۔ نماز پڑھنے وہ کبھی مسجد نہیں گئے، کسی نے انھیں نماز پڑھتے بھی نہیں دیکھا۔ اللہ بھلا کرے کی جگہ مالک بھلا کرے کہا کرتے تھے لیکن ان کی شبیہ اور شہرت مسلمان کی ہی تھی اس سے کہ ان کے پاس زیارت والی اشیا اسلام سے تعلق رکھتی تھیں اور کبھی انھوں نے اشارہ کیا تھا کہ ان کی کافی زندگی مکہ معظمہ میں گزری تھی اس مناسبت سے ان کے وقت کے ایک بزرگ نے جو گاؤں کی ٹوٹی چھوٹی مسجد میں امامت کرتے تھے، انھیں مکی میاں کا لقب دے دیا تھا۔ انھوں نے کبھی اعتراض بھی نہیں کیا۔

شمشیر جنگ دھڑ دھڑاتے ہوئے اٹھے اور کی میاں کی کٹیا میں جا بیٹھے۔

''ہمیں حکم دینا ہوگی حضرت'' انھوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''جگہ ہم کیا دیں گے۔ سب جگہ مالک کی ہے۔''

''تو پھر تو بالکل اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔'' شمشیر جنگ نے جھولے میں سے چادر نکال کر وہیں مٹی کے فرش پر بچھالی۔ کی میاں دوبارہ وظیفے میں غرق ہو گئے۔ رات کو گاؤں کے کسی گھر سے ان کے لیے کھانا آیا۔ چار روٹیاں، ایک پیالہ دال۔

''بیٹا پہلے تم کھالو۔'' انھوں نے شمشیر جنگ سے کہا مگر یہ چھا مت لانے والا ہندو تھا کہ مسلمان۔

''پہلے آپ۔'' شمشیر کبھی لکھنؤ نہیں گئے تھے لیکن اس وقت پہلے آپ کی گردان کر بیٹھے۔

''بہت ضدی ہو بیٹا۔ چلو ساتھ کھاتے ہیں۔ اب ڈبوؤ نوالہ۔'' شمشیر جنگ نے کنویں پر جا کر ہاتھ دھوئے اور بلا تکلف روٹی توڑ کر نوالہ دال میں ڈبویا۔ ''اہو بھائیہ! آپ کا جھوٹا کھائیں گے'' کی میاں نے اسی پیالے میں روٹی اس طرح ڈبو کر کھائی کہ ان کی انگلیاں دال سے مس نہیں ہوتی تھیں۔ ایک روٹی کھا کر پانی کا گلاس اٹھالیا۔ تین روٹیاں شمشیر جنگ نے کھائیں۔ قدرے موٹی بڑی بڑی دیہاتی روٹیاں تھیں۔ پیٹ بھر گیا۔ بچی دال اٹھا کے پی گئے۔ وہی پیالہ دھو کر اس میں باغ کے کنیا میں رکھے گھڑے سے پانی نکال کے غٹ غٹ پیا اور چین کی نیند سو رہے۔ اب دیکھو سسرو ہم تو مسلمان کی کٹیا میں آکے مسلمان کا جھوٹا کھا گئے۔ کر لو جو کرتا ہو

بھائیوں کے درمیان دہکتی آگ میں گھی پڑ گیا۔ چاروں طرف مشہور کر دیا گیا کہ شمشیر جنگ تو علی الاعلان مسلمان ہو گئے ہیں اور انھیں کلمہ پڑھانے والے ہیں کی میاں۔ گاؤں میں ان کے خلاف بھی جذبات بیدار ہوئے لیکن ان کی بے ریا شخصیت اور سادہ لوحی نے برسوں میں جو مقام بنایا تھا اس پر زیادہ آنچ نہیں آئی۔ اس وقت لوگوں میں اتنی رواداری تھی اور عدم تحمل کی شدت ایسی نہیں تھی ورنہ کی میاں کٹیا سے کھینچ کر مار دیے گئے ہوتے۔ کچھ لوگوں نے برا بھلا کہا ضرور لیکن کچھ لوگوں نے اسے شمشیر جنگ بہادر کے جھکی مزاج کا کرشمہ سمجھا۔ بیوی دونوں بچوں کو لے کر کی میاں کی کٹیا پر آئیں۔ ہاتھ جوڑ کر انھیں سلام کیا اور درخواست کی کہ ان کے شوہر کو چھوڑ

دیں۔ کی میاں دیر تک خاموش رہے۔ پھر آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر بولے۔ اس مالک نے ان کی ذمہ داری تم پر ڈالی ہے۔ تمہاری ذمہ داری ہم پر نہیں، جاؤ۔" کی میاں کا حکم ٹالنا ممکن نہیں تھا۔ شمشیر جنگ وہاں سے اٹھ گئے۔ بھائیوں نے کہا، گر یہ گھر پر آئے تو ان کے کنبے کا حقہ پانی بھی بند کر دیا جائے گا، ابھی تو صرف انھیں کا بند ہوا ہے۔ رات کی تاریکی میں شمشیر جنگ خاموشی سے اٹھ کر کہیں چلے گئے اور ایسے گئے کہ باوجود تلاش بسیار ان کا پتہ نہیں ملا۔

بھائیوں کے انتقام کی آگ سرد پڑ گئی۔ بے حد پشیمان ہوئے۔ بھاوج بے نقط سناتی تھیں لیکن کان دبا کے سن لیتے تھے۔ بچوں کی کفالت اپنے ذمے لے لی تھی۔ ویسے بھی زمین، پیداوار، گھر، سب میں ان کا حصہ تھا۔

○

لنگڑی بیوی، مسلمان بچے۔

شمشیر جنگ بے سہارا بھاگے تھے۔ بڑی بے سروسامانی اور ایک نہایت الجھی ہوئی ذہنی کیفیت کے تحت جانے کہاں کہاں گھومتے پھرے۔ چہرے بشرے سے اچھے گھر کے لگتے تھے۔ کوئی چائے پلا دیتا۔ کوئی ساتھ میں دو بسکٹ بھی دے دیتا۔ کبھی کبھی رونا شروع کرتے۔ ہم وزیر جنگ بہادر کی اولاد، ہمیں مغلوں سے جنگ بہادر کا خطاب ملا تھا کہ ہمارے ایک بزرگ نے قلم چھوڑ کر کبھی تلوار پکڑی تھی پھر ہم قلم پر واپس آ گئے لیکن خطاب چپکا رہا۔ اب ہمیں کیا خطاب ملنا چاہیے بھکاری جنگ بہادر، فقط نارائن گم، ہمارے معصوم بچے، ہماری وفادار بیوی۔ لعنت ان برادران یوسف پر۔ پھر ان کا دل دماغ کچھ درست ہوا تو انھوں نے ایک قصبے میں ٹھہر کر وہاں غلے کے ایک آڑھتی کے یہاں حساب کتاب دیکھنے کا کام سنبھال لیا غلے کا وہ آڑھتی مسلمان تھا۔

کی میاں گاؤں میں ساری زندگی گزار گئے لیکن کوئی ایک بندہ بھی ان کے ہاتھوں مسلمان نہیں ہوا۔ غلے کے ایک ناخواندہ آڑھتی نے شمشیر جنگ بہادر کے نام میں ذرا سا تصرف کر کے کلمہ پڑھوایا اور مسلمان کر لیا۔ اب ان کا نام شیخ شمشیر علی ہو گیا تھا ور وہ اس دولت مند آڑھتی کی اکلوتی لیکن قدرے لنگڑی لڑکی کے شوہر تھے جس کی شادی لنگ کی وجہ سے نہیں ہو پائی تھی اور عمر تیس سے تجاوز کر رہی تھی ور اس زمانے میں تیسی کھیسی کے محاورے میں لوگ سختی سے

یقین کرتے تھے جب کہ آج سارے حسن، جوانی اور دولت کے باوجود ماڈلز اور فلم اسٹار تیس کیا بتیس کی عمر میں شادیاں کر رہی ہیں۔ ("ابھی کم بختوں کو یا تو کسی کا گھر توڑنا پڑتا ہے ورنہ عمر میں کم لونڈے سے شادی رچانی پڑتی ہے۔ وہ کچھ عرصہ بعد چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے۔" یہ خالہ لال جھلو کا تبصرہ تھا۔)

غلے کے آڑھتی کی بیٹی کچھ پڑھی لکھی اور بے حد نیک اور شریف تھی۔

"آپ کو اپنے بیوی بچوں کی یاد نہیں آتی۔" ایک دن اس نے پوچھا "آپ انھیں بے یار و مددگار چھوڑ آئے۔"

"ہم اپنی پچھلی زندگی پر مٹی ڈال آئے ہیں۔ رہی یاد وہ آتی ہے۔ رہا تمہارا یہ لفظ بے یار و مددگار تو ہمیں اپنے بھائیوں پر پورا بھروسہ ہے۔ انھوں نے انھیں یوں نہیں چھوڑ دیا ہوگا۔ ہمارا سسرال بھی مضبوط تھا۔"

"انھوں نے آپ کو اپنے یہاں پناہ نہیں دی؟"

"اگر ہم شروع میں چلے گئے ہوتے تو ضرور دے دیتے۔ ہم جو کی میاں کے یہاں جا بیٹھے وہ غضب ہوا۔"

"ہمارے دل میں کانٹا سا کھٹکتا ہے تو آپ کو کتنی تکلیف ہوتی ہوگی۔"

"نیک بخت دل خوش کرنے والی باتیں کیا کر۔ دل دکھانے والی نہیں۔"

نیک بخت نے خاموشی سے کافی پیسے خرچ کر کے شوہر کے گاؤں کسی شخص کو بھجوایا اور ان کے ہندو خاندان کی خبر گیری کرائی۔ لوگ ٹھیک ٹھاک تھے۔ واقعی بھائیوں نے انھیں سنبھال لیا تھا لیکن پیسہ رشتوں کا نعم البدل نہیں ہو سکتا، آنسو ضرور پونچھ دیتا ہے۔ پیسہ ہو تو دکھ رہتے تو دکھ ہی ہیں لیکن آرام سے کٹ جاتے ہیں۔ عبدالنساء کے فرستادہ نے کی میاں کے جھونپڑے میں قیام کیا۔ وہ بے حد نحیف ہو گئے تھے لیکن ہاتھ پیر چلتے تھے۔ کانپتے کپکپاتے اٹھ کر حوائج ضروریہ کے لیے جاتے، اپنے ہاتھ سے کھانا کھا لیا کرتے تھے۔ کچھ زمین پر گرتا کچھ منہ میں جاتا۔ کنویں پر بیٹھ جاتے تو کوئی بھلا مانس آ کے انھیں نہلا دیتا، ان کی لنگی پچھینچ دیا کرتا تھا۔

وہ شخص اولاد کے لیے دعا کرانے کے بہانے سے وہ دو دن رکا تھا۔ جس وقت ساری

اطلاعات لے کر واپس ہو رہا تھا کہ شمشیر جنگ بہادر کی بیوی ان کے لیے کھانا لے کر آئیں۔ بندی سندور سے مزین چہرہ، بھر ہاتھ چوڑیاں، پیر کی انگلیوں میں بچھوے۔ لیکن شوہر کی گم شدگی سے پیدا حزن و ملال چہرے پر لکھا ہوا تھا وہ چہرہ ایک ایسی بیوہ کا چہرہ تھا جس کے جسم پر سارے سہاگ چنھ، موجود تھے۔ اپنے ہاتھ سے چند لقمے فقیر کے منھ میں ڈالے بولیں۔ بابا بٹیا کے رشتے کی بات ہے۔ لوگ سول کرتے ہیں باپ کہاں گیا، کیوں گیا۔

اچانک نکی میاں کی آواز کا رعشہ جیسے پل بھر کو غائب ہو گیا۔ مضبوط آواز میں بولے ''آجائے گا، آجائے گا۔'' انھوں نے جھک کر پیر چھوے۔ بابا نے تھاں سرکا دی تھی۔ بچا کھانا چڑیوں کو ڈال کر وہ واپس ہو گئیں۔

○

متان میاں شمشیر جنگ بہادر کی مسلمان اولادوں کی چوتھی پشت میں تھے۔ ان کے پردادا کی نانہال سے شیخ کا ٹائٹل اختیار کیا گیا تھا۔ اگر دنیاوی دستور کے مطابق چلتے اور نسل پرداد کے وقت سے نانہال سے رشتہ نہ جوڑ رہی ہوتی تو کائستھ گھرانے کا خاندانی ٹائٹل نگم اختیار کرتے۔ بہت سے راجپوت گھرانوں نے مسلمان ہونے کے بعد ٹائٹل برقرار رکھے تھے اور ایک پوری کھیپ مسلمان راجپوتوں کی تھی جو زوتارے کہلاتے تھے اور آپس میں ہی شادی بیاہ کرتے تھے۔ مشرقی یوپی کے ایک دور افتادہ گاؤں میں متان میاں کے پردادا کے ہندو والد کے بھائیوں کے خاندان آباد تھے۔ پھر ان کی ایک شاخ ضلع کے ایک محلے میں آن بسی تھی جہاں ایک مسلمان خاندان کی ایک خاتون نے اپنا خاصہ بڑا مکان ان لوگوں کے حوالے کر دیا تھا اور ورثہ میں وہ ایک بھائی کو ملا تھا۔ متان میاں کی پردادی نے دانستہ اسی ضلع میں سکونت اختیار کی۔ تعلیم متان میاں کو کائستھ ورثے سے ملی تھی۔ نانہال تو آڑھتیوں کا تھا۔ ان کے دادا کو تعلیم دلوائی گئی اور سلسلہ جاری رہ کر انٹرمیڈیٹ آرٹس اور بی اے سے ہوتا ہوا ایل ایل بی سے گزرتا ہوا سائنس کی اعلیٰ تعلیم تک پہنچا۔ متان میاں اس وقت ساٹھ کے لپیٹے میں تھے۔ بائنی میں پی ایچ ڈی تھے اور سنٹرل ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے رضا کارانہ طور پر دو سال پہلے ہی رٹائرمنٹ لے کر وطن آگر رہ رہے تھے۔ مکان میں مکانیت کم تھی لیکن حاطہ بہت بڑا تھا جس میں انھوں نے سیکڑوں اقسام کے کیکٹس

لگا رکھے تھے اور ان کی دوائی افادیت پر ایک چھوٹی سی ذاتی لیبورٹری میں کچھ ریسرچ کرتے رہتے تھے۔ انھیں نرم گفتار، منحنی سے، شانے جھکا کر چلنے والے متان صاحب کو لوگ کانٹوں والا پروفیسر کہا کرتے تھے۔ لیکن اس خطاب میں تضحیک نہیں محبت ہوتی تھی اور عزت۔

○

امیکا رانی۔ پالک کے کباب کھلا کھلا کے تم نے ناک میں دم کر دیا۔ اب کھانے کو ملیں گے اصلی کباب اور متان صاحب کا بکرا تو نہایت موٹا تازہ ہے۔ ہمیشہ سے پچھلی ران بھجواتے چلے آئے ہیں۔ جب تک چاچی زندہ تھیں تو یک ہانڈی بھر کر بریانی ورقی ہوئی چاپیں بھی آیا کرتی تھیں۔ ران پر چاندی کا ورق لگا ہوا ہوتا تھا۔ اچانک اس نے نئی نویلی بیوی کے چہرے کی طرف نظر ڈالی۔ اس کی ننھی سی ناک سکڑ کر اور ننھی سی ہو گئی تھی۔ اس کے غصے کا پرتو اس کی ہیرے کی لونگ پر پڑ رہا تھا جس کا لشکارا بڑھ گیا تھا۔

وہ زور سے ہنس پڑا۔ کچھ معلوم بھی ہے لیے تم کس لذت سے محروم ہو۔ کھاتی رہو ویجیٹیبل بریانی۔ لیکن یار یہ بتاؤ کہ جو پکاتی ہو اس کو پھر کباب اور بریانی کا نام کیوں دیتی ہو۔ حد ہے میرے ایک دوست کی بیوی بیسن کی کلیجی بناتی ہیں اور وہ بیجٹیرین آملیٹ۔ اب یہ سب کھاتے وقت یہ نہیں لگتا کہ منھ میں بکرے کی کلیجی چلی آ رہی ہے یا پھر ہو سکتا ہے کسی موٹے تازے انسان کی۔ امیکا مارے غصے سے وہاں سے اٹھ گئی۔ لیکن اٹل سچ بول رہا تھا۔ اس کی ایک چاچی بھی بیسن سے کلیجی بناتی تھیں۔ خوب گرم مسالہ اور اچور پاؤڈر ڈال کے بیسن سانتیں تو بس میں دیسی ہی سیاہی مائل سرخ رنگت آ جاتی تھی۔ لیکن یہ اٹل کم بخت اس نے ایسی گھن پیدا کرا دی ہے کہ اب وہ بیسن کی کلیجی نہیں کھا سکے گی۔

بقر عید میں ابھی دو ہفتے باقی تھے۔ اٹل کے والد نے امیکا سے کہا۔ متان صاحب کے یہاں ہو آؤ بیٹا۔ کیبر تو خیر خفی بات ہے۔ وہ تو تمھیں اپنی لائبریری میں بھی نوٹس مل جائیں گے لیکن وہ آج کل بیمار رہ رہے ہیں۔ جاؤ گی تو تھرمس میں سبزیوں کا سوپ بھر کر لیتی جانا۔ میٹھے کے شوقین ہیں۔ کچھ کھیر وغیرہ بھی بنا لینا۔ ویسے ان کی بیوی بے چاری کیا عمدہ شاہی ٹکڑے بناتی تھیں۔

امیکا ناک پر رومال رکھ کر اٹل کے ساتھ چلتی رہی۔ مین روڈ چھوڑنے کے بعد جو گلی

آئی تھی اس کے دونوں طرف قطلے کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں تھیں۔

مسلمانوں کا محلہ۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔

محترمہ یہ ایک ملا جلا محلہ ہے۔ ہر دو تین مسلمان گھروں کے بعد ایک گھر ہندو ہے۔ بس یہ ضرور ہے کہ یہاں مسلمان اقلیت نہیں ہیں، اکثریت بن گئے ہیں۔

ہاں چھوٹے چھوٹے پاکستان بنا رکھے ہیں۔ امیکا کے لہجے میں تنفر تھا۔

اٹل نے اس کی طرف قدرے حیرت سے دیکھا۔ اس نازک سی لڑکی کا مزاج اتنا سخت۔ اور ہر نظریے میں ایسی قطعیت۔ اس نے ماحول کو ہلکا کرنا چاہا۔

''امیکا رانی۔ ذرا بتاؤ تو سہی، اس میں ہندو پاخانہ کون سا ہے اور مسلمان کون سا۔ سب ایک جیسا ہی تو...'' امیکا نے اسے سچ مچ غصے سے گھور کر دیکھا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا ہماری شادی تم جیسے بے ہودہ انسان سے ہو جائے گی۔

''یا یہ کہ جس سے شادی ہوگی وہ ایسا بے ہودہ ثابت ہوگا۔''

امیکا نے منہ پھیر لیا۔

منان صاحب کا گھر دس منٹ میں آگیا تھا۔ بڑے سے بند پھاٹک کے باہر سے ہی کیکٹس کے نایاب پودے نظر آرہے تھے۔ وہ درختوں جیسے اونچے تھے۔ بڑے نایاب پودے۔

انگوری بوا نے دروازہ کھولا۔ دوپٹے کا ایک سرا زمین پر لوٹیں لگا رہا تھا اور دوسرا ان کا سر ڈھانپنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اٹل کو دیکھتے ہی ان کے چہرے پر مسکراہٹ ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گئی۔ ''ارے دلہن بٹیا بھی ساتھ ہیں۔'' وہ مزید خوش ہو گئیں۔

بُوا ہم اندر آئیں؟ اٹل کے لہجے میں شرارت تھی۔

جی جم آیئے بھیا، دلہن بٹیا۔ بُوا کا چہرہ دلی خوشی سے گلنار تھا۔ امیکا پر وہ تاثر ضائع نہیں ہوا۔ پرانی ملازمہ ہیں۔ پرانے لوگ جیونس ہوا کرتے تھے۔ مگر یہ منان صاحب سے رشتہ داری۔ کانٹا پھر کھٹک اٹھا۔ امیکا اندر آئی۔ لق و دق آنگن تھا۔ اس میں بھی کیکٹس کے گملے بھرے ہوئے تھے۔ گنتی میں بڑے انوکھے۔ بے حد خوب صورت پھول تھے۔ کیکٹس میں کھلتے ہیں، شاذ و نادر ہی پھول آتے ہیں۔ کانٹوں کے درمیان اتنا حسن۔

ارے میاں دیکھئے تو سہی کون آیا ہے۔ انگوری بوا کی آواز چھلکی پڑتی تھی۔

منان میاں پہلے ہی باہر نکل آئے تھے۔ دبلے پتلے، منحنی سے انسان، آدھے سے زیادہ بال سفید۔ شانے قدرے جھکے ہوئے۔ بس کوئی ساٹھ پینسٹھ برس کا سن۔ آنکھوں میں بلا کی چمک اور چہرے پر بے پناہ نرمی، صاف رنگت۔ شاید کبھی وجیہہ لگتے رہے ہوں گے۔ ابھی تو بوٹنی کے محقق اور ادب کے اسکالر سے زیادہ لوور ڈویژن کلرک جیسے نظر آرہے تھے۔ لیکن چہرے پر نیکی اور نرم دلی بہ خط جلی لکھی ہوئی تھی۔ امیکا کو دیکھ کر وہ شفقت سے مسکرائے۔ ''شادی پر دیکھا تھا۔ تب تو تم گہنوں کپڑوں سے ایسی لدی ہوئی تھیں کہ چہرہ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا۔ ماشاءاللہ اٹل کو دلہن پیاری ملی ہے۔''

جی، واقعی ماشاءاللہ۔ اٹل کے لہجے میں شرارت تھی۔ امیکا نے آنکھیں تریر کر اسے دیکھا۔ پھر گردوپیش پر نظریں دوڑائیں۔ آنگن کے بعد برآمدہ تھا۔ اس میں تین تنومند مرغیاں پھدک رہی تھیں۔ دو چار جگہ بیٹ بھی تھی۔ اندر ڈرائنگ روم میں جہاں وہ لوگ بیٹھے، فرنیچر پر دھول تھی۔ یہ ہے ایک انٹیلکچوئل کا گھر۔ امیکا نے سوچا۔ میاں مسلمان گندگی سے اوپر کیسے اٹھ سکتے ہیں۔

بھیا چائے پئیں گے یا ٹھنڈا؟ بُوا پوچھ رہی تھیں۔

''چائے ہی پلا دو۔''

امیکا نے ٹھنڈی بوتل پر رضامندی ظاہر کی اب چائے نہ جانے کیسے برتنوں میں آئے گی۔ اور یہ بوا خود کیسی میلی کچیلی ہو رہی ہیں۔ پتہ نہیں چائے میں کیا گندگی گھولیں گی۔

چائے کے ساتھ بُوا ایک پیالے میں حلوہ لائی تھیں۔ خوش رنگ اور گھی میں تر بتر۔ دوسری میں نمک پارے تھے۔ ابھی کڑھائی چڑھاتے ہیں۔ پیاز کے پکوڑے تلیں گے۔ بھیا کو بہت پسند ہیں۔ انھوں نے مسرور لہجے میں اعلان کیا۔

امیکا نے دیکھا چائے کیتلی میں دم کی ہوئی تھی۔ دودھ اور چینی الگ الگ تھے۔ برتن ویسے گندے نہیں تھے جیسی اس نے امید کی تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے فی الفور اعلان کیا۔ ''ہمارا آج برت ہے۔ ہم کچھ نہیں کھائیں گے بس یہ ٹھنڈا پی سکتے ہیں، چائے تو ویسے بھی نہیں پیتے۔''

اٹل نے اسے حیرت سے دیکھا۔ "اور جو صبح پراٹھے تناول فرمائے آپ نے۔ برت ہے آپ کا۔"

امبیکا سٹ پٹا گئی۔ "وہ سنگھاڑے کے آٹے سے بنے تھے۔ بس ایک ٹائم کھا سکتے تھے، کھا لیا۔ اب کل صبح ہی کچھ کھائیں گے۔"

"اور محترمہ یہ برت ہے کس بات کا؟ ایک نہایت اعلیٰ شوہر آپ کو مل گیا۔ اولاد کی آپ کو جلدی نہیں ہے اور آج بدھ کو تو عموماً کوئی برت نہیں ہوتا۔"

"گھر چھوڑ کر جاتی ہوں۔ کاہے کا برت ہے۔" امبیکا نے زیر لب دانت پیس کر کہا۔

"حلوہ انڈے کا ہے۔ انڈا تو تم کھاتی ہو۔" اٹل باز نہیں آیا۔ ویسے انگوری بوا کا نام حسب الحال تھا، انگوری بوا اس لیے کہلانے لگیں کہ انگوری کا حلوہ بہت عمدہ بناتی ہیں۔ ویسے بھی یہ حلوہ مزے دار ہیں۔ بوا مسکرائیں۔

بوا کے دانت پان کے استعمال کی کثرت سے کتھئی ہو گئے تھے۔ آگے کے دو ٹوٹ بھی گئے تھے۔ وہ جنتیں تو دبلے، لبوترے چہرے کی وجہ سے کسی گلہری سے مشابہ لگتی تھیں۔ ویسی ہی بے چین اور معصوم بھی تھیں۔

"انگوری، مطلب انگوروں سے بھی حلوہ بنتا ہے؟"

اٹل ہنسا۔ بوا اور منان صاحب بھی مسکرائے۔

"دلہن بٹیا۔ بعد میں بتائیں گے انگوری کسے کہتے ہیں۔ ذرا پکوڑے نکال لائیں۔"

"کیا بوا، پکوڑوں پر ٹرخائیں گی۔ اور کچھ نہیں ہے۔"

"اب بھیا کباب دباب تو ہیں نہیں۔ میاں کو گوشت منع ہو گیا ہے۔ تھوڑا بہت کھا لیتے ہیں۔ بتا کے آؤ تو بنا کے رکھیں۔"

"ارے تو بقر عید!"

منان صاحب خاموشی سے بوا اور اٹل کی گفتگو سن رہے تھے، ہولے سے ہنسے۔

میاں دروازے پر بکرا بندھا ہے۔ اب ہمیں گوشت منع ہوا ہے، اوروں کو تو نہیں۔ اور چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے تو نہیں جاتا۔ بقر عید کا گوشت تو ہم بھی ضرور کھائیں گے۔

دلہن بٹیا نہیں کھاتی ہیں کا؟ بوا نے پوچھا اس لیے کہ انہیں امبیکا کے چہرے پر انقباض کے آثار نظر آ رہے تھے۔

"نہیں، ہم نہیں کھاتے۔" امبیکا کے لہجے میں نادانستہ درشتی تھی۔

"ہائے کم بخت تو نے چکھی ہی نہیں۔ اٹل نے اپنے مخصوص چھیڑنے والے لہجے میں کہا پھر کسی بدمزگی کے ڈر سے جلدی سے بول پڑا۔ منان چاچا، آپ کی قدم بوسی کے لیے تو انہیں آنا ہی تھا لیکن آج یہ اس لیے آئی ہیں کہ ان کا مقالہ ہے کبیر پر۔ آپ کے پاس بہت سی کتابیں ہیں۔"

"ہاں، ہاں۔ بیٹا، چلو میری اسٹڈی میں۔" وہ اٹل کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور امبیکا کو آنے کا اشارہ کیا۔

اسٹڈی میں آ کر امبیکا کی آنکھیں کھل گئیں۔

یہ ایک وسیع ایئرکنڈیشنڈ کمرہ تھا جس میں نہایت سلیقے اور ترتیب سے گھومنے والے لانبے لانبے ریک لگے ہوئے تھے۔ اوپر مضمون اور زبان کا نام تھا۔ انگریزی، ہندی، اردو اور جرمن زبانوں کے لیبل تھے۔ ایک طرف بڑی سی میز تھی۔ اس پر کمپیوٹر کچھ کتابیں، قلم اور نوٹ بکس تھیں۔

"آپ کو جرمن آتی ہے؟" امبیکا نے حیرت سے کہا۔

چاچا تین سال جرمنی میں رہے ہیں۔ جانے سے پہلے جرمن زبان کا ایک کورس کر کے گئے تھے۔

جتنے ان کے مضمون کی کتابوں کے ریک تھے لگ بھگ اتنے ہی ادب، ہسٹری، سوانح اور سفرناموں کے بھی۔

امبیکا پڑھنے کی شوقین تھی۔ اسے محسوس ہوا وہ ایک غار میں آ گئی ہے جہاں اسے علی بابا کے اشرفیوں سے بھرے تھیلے پڑے دکھائی دے گئے ہیں۔ وہ ندیدوں کی طرح ریک گھما گھما کر کتابوں کے ٹائٹل پڑھنے لگی۔ جرمن اور اردو سے وہ نابلد تھی لیکن ہندی اور انگریزی میں اتنی کتابیں تھیں کہ پڑھنے کو یک عمر کافی نہیں تھی۔

"لگتا ہے تمہیں کتابوں سے شغف ہے۔" منان صاحب کے لہجے میں شفقت تھی اور

مسرت بھی۔ امبیکا جس طرح گھوم گھوم کر ریک دیکھ رہی تھی اور کتابیں الٹ پلٹ کر رہی تھی اس سے کسی کو بھی اندازہ ہو سکتا تھا کہ اسے پڑھنے کا شوق ہے۔

امبیکا پران کے لہجے کی شفقت ضائع نہیں ہوئی۔ اچھا لگا کوئی اجنبی شخص، ایک انجان بزرگ اسے پیارے مخاطب کر کے کتابوں سے اس کی محبت کا اعتراف کر رہا ہے۔ اب... اس نے دل ہی دل میں سر کھجایا۔ ٹھیک ہے دوسری قوم ہیں... چلو اچھے لوگ تو سب میں ہوتے ہیں۔ قدرے توقف کے بعد وہ ذرا جھجکتے ہوئے بولی۔ "یہ کیبر پر ایک آدھ کتاب ہم لے جا سکتے ہیں؟"

"ایک آدھ نہیں۔ جتنی بھی ہیں لے جاؤ۔ یہاں انھیں پڑھنے والا کون ہے۔ مگر ہاں... وہ مسکرائے۔ واپس کر دینا۔ جب تک زندہ ہیں ان کا موہ برقرار ہے۔ مر جائیں تو لے لینا۔ جو نہ درکار ہوں لائبریری کو دے دینا۔"

"ارے منان چاچا۔ آپ سو برس جئیں۔ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔" انل نے کہا۔

"ستر پار ہو گیا بیٹا۔ اتنی عمر بھی کتنوں کو ملتی ہے۔ تمہاری چاچی۔" وہ افسردہ ہو گئے۔

"longevity بڑھی ہے۔ آپ بڑی لمبی ویٹنگ لسٹ میں ہیں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ ۹۰ سے پہلے تو آپ کو کھسکنے نہ دیں گے۔ وہ چاچی کا ذکر نظر انداز کر گیا۔ منان چاچا بہت اداس ہو جایا کرتے تھے۔ میاں بیوی بالکل سارس کا جوڑا تھے۔

کیبر پر چھ سات کتابیں تھیں۔ "فی الحال اتنی پڑھ لوں" کہتے ہوئے اس نے تین سنبھال لیں۔ "یہ واپس کر کے اور لے جاؤں گی۔" انگوری بوا نے جلدی سے کھادی کا ایک چھوٹا سا تھیلا لا دیا جس پر بھی منان صاحب کی اہلیہ نے سوتے دھاگوں سے بڑے بڑے ابھرے ہوئے پھول کاڑھے تھے۔

"اس میں رکھ لیجیے دلہن، لے جانے میں آسانی ہو گی۔"

"بلکہ تھیلا بھی رکھ لیجیے دلہن —" منان صاحب نے انگوری بوا کی نقل میں دلہن نہ کہہ کر دلہن کہا۔ "آپ کی چاچی کو کشیدہ کاری کا بہت شوق تھا۔" وہ پھر مسکرائے۔ ایک اداس سی مسکراہٹ۔

گھر آ کر امبیکا منھ پھلا کر بیٹھ گئی۔ "ناراض کیوں ہو؟" انل نے پوچھا۔ کتابیں مل گئیں۔ ایسا خوب صورت کیری بیگ مل گیا۔ حلوہ بھی مل جاتا۔ تمھیں نے نہیں کھایا۔"

"تم نے وہاں ہمیں جھوٹا کیوں بنایا۔ کیوں کہا کہ ہم صبح پراٹھے کھا رہے تھے۔"

"امبیکا رانی۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ تم چھوت چھات مانتی ہو۔ ٹھیک ہے گوشت نہیں کھاتیں لیکن منان صاحب کے یہاں چائے پی لینے میں کیا حرج تھا۔ ویسے ہم نے جان بوجھ کر نہیں جھٹلایا۔ ایک دم سے سمجھ نہیں پائے کہ تم بہانا کر رہی ہو۔"

"ہم چھوا چھوت نہیں مانتے لیکن اس قدر گندا گھر تھا کہ جی نہیں چاہا۔ تم وہاں کیسے کھا لیتے ہو۔"

"گندا تو نہیں تھا امبیکا۔ بکھرا ہوا ضرور تھا۔ کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ ہاں کچن انگوری بوا خاصا صاف رکھتی ہیں۔"

"مسلمان بہت ہی گندے ہوتے ہیں۔ تم کچھ کہہ لو"

"امبیکا رانی، آج ہم میڈیا کے ذریعے لوگوں کو صاف رہنا سکھا رہے ہیں۔ سوچھ بھارت اسکیم سے پہلے سے اس طرح کے میسج اور اشتہار دکھائے جا رہے ہیں کہ کھانا ڈھک کر رکھو، فراغت کے بعد ہاتھ صابن یا مٹی سے دھو لو۔ کھلے میں رفع حاجت نہ کرو۔ یہ صرف مسلمانوں کو تو نہیں سکھایا جا رہا۔ ہر جگہ لوگ بلا تکلف تھوکتے پھرتے ہیں۔ جہاں پاتے ہیں وہاں اچھے اچھے لوگ پیشاب کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔" اچانک انل جیسے غصے میں آ گیا تھا۔

امبیکا نے ہار نہیں مانی۔ "تم جو کہہ رہے ہو سچ ہے۔ پھر بھی ان کے محلے زیادہ گندے ہوتے ہیں۔"

ان سے تمہاری مراد مسلمانوں سے ہے۔ ہاں ان کے یہاں تعلیم کی کمی ہے۔ دوسرے یہ کہ میونسپلٹی والے بھی مسلم محلوں کی طرف پوری توجہ نہیں دیتے۔ ہم نے انھیں حاشیے پر ڈال رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم محلوں میں گندگی واقعی کچھ زیادہ دکھائی دیتی ہے، لیکن تب کیا انھیں راستے پہ لانا گورنمنٹ سے لے کر سماج تک سب کا فرض نہیں بنتا؟

"تم اتنے Pro Muslim کیوں ہو انل۔ منان صاحب سے تین چار پشت پہلے کی زبردستی کی رشتے داری کو لے کر؟ تم تو نہیں ہو نا مسلمان۔ تمہاری ڈائرکٹ لائن میں تو کوئی نہیں۔"

"ہم سخن فہم ہیں، غالب کے طرف دار نہیں۔" اس کی فطری خوش دلی لوٹ آئی۔

"کیا کہا؟"

"ارے رانی ہم صرف rationalist ہیں لیکن ایسا ہے کہ ہم اگر ان بحثوں میں نہ پڑیں تو بہتر ہوگا۔ صرف عاشق دمعشوق رہیں۔"

امیکا ہنس پڑی۔ "بہت اردو بولتے ہو۔"

"ہماری گھٹی میں ہے۔ بلکہ پورے نارتھ انڈیا کی گھٹی میں۔ اسے ہم ہندی کہتے ہیں۔"

○

بقرعید کے روز کوئی ایک بجے انگوری بوا ایک بڑا سا خوان ایک لڑکے کے سر پر رکھوائے ڈگر ڈگر کرتی وارد ہوئیں۔ ان کے اپنے ہاتھ میں ایک سینی الگ تھی۔ خوان اور سینی دونوں پر سائن کے نہایت خوب صورت گوٹے کے کام والے خوان پوش ڈھکے ہوئے تھے۔ سینی انھوں نے بڑی ماں کے ہاتھ میں تھمائی اور پوچھا کہ بڑا تھال کہاں رکھوا دیا جائے۔ وہ تھال علیحدہ میز پر رکھا گیا۔ اس میں ایک بڑی سی تنومند ران تھی جس پر چاندی کے ورق لگے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ کئی پیالے تھے جن میں پکی ہوئی چیزیں تھیں۔ وہی میں پکی ہوئی کلیجی، تر تراتی بریانی اور شامی کباب۔

چھوٹی سینی جو بڑی ماں کے ہاتھ میں دی گئی اس میں بادام پستوں اور چاندی کے ورق سے سجا زعفران اور کٹہل کی نہایت خوش رنگ سبزی تھی جس پر گوشت کا گمان ہو رہا تھا۔

"یہ آپ کے اور دُلہن کے لیے ہے۔ معلوم ہوا دُلہن بھی گوشت نہیں کھاتیں۔ کہہ دیجیے گا بالکل الگ کر کے بنائی ہے۔ گوشت کا چمچ تک سبزی میں نہیں لگایا۔"

دادی تو خیر کسی کے یہاں کچھ نہیں کھاتی تھیں۔ اب چلنے پھرنے میں بھی لگ بھگ معذور ہی تھیں۔ ان کی رسوئی بڑی ماں بناتی تھیں اور خود بھی اسی میں سے لے کر کھاتی تھیں۔

"بڑی ماں نے انگوری بوا کو سو کا نوٹ لا کر تھمایا۔ منان بھائی کو نستے کہنا۔ برتن بعد میں جائیں گے۔" پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔ "تہوار پر ان کی بی بی یاد آ جاتی ہیں۔ بھلی مانس تھیں۔ ہم سب بوڑھے ہو گئے۔ کوئی آگے گیا کوئی پیچھے تیار بیٹھا ہے۔"

"اللہ کی مرضی۔ ہماری بی بی تو بے تُیم چلی گئیں۔ آپ ایسا نہ کہیں۔ ابھی تو آپ کی

ساس ہیں۔ پھر اٹل بھیا کے لڑکے کھلانے ہیں۔"

برتن بہت صاف تھے۔ کھانا بڑے سلیقے سے سجا کر لایا گیا تھا۔ ساس کے کہنے پر امیکا نے تھوڑی تھوڑی سی دونوں چیزیں چکھیں۔ جب بڑی ماں خود کھا رہی تھیں تو اسے نخرہ کرنا اچھا نہیں لگا۔ لیکن اٹل کو اس نے ہدایت دی: برش ٹھیک سے دو بار کرنا اور لسٹرین سے غرارے بھی۔ اس کے بغیر میرے پاس مت آنا۔ اٹل تو بریانی پر ٹوٹ پڑا تھا۔

"ابھی تو چاچا اور پاپا بیٹھ کر ران کو کوئلوں پر سینکیں گے۔ مہاراج سے کچا پپیتا پسوا دیجیے گا۔ باقی مسالے چاچو خود نکال کے دیں گے۔" اٹل کے لہجے میں شرارت تھی۔ "ایسی خوشبو پھیلے گی کہ شاید آپ کھانے ہی لگیں اے رانی۔"

امیکا نے اسے مصنوعی غصے سے گھور کر دیکھا۔ دادی کو کھلا کے دیکھو تو جانیں۔ آنکھوں میں غصہ تو مصنوعی تھا لیکن لہجے میں طنز تھا اور دادی کو گوشت کھلانے کی بات تحت۔

اٹل ذرا بھی ناراض نہیں ہوا۔ رسان سے بولا۔ "دادی نہایت کھلے دل کی ہیں۔ ہاں وہ کھاتی کسی کے یہاں نہیں۔ بیوہ ہونے کے بعد تو انھوں نے اپنی چھوٹی سی رسوئی گھر کی رسوئی سے بھی الگ کر لی۔ لیکن یہ ان کی اپنی مرضی ہے۔ کھانے پینے کی پابندیوں نے انھیں کسی سے نفرت کرنا نہیں سکھایا۔ گھر کے سارے مرد و مزے سے گوشت کھاتے ہیں۔ میری ماں بھی کھاتی تھیں اور سنتے ہیں بناتی بھی بہت اچھا تھیں۔"

"اچھا اچھا۔ بہت ہوا۔ ہم کیا کسی سے نفرت کر رہے ہیں۔"

اٹل نے بات آگے نہیں بڑھائی۔ دل میں کہا۔ شاید اسے رانی، یہاں ہماری اور تمہاری سوچ میں فرق آ جاتا ہے۔

ایک گھر سے ابھی گوشت آنا باقی ہے۔

تیسرے دن اٹل خوش ہو کر کہہ رہا تھا۔ یہ اس کے ایک گہرے دوست انیس کی طرف اشارہ تھا جس کے یہاں قربانی عموماً تیسرے دن بھی ہوتی تھی۔

لیکن تیسرے دن علی الصبح ایک بڑا طوفان آن پڑا۔

بقرعید کے دوسرے دن کہیں ایک بڑے جانور کے باقیات پکڑے گئے ور وہ بھی اٹل

کے محلّے کے پیچھے ہی۔ لاکھ صفائی دی گئی کہ یہ ایک بھینس تھی لیکن ایک طبقہ اسے سیاہ گائے کہنے پر مصر رہا۔ منان صاحب تصفیہ کرانے باہر آ گئے۔ ابھی صرف معاملہ تیز بحث، گالی گلوج اور دھمکیوں تک ہی تھا۔ تشدد نہیں شروع ہوا تھا۔ انھوں نے سوچا شاید سمجھا بجھا کر چپقلش کو رفع دفع کر سکیں لیکن وہی چوٹ گئے۔ ان کی ساری بزرگی، ساری دانش وری، سارا سیکولرازم رکھا رہ گیا۔ سر اور شانے پر بہت چوٹیں آئیں۔ اس سے قبل کہ وہ سنگین طور پر زخمی ہو جائیں پولیس آ گئی۔ ایک اہل کار بھی ان کا شاگرد رہ چکا تھا اس نے انھیں بچا لیا اور ہسپتال پہنچانے کا انتظام کیا۔ جالور کے باقیات اور جہاں سے وہ برآمد ہوئے تھے وہاں کے کئی گھروں سے لوگوں کو پولیس لے کر چلی گئی۔ پھر بھی ٹینشن پورے علاقے میں یوں پھیل گیا جیسے پانی پر تیل۔ کرفیو کا اعلان ہو گیا۔ پولیس جیپیں گھومنے لگیں اور مسلم محلّے گھیر لیے گئے جیسا کہ دستور تھا۔ اُس کا محلّہ بھی مسلم اکثریت کا محلّہ تھا۔

امبیکا بے حد خوف زدہ تھی۔

"کس سے ڈر رہی ہو اب۔ ان سے جن کے سر پر پولیس رائفل تانے کھڑی ہے؟ ارے بھئی پاپا نے کرفیو پاس بنوا لیا ہے۔ منان صاحب کو دیکھنے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ان کے دور دراز کے عزیز شہر میں ہیں ضرور لیکن مجھے پوری امید ہے کوئی نہ جائے گا۔ سب ہے بیٹھے ہیں۔"

"تو۔ تو سب سے بڑے رشتے دار تمھیں ہوا اٹل۔ امبیکا کے خوف میں ناراضگی گھل گئی تھی۔ ہمارے ہی دیش میں رہ کر لوگ گائے کاٹیں گے۔ پھر وہ بالکل ہی ہتھے سے اکھڑ گئی اس لیے کہ اٹل نے قدرے غصے سے کہا "یہ ہمارے دیش سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ اور تم اتنی بھول نہیں ہو کہ یہ نہ جانو کہ مسلمانوں کو کاٹنے کے لیے گائے لے کر دینے والے ہندو گوالے ہیں۔ مسلمان تو ہمارے یہاں scavenger کا کام کر رہا ہے۔" امبیکا کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ تیز آواز میں بولنے لگی۔ "تم جیسے لوگوں نے ہی ان کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔ یہ کبھی ہندوستان کے ہوئے نہ ہوں گے۔ ان کی آتما پاکستان میں بستی ہے یا مکّے مدینے میں۔ دیش ہمارا نہیں تو کس کا ہے؟ ان کا حصہ دے دیا ہم نے۔ خود راجندر بابو نے اپنی کتاب میں یہ بات کہی کہ حصہ دینے کے بعد بھی ہم اس کئی کروڑ کی مصیبت سے چھٹکارا نہیں پا سکے۔"

"جواب دو۔ نا۔ نہیں ہے نا جواب۔ تم یہ چلے کہاں؟"

"منان چچا کو دیکھنے۔ اور سنو۔ کھرچو گی تو ہر مسلمان سے کہیں نہ کہیں رشتہ نکل آئے گا۔ بھلے ہی ہزار سال پہلے کی ڈھول جھاڑنی پڑے۔ اور میں کوئی رشتہ داری نہیں لگا رہا۔ رشتے عزت محبت اور آپسی سوجھ بوجھ سے بنتے ہیں امبیکا صرف خون سے نہیں۔ اور رشتے بنانے میں سمجھ داری ہے، توڑنے میں نہیں۔"

"ماحول ٹھیک نہیں ہے۔" امبیکا اس کے پیچھے دوڑی لیکن دیکھا پر دین چندر ساتھ نکل رہے ہیں تو خاموش ہو گئی۔

"یہ دونوں باپ بیٹے پاگل ہیں۔" نوین چندر بڑبڑائے۔ "چلے تیر مارنے۔ ان لوگوں کو سبق سکھانے کی تدبیر نہ کریں گے کہ روز روز کے ٹنٹے ختم ہوں۔"

امبیکا نے حیرت اور خوشی سے دیکھا۔ چاچا اس کے ہم نوا ہیں۔

"بہو تم گھبراؤ مت۔ وہ کہہ رہے تھے۔ بڑے بھیا کے سسرالی عزیزوں کا ایک لڑکا آئی پی ایس ہے۔ آج تک یہ لوگ رشتہ داری نبھا رہے ہیں۔ پھر محلّے کے لوگ ہم لوگوں کی بڑی عزت کرتے ہیں یوں جو خرافات کریں۔ کوئی اٹل اور بھیا کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھے گا۔"

امبیکا وہیں بیٹھ گئی۔ نوین چاچا کی باتوں سے اس کا ڈر خاصا دور ہو گیا تھا۔

"ان پندرہ کروڑ کا کیا کیا جائے گا چاچا۔ نیوسنس ہیں پورے۔"

"پندرہ؟ یہ تو کہتے ہیں بیس کروڑ۔ اور ضرور ہوں گے بہورانی۔ بٹوارے کے ٹھیک پہلے جو الیکشن ہوئے ان میں ۸۶ فی صد نے مسلم لیگ کو ووٹ دیا تھا لیکن جانے کا وقت آیا تو ۸۶ فی صد گئے نہیں۔ سب یہیں دندناتے رہے اور بچے پیدا کر کر کے پاکستان سے زیادہ آبادی بنا لی۔ ویسے بہورانی انھیں ان کی اوقات بتا کر جگہ پر رکھا جائے تو یہ ایک اچھی ورک فورس ہیں۔ بس آپے میں رہیں۔ اور انھیں آپے میں رکھنے کے طریقے ہیں۔" پھر بہو سے زیادہ گفتگو مناسب نہ جان کر وہ آگے بڑھنے لگے۔

چاچا ـــــ چاچا۔ امبیکا کو ایک بات کہنے کا موقع مل گیا جو وہ دادی یا بڑی ماں سے کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔

وہ رُک گئے۔ کیا بھورانی؟

''ایک بات کہنا چاہ رہے تھے۔ یہ جو اوپر کمرہ بند کر کے رکھا ہوا ہے۔ سے ہم دیکھنا چاہ رہے ہیں۔ بیکار پڑا ہوا ہے۔ ہمارے من میں ایک پلان ہے۔''

''اب اس کے لیے تو ماں سے بات کرو یا بھابھی سے۔ وہ ہماری عملداری نہیں ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے چل دیے۔

جن لوگوں کے گھر کے آس پاس وہ باقیات برآمد ہوئے تھے ان میں سے تین لوگ NSA میں گرفتار ہوئے۔ ایک آدمی مارا گیا چار پانچ سنگین طور پر زخمی ہوئے لیکن یہ بہت معمولی واقعہ سمجھا گیا۔ بہت کچھ ہو سکتا تھا لیکن ہونے سے بچ گیا۔ باقی اور کچھ نہیں۔ سنان صاحب بھی ایک دن ہی رکھے گئے۔ مرہم پٹی کے بعد وہ گھر آ گئے تھے۔ انکل ان کے پاس صبح شام جا رہا تھا اور ان لوگوں کے گھر بھی ہو کر آیا تھا جن کا آدمی مارا گیا تھا۔ انکل کے والد پروین چندر بیگم اور دو ایک مسلمانوں نے مل کر امن کمیٹی تشکیل دی۔

امبیکا ناراض بھی تھی اور خوف زدہ بھی۔ دوڑ پڑے یہاں وہاں۔ دونوں باپ بیٹا جھکی ہیں۔ یہی رہ گئے ہیں امن کمیٹی بنوانے اور لوگوں کے گھر جانے کو۔ اور سنان جی کے گھر کے آس پاس تو سارے گھر انھیں کے لوگوں کے ہیں۔ ایک آدھ پتھر کھوپڑی پہ پڑا تو سارا سیکولرازم ناک کے رستے نکل جائے گا۔ مگر کیا کیا جائے۔ سنان جی کو پوچھنے تو نوین چاچا بھی گئے اور بڑی ماں نے سوپ بھجوایا۔ سارے رشتہ داری نبھا رہے ہیں۔ انکل کے پاپا تو کہہ رہے تھے کہ راجندر بابو کے خاندان میں کوئی ایک جن مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کے خاندان کے لوگ ہندو رشتہ داروں کے یہاں بقرعید پر گوشت ضرور بھجواتے اور شادی بیاہ میں ایک دوسرے کو نیوتا دیتے ہیں۔ انجینئر بی۔کے سنہا کی بی بی کہہ رہی تھیں کہ ان کے گھر میں کوئی بھی گوشت نہیں چھوتا پھر بھی بقرعید میں گوشت آتا ہے۔ اور ہم خوشی سے لے کر رکھتے ہیں۔ پرساد ہے بھائی۔ اب ہم کسی کھانے والے کے یہاں بھیج دیتے ہیں۔ گھر میں ایک مسلمان نوکر بھی ہے۔ اسے بھی دے دیتے ہیں۔ ایسا تو امبیکا نے نہیں دیکھا تھا۔ اب کیا کیا پتہ چل رہا ہے۔ رام چندر خاں آئی۔ پی۔ ایس کے خاندان کا ایک پورا گاؤں مسلمان ہے۔ شادی بیاہ میں نیوتا ضرور آتا ہے اور جاتا بھی ہے۔ غرض سمجھ کر سب

ایک دوسرے کے یہاں شریک ہوتے ہیں۔ مسلمان اپنے یہاں کے بھوج بھات میں مہاراج بیٹھا کر الگ پوڑی سبزی مٹھائی بنواتے اور الگ پنگت بٹھاتے ہیں۔ بھیا یہاں تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ یہ ملک ہے کہ بھان متی کا پٹارہ۔ سب ان لوگوں نے ستیاناس کر رکھا ہے۔

کچھ عرصہ گزرا۔ بظاہر لوگ نارمل ہونے لگے گرچہ طوفان سے بچے ہوئے لوگوں کے ذہن میں ابھی غبار تھا۔ پہلی محرم کو بڑی ماں نے دستور کے مطابق اوپر والا بڑا کمرہ کھلوا کر صفائی کرائی اور وہاں اگربتیاں سلگوائیں۔ امبیکا کی شادی کو دس مہینے ہو گئے تھے لیکن اس دوران وہ کمرہ کھلا ہی نہیں تھا اس لیے اس نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ بڑی ماں اسے بھی وہاں لے گئیں۔ دیوار سے لگے علم کھڑے تھے۔ چھت گیری سے جھاڑ فانوس لٹکے ہوئے تھے۔ فرش پر نہایت عمدہ قالین تھا لیکن گھسنے لگا تھا۔ کمرے میں سیلن، اداسی اور گزرا ہوا وقت بھرے پڑے تھے۔ جیسے کسی طلسم کے زیر اثر امبیکا کا جی اپنے آپ بھر آیا۔ کبھی یہ جگہ بارونق رہی ہوگی۔ جن لوگوں کا گھر تھا وہ اس میں اپنی ریت نبھاتے رہے ہوں گے۔ انکل ٹھیک کہتا ہے۔ کسی کا فائدہ ہوا بٹوارے سے۔ کون گیا۔ کون چلا۔ سب انسان ہی تو تھے۔ لیکن جلد ہی اس کا ذہن دوسری طرف منتقل ہو گیا۔ اس کمرے کو یوں بند رکھنے سے کسی کو کیا مل رہا ہے۔ علم پر چاندی سے کڑھے حروف سیاہ پڑ گئے ہیں۔ کپڑا کرم خوردہ لگ رہا ہے۔ انھیں کسی کو دے دیا جائے۔ اور اسی طرح کی چیزوں کو بھی۔ ہاں قالین اب بھی نہایت عمدہ ہے۔ اور جھاڑ فانوسوں کا تو جواب نہیں۔ قالین کو تھوڑا تراش خراش کر کے پروفیشنل لوگوں سے دھلوا لیا جائے تو ڈرائنگ روم میں بچھ جائے گا۔ اس ہال نما کمرے کو وہ اپنی ورک شاپ بنا لے گی۔ اسے فیبرک پینٹنگ میں مہارت حاصل تھی۔ گریجویشن مکمل ہو جائے پھر وہ اپنے اس شوق کو کمرشیل بنائے گی۔ ان لوگوں کو گئے تو زمانہ گزرا۔ حویلی میرے سسرال والوں کی ہے۔ ان کے پرکھوں کے نام لکھی گئی تھی کوئی ناجائز قبضہ تھوڑی ہے۔ ہوتا بھی تو کیا تھا۔ اتنا وقت گزرا کہ بہت کچھ ناجائز جائز ہو گیا اور جائز ناجائز بن گیا۔

بڑی ماں نے کہا۔ ''یہ امام باڑے کی بے ادبی ہو گی بہو۔ جب ہمارے بڑوں کے نام حویلی لکھی گئی تو انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ اس کمرے کو امام باڑہ ہی رہنے دیں گے۔ محرم کے محرم صفائی کر کے اگربتی ہی تو جلائی ہے۔ رہا کمرہ تو بٹیا اتنا بڑا گھر ہے اور رہنے والے اتنے کم۔ تم کوئی

دوسرا کمرہ لے کر اپنی ورک شاپ شوق سے بناؤ۔ ہم دونوں بُڑھیاں چتا پہ چڑھ لیں گی تب جو جی چاہے کرنا۔ زبان کے علاوہ ہم تو امام صاحب کے احسان تلے بھی دبے ہوئے ہیں۔"

"ان لوگوں کے دل میں کیسے کیسے وہم بسے ہوئے ہیں۔ امیکا نے سوچا۔ اب مسلمانوں کے امام حسین سے اس کا مطلب۔ لیکن وہ چپ رہی۔ آج کل کی لڑکی ہوتے ہوئے بھی بزرگوں کی عزت کرنا اس کی سرشت میں شامل تھا۔ پھر اٹل کی بڑی ماں کا قصہ سننے کے بعد تو ان کے لیے دل میں بے پناہ عزت تھی اور ہمدردی بھی۔

اس کے خاموش رہ جانے سے شاید بڑی ماں نے وہ راز اس کے ساتھ شیئر کرنا مناسب سمجھا۔ "پتہ ہے بہورانی۔ تمہارا پتی، ہمارا بیٹا اٹل چار سال کا ہونے کو آرہا تھا لیکن کچھ بولتا نہیں تھا بس آوازیں نکالتا تھا۔ سب مایوس ہو چلے تھے کہ بچہ گونگا ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ تک کہا کہ اپنی ماں کا دودھ نہیں ملا اس لیے ایسا ہو گیا ہے۔" انھوں نے قدرے توقف کیا۔

"ایشور جانتا ہے ہم دودھ تو نہیں پلا سکتے تھے لیکن ہم نے وہ سب کیا جو ایک ماں کر سکتی ہے یا کر سکتی ہے۔ اس میں رتی بھر بھی کوتاہی نہیں کی۔" ان کی آواز اب رندھ گئی تھی۔

"تب ایک دن محرم کی ساتویں تاریخ کو جس دن دُلدل نکلا ہم ملیدے کا تھال اور آرتی لے کر باہر آئے۔ لوگ اپنے بچوں کو دُلدل کے نیچے سے گزار رہے تھے اسے دودھ جلیبی کھلا کر اس کے کان میں اپنی اپنی دعائیں، مانگ رہے تھے کہ حضرت امام تک پہنچیں۔ کسی کے یہاں بیٹا نہیں تھا، کسی کی لڑکی کی شادی نہیں ہو رہی تھی۔ کسی کا پتی بہت بیمار تھا۔ دُکھی لوگ، غرض کے مارے لوگ۔ کس سے چھپا کہیں۔ ہمارا بچہ بول نہیں رہا تھا۔ گھر میں اور کتنے دُکھ تھے۔ ہم نے بھی دُلدل کی آرتی اُتاری، اس کے نیچے سے اٹل کو نکالا اور ہاتھ جوڑ کر ایشور سے پرارتھنا کی کہ "ہے سب کے ایشور، امام صاحب کا واسطہ ہمارے بچے کو وانی دیجیے۔" بس اتنا ہی۔ اور تمہیں تعجب ہوگا بہو ایک مہینہ ہی گزرا ہوگا کہ اٹل بولنے لگا اور سارے بچوں کی طرح پہلا لفظ جو بولا وہ تھا ماں۔ ہمیں کیسا محسوس ہوا یہ ہم نہیں بتا پائیں گے۔ یہ تم جب ہی سمجھو گی جب تمہارا اپنا بچہ تمہیں ماں کہہ کر پکارے گا۔"

امیکا خود کو روک نہ سکی۔ "بڑی ماں، کچھ بچے بہت دیر سے بولتے ہیں۔ کیا یہ آپ کے من کا وہم نہیں کہ اٹل نے اس گھوڑے کے نیچے گزر کر آپ کی پرارتھنا کی وجہ سے بولنا شروع کیا۔"

"بٹیا، دھرم آستھا پر ٹکا ہوا ہے۔ آستھا میں عقل نہیں چلتی۔ مانو تو دیو نہیں تو پتھر۔ اتنے دن بیت گئے تھے جو بچہ ایک لفظ نہیں بولا تھا وہ مہینے بھر میں ہی بول پڑا۔ اور اتنی تیزی سے بولنا شروع کیا کہ سال بھر میں پوری بھرپائی ہو گئی۔ پانچ برس کا اٹل اتنا ہی بولتا تھا جتنا اس کی عمر کے اور بچے۔ اب ہم تو یہی مانتے ہیں۔" ان کے لہجے میں ناراضگی کا عنصر بالکل نہیں تھا۔ بڑی ماں کبھی کسی سے شاید ہی ناراض ہوتی ہوں۔ وہ تو اپنی تقدیر پر بھی ہمیشہ شاکر رہیں۔

"ٹھیک ہے۔ آپ جو چاہیں۔" امیکا نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن اس کے دل میں کہیں ایک پھانس جیسی رہ گئی۔ اب کیا مجھے ان دونوں بڑھیوں کے مرنے کا انتظار کرنا ہوگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کچھ شرمندہ ہو گئی۔ اتنی محبت کرنے والی بزرگ عورتوں کے بارے میں کیا کیوں سوچ رہی ہوں۔

دسویں تاریخ کو قمن نواب کے یہاں سے نکلنے والا تعزیہ حسبِ دستور بھیرو تواس پر آکر رک گیا (زینب منزل کا یہ نام بہادر خاندان کی تحویل میں آنے کے بعد رکھا گیا تھا) کہ عورتیں آکر پرنام کریں گی۔

"کسی نے تو بتایا تھا کہ اب تعزیہ یہاں نہیں رکا کرے گا۔ بلکہ اس کا رُوٹ ہی بدل جائے گا۔" امیکا قدرے ناراضگی کے ساتھ بولی۔

بڑی ماں دبی زبان سے بولیں — اب رُکا ہی ہے تو ..... وہ سر پر آنچل لے کر اُٹھنے کو ہوئیں۔

"نہیں بڑی ماں۔ اب اس سلسلے کو ختم کیجیے بھلے ہی اوپر کا کمرہ بند رہنے دیجیے۔"

بڑی ماں ٹھٹھک گئیں۔ برسوں کا دستور توڑیں یا بہو کو ناراض کریں۔

اپنے کھٹولے پر سکڑی سمٹی، کانپتے ہاتھوں سے ماں پاروتی کی چُنری پر گوٹا ٹانکتی دادی یک بہ یک اپنے پورے قد سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ چُنری انھوں نے ہولے سے بغل میں رکھی چھوٹی سی منقش سائڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ طبل پر چوٹ پڑ رہی تھی۔ لوگ باہر منتظر تھے۔

ملتی دُلتی دادی نے مہری کو پکارا کہ چڑھاوے کا تھال لے کر آئے جو انھوں نے صبح تیار

رکھنے کو کہا تھا۔ ان کی آواز بھی اس وقت کراری تھی۔

کیا ہے اماں؟ اماں تم کہیں گرنا مت۔ پروین چندر دوڑ کر آئے اور انھیں سہارا دینے لگے۔

'ہم مریں گے نہیں۔ ہمارے اوپر بڑی مہر ہے اوپر والے کی۔ ہاتھ پیر چلتے، کھاتے پیتے سدگتی کو پراپت ہوں گے۔ اری بیچ کوڑی۔ و بیچ کوڑیا۔'' انھوں نے اتنی زور سے پکارا کہ لوگ ان کی طاقت پر حیران رہ گئے۔ شربت ملیدے پان پھول سے سجا بڑا سا تھال لیے بیچ کوڑی مہری دوڑی چلی آئی۔

دادی اس کا ہاتھ تھامے پھاٹک سے برآمد ہوئیں تو تعزیے کے آگے ناچتے لڑکے یک لخت رک گئے اور سرعت سے ادھر اُدھر ہو کر دادی کے لیے راستہ بنایا۔

دادی نے ہاتھ جوڑ کر تعزیے کو پرنام کیا اور تعزیہ برداروں کو سارا سامان دلوا کر چراغِ سحری کی کانپتی لو کی طرح واپس گھر میں داخل ہوئیں۔

پروین چندر چھوٹے بھائی کو دیکھ کر مسکرائے۔ ''اماں جب تک زندہ ہیں۔ امام صاحب کا آشیرواد دیے بغیر تعزیہ واپس نہیں جائے گا اور جب تک آشیرواد ہے امن چین بھی ہے۔'' انھوں نے ہولے سے کہا۔

جاتے طبل کی گونجتی آواز پر دادی کی کراری آواز سپر امپوز ہوئی۔

''دیا باتی کی بیلا ہے۔ بہو روشنی جلا دو۔''

○○○

آدمی

باگمتی ایک بار پھر اُپھان پر تھی۔ یہ تو اس کا قاعدہ ہی تھا۔ برسات آئی نہیں کہ ٹیڑھی ہوئی بلکہ برسات شروع ہونے سے پہلے ہی جب ہمالیہ کی برف پگھل کر پانی چھوڑنا شروع کرتی، باگمتی ٹیڑھی ٹیڑھی چلنے لگتی تھی۔ اس کا غصہ اپنے ابتدائی دور میں بڑا خوبصورت ہوا کرتا تھا۔ پھر تو قہر ڈھاتی تھی قہر۔

باگمتی سے کچھ فاصلے پر پیڑوں کے گھنے جھرمٹ اور پھر پٹسن کے کھیتوں سے ذرا ہٹ کر وہ چھوٹی سی بستی تھی۔ وہاں باہر سے آئے لوگ اکثر خاموشی سے نیپال میں گھس جایا کرتے تھے، کبھی عام سی شاپنگ کے لیے، لیکن زیادہ تر اسمگلنگ اور اس سے بھی بڑی غیر قانونی حرکتوں کے لیے۔

نیپال کی سرحد شروع ہونے سے کچھ پہلے ہی عورتیں گھروں کے سامنے بیٹھی سوئٹر بنتی دکھائی دینے لگتی تھیں۔ رنگ برنگے اون کے گچھوں کو بانس کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت ٹوکریوں میں لیے (جنھیں وہ خود ہی بناتی تھیں) مشین کی طرح ہاتھ چلاتی رہتی تھیں۔ بیچ بیچ میں کھپریل یا چھپر کے غریبانہ گھر کے اندر جاتیں، چولھے پر کھدکتا بھات پساتیں یا کسی بچے کا پیشاب پاخانہ دھلاتیں اور پھر اطمینان سے باہر آ کر ہاتھ چلانے لگتیں۔ یہ سارے ہاتھ سے بنے سوئٹر بازار میں آ جایا کرتے تھے۔ موٹے، کھردرے، جن غریب ہاتھوں نے بنائے ہوتے لگ بھگ اسی طرح کے غریبوں کا جاڑا کٹوا دیا کرتے تھے۔ ان بستیوں میں چڑیوں کی طرح پھدکتے چھوٹے چھوٹے بچوں میں کچھ چپٹی ناک اور ترچھی آنکھوں والے بھی دکھائی دیتے تھے۔ سامان کے ساتھ

شاید لوگ نیپال سے عورتیں بھی اڑا لایا کرتے تھے یا کیا پتہ کچھ ڈھاکڑ عورتیں نیپال سے تھپے اڑا لاتی ہوں۔ بہرحال نیپال کی سرحد پر کہیں روک ٹوک تو تھی نہیں۔ کوسی بیلٹ میں تو کچھ مکانوں کا دروازہ ہندوستان میں اور پچھواڑہ نیپال میں کھلتا تھا اور جانوروں کے لئے تو کہیں کوئی سرحد ہوتی ہی نہیں ادھر سے گھر میں گھس کے ماریں یا ادھر سے گھر میں گھس آئیں۔ تو اس لئے کیسے پتہ چلتا کہ وہ اجگر کہیں ادھر سے آن نکلا تھا یا ادھر سے۔

لیکن وہ تھا ایک اجگر، باگمتی میں تیرتا ہوا آیا یا بالو میں سرسراتا ہوا، نسانوں واں پگڈنڈی سے گزرتا بگر وہ آیا تھا۔ سانپ ادھر بہت عام تھے بھی خاص طور پر برسات میں جب سبزہ گھنا ہوتا اور پیڑوں پر گرتی بارش کی پھواروں کے تار چھیڑتی، پوری فضا کو گنگنانے پر مجبور کرتی تو سانپ بھی زیادہ فعال ہو اٹھتے۔ سل سل کرتے جسموں سے ہری ہری گھاس پر لہرے بناتے تیزی سے ادھر اُدھر بھاگتے اکثر نظر آ جاتے تھے۔ ابھی ہیں، ابھی نہیں۔ عموماً لوگ انہیں مارتے نہیں تھے۔ گاؤں کے بزرگوں کا کہنا تھا کہ کسی زندہ شے کو مارنا نہیں ہے تاوقتیکہ اس سے نقصان نہ پہنچے۔ ہاں گوشت خور لوگ بیشک غذا کے لئے جانور ماریں، لیکن جب تک وہ زندہ ہیں ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اسی لئے گاؤں میں مرغیوں کو ایسے ڈربوں میں قطعی نہیں پالا جاتا تھا جس میں ان کا کھڑا رہنا تک دشوار ہو۔ تو وہ اجگر آن نکلا اور بالوٹھاکر کے گھر مرغیوں کے ڈربے میں گھس کر تین چار مرغیاں اور ایک بڑا مرغا ڈکار کر گول گول ہو کر وہیں پڑ گیا۔ ہر مرغی کی جگہ اس میں ایک بڑا سا کوبڑ نکل آیا تھا اور ڈربے کے تنگ دروازے سے اب اس کا نکلنا مشکل تھا۔ ویسے بھی اجگروں کو پیٹ بھر جانے کے بعد سونے کی عادت ہوتی ہے۔

بالوٹھاکر کا مرغیوں کا ڈربہ بہت بڑا تھا۔ لگ بھگ ایک چھوٹے کمرے جیسا۔ اس کا دروازہ خاص طور پر مضبوط تھا اس لئے کہ رات کو لومڑیاں بہت آتی تھیں اور بلیاں تو رات دیکھیں نہ دن، میاؤں میاؤں کرتی گھومتی پھرتی ہی رہتیں۔ نہ جانے کس نے جلے پیر کی بلی والا محاورہ ایجاد کیا۔ اب کیا جلے پیر کی بلی گھمسیا کی بلیوں سے بھی زیادہ اچکتی پھرتی ہو گی۔ تو ان سب سے حفاظت کا خیال رکھتے ہوئے ہی چمن چمن بڑھئی نے وہ ڈربہ بنایا تھا۔ اجگر گھسا تو غلطی چمن چمن کی نہیں بلکہ انڈے سمیٹنے کو گئی بالوٹھاکر کی بڑھی دادی کی تھی جن کے ہاتھ کانپتے تھے، سر ہلتا تھا اور

آنکھوں میں موتیا بند اتر چکا تھا۔ انہوں نے انڈے تو ٹٹول کر سارے سمیٹ لئے، لیکن ڈربے کے دروازے کی چٹخنی نہیں لگائی۔ ہوا کا جھونکا آیا تو دروازہ کھل گیا۔ رات کا وقت تھا، مرغیاں آرام سے پروں میں چونچ دیے بیٹھی رہیں کہ اجگر آئے اور انہیں نگلے۔

جب ہونی ہوتی ہے تو ایسا ہی کچھ ہوتا ہے۔ ہر طرح کی ہونی کے لئے ایسا ہی کچھ ہوتا ہے۔

صبح کو لوگوں نے دیکھا بچی ہوئی مرغیاں سہمی سکڑی کونے میں گھسی بیٹھی ہیں اور باقی حصے میں اجگر گول گول ہو کر پھیلا پڑا ہے، کسی بابو بلی کی طرح اور بالوٹھاکر کی گیارہ سالہ بیٹی دہیں دروازے کے پاس بیٹھی جالی کے چھیدوں میں سے انگلیاں ڈال ڈال کر اجگر میں یوں گڑا رہی ہے جیسے وہ اپنی ماں کے آٹا گوندھتے وقت پاس بیٹھ کر آٹے میں گڑاتی اور ڈانٹ کھاتی رہتی تھی۔

کمہار چچی سب سے پہلے تو اس ڈھیٹ بچی کو کھینچ کر الگ کیا گیا۔ پھر کلہاڑی لا کر بالو ٹھاکر نے اجگر کو کاٹ ڈالا۔ وہ کم بخت اس قدر ست ہو گیا تھا کہ اس نے کچھ مزاحمت بھی نہیں کی۔ کچھ عرصے بعد گاؤں کے ہی موچی، دلارے داس نے اس کی کھال کے چپل بنا دیے جنہیں بالوٹھاکر اور ان کی بیوی سٹکاتے پھرتے تھے۔

کاش کچھ لوگوں کو بھی کاٹ کر ان کی کھال کے چپل بنا دیے جاتے۔

یہ دو برسات پہلے کا واقعہ ہے۔ اس سے اگلی برسات میں گاؤں میں ایک تیندوا لاگو ہوا تھا۔ سب سے پہلے بھُل کے چھپر پر چڑھا ہوا دکھائی دیا۔ بھُل کی دو بھیڑیں حال میں ہی بیائی تھیں اور ننھے میمنے بڑے سے جھوے کے نیچے بند تھے۔

پو پھٹ رہی تھی، بادل برس کر کھل گئے تھے، ہوا نشہ بکھیرتی، لوگوں میں میٹھا میٹھا آلس بھرتی گھوم رہی تھی۔ درختوں کو بارش نے خوب دھو کر زمرد کا رنگ دے دیا تھا اور پتوں کی نوک سے پانی کی بوندیں ایسے ٹپکنی چھوڑ دی تھیں کہ بوندا باندی کا گمان ہوتا تھا لگتا تھا بارش ابھی تھمی نہیں ہے۔ ملگجے جھٹپٹے اندھیرے میں جب نہ اندھیرا پورا تھا نہ اجالا بھُل کا بیٹا چیخ اٹھا کہ تیندوا ایک میمنہ لے کر بھاگا ہے اور دوسرے کو بھی پنجہ مار کر زخمی کر دیا ہے۔ بھیڑ گم سم کھڑی تھی۔ اس دن سے علی الصبح رشا میدان جانے والی عورتوں نے اکیلے جانا بند کر دیا۔ وہ چار پانچ کے گروپ میں

جاتیں اور ایک موٹا ڈنڈا یا کلہاڑی سب سے مضبوط، جوان عورت کے ہاتھ میں تھما دی جاتی۔ تیندوے نے کئی چھوٹے موٹے جانور اور اٹھائے۔ انسانوں پر حملہ تو نہیں کیا، لیکن ایک دن شام کو چرنے والی ٹولی کی ایک عورت کو جو تھوڑی پیچھے رہ گئی تھی محسوس ہوا کہ کوئی اور بھی ہے جو اس کے پیچھے دبے پاؤں چلا آ رہا ہے۔ بالکل کسی چور کی طرح۔ ہوا میں ایک مہک ہے جو جانی پہچانی نہیں ہے، نہ پھولوں کی، نہ سبزے کی نہ گوبر کی، نہ گائے بھینس کی۔ جھاڑیاں یوں سرسرائی ہیں جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں جھاڑیوں کی رازداری نے جسم کے سارے روئیں کھڑے کر دئے ہیں۔ یہ کوئی سحر ہے کیا۔ کہیں پیچھے مڑ کر دیکھنے سے جسم پتھر کا نہ ہو جائے، لیکن یک بچی نے پیچھے مڑ کر دیکھ ہی لیا۔ یک لخت چیخ ماری اور ٹولی کو مبہوت چھوڑ کر بگٹٹ بھاگی۔ تیندوا اس غیر متوقع ردعمل سے گھبرا کر آناً فاناً گھنی جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

وہ ایک گھبرا جانے والا تیندوا تھا جب کہ کچھ تیندوے بالکل نہیں گھبراتے۔

پھر ایک ہاتھی بھی لوگوں کو دکھائی دیا۔ دکھائی کیا دیا اس نے نائی پنڈ تا ئن کی جھونپڑی کی پوال کی چھت اکھاڑ کر پھینک دی جو برسات کے پیش نظر حال ہی میں نئی ڈلوائی گئی تھی۔ پہلے تو لوگ سمجھے یہ کام آندھی کا ہے، لیکن آندھی تو آئی نہیں تھی۔ کیا بغیر آندھی آئے گھروں کی چھتیں یوں پلک جھپکتے اڑ جاتی ہیں کہ لوگ بارش میں بھیگیں، دھوپ سے تپیں اور سردی سے کانپتے جسموں کو گرمی پہنچانے کی ناکام کوشش کرتے رہ جائیں؟ شاید ہاں، شاید نہیں۔

تبھی معلوم ہوا کہ یہ ایک ہاتھی کا کام تھا جو گاؤں میں در آیا تھا اور اس نے کیلے کا باغ بھی اجاڑا تھا۔ لوگوں نے منصوبہ بنایا کہ ہاتھی کو گھیر کر اس کا ہانکا کیا جائے اور اسے واپس ترائی کے جنگلوں میں دھکیل دیا جائے، لیکن جب تک ایسا نہیں ہوتا تب تک تو خیال رکھنا پڑے گا۔ جانوروں کے منہ کو خون لگ گیا تو بڑی مشکل ہوگی۔ ان باتوں کو سننے والی ایک نوجوان لڑکی نے ہنس کر کہا، ہمیں اپنے بھائی کے سالے سے جتنا ڈر لگتا ہے اتنا نہ تیندوے سے لگتا ہے نہ ہاتھی سے۔

اس کی ماں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ''جو منہ میں آتا ہے بولے جاتی ہے۔ سمدھیانے کا بیٹا ہے۔''

لوگوں کو پتہ چلا کہ کیلے کا باغ اجاڑنے میں ہاتھی کا ہی نہیں بھالو کا بھی ہاتھ ہے اور بھالو تو بنی موجودگی ہاتھی سے پہلے ہی درج کرا چکا تھا جب اس نے نوٹی ساؤ کے کٹہل کے درخت سے

شہد کا چھتہ اتار کر سارا شہد چاٹ لیا تھا۔ نوٹی ساؤ بلاقی کا انتظار کر رہے تھے۔ چھتے میں شہد بھر چکا تھا، کسی جوان گدرائی ہوئی دوشیزہ کی طرح۔ بلاقی دھواں دے کر مکھیوں کو بھگانے اور شہد نکالنے میں ماہر تھا۔ جہاں چھتہ لگتا اسے بلایا جاتا۔ اس کے آنے سے بس ایک دن پہلے سرکنڈوں کی باڑھ پھلانگ کر ایک موٹا تازہ بھالو گھس آیا اور پیڑ پر چڑھ گیا۔ علی الصبح لوگوں نے دیکھا وہ مزے سے کٹہل کے ایک تومند گدتے سے ٹیک لگائے چھتہ توڑ کر شہد اڑا رہا ہے۔ غصے میں آئی مکھیاں اس کے چاروں طرف بھن بھن کرتی اڑ رہی تھیں بلکہ کاٹ بھی رہی تھیں۔ گھنے، کھردرے بالوں کی وجہ سے بھالو پر ان کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ بڑی شاہانہ بے پروائی سے وہ کبھی کبھی ایک ہاتھ ہلا دیتا اور بس۔ گھر والے خاموشی سے دروازہ بند کر کے اندر بیٹھے رہے۔ وحشی جانوروں کو نہ چھیڑنے میں ہی عافیت ہے۔ جی بھر کر شہد کھانے کے بعد وہ بڑے آرام سے پیڑ سے اترا اور ادھر ادھر دیکھا، ہوا کو سونگھا، اطمینان سے گھنے جنگلوں کے درمیان غائب ہو گیا۔

نوٹی ساؤ نے فوری طور پر کٹہل کا پھلدار درخت کٹوا دیا۔ انہیں ڈر تھا کہ بھالو پھر شہد کی تلاش میں ادھر آئے گا۔ نہیں تو پکے کٹہل کھانے کا لالچ تو ضرور اسے ادھر لا سکتا ہے۔

کٹہل تو کٹوایا جا سکتا ہے، لیکن گھر کی بیٹی کو کوئی کٹوا سکتا ہے کیا؟

وہ بھائی کے ساتھ اسکول پڑھنے جاتی تھی۔ چودہ برس کی سلونی لڑکی جس کے چہرے اور جسم پر نمک اترنے لگا تھا۔ ماں روز صبح ڈبے میں ان کا ٹفن ڈالتی۔ آم کا اچار اور آلو بھری روٹی۔ کبھی سادہ روٹی میں ذرا سا گھی چپڑ کر ساتھ کھانے کے لئے آنگن کی بیل سے اتارے کدو کی سوکھی سبزی۔ دونوں جڑواں تھے، لیکن لڑکا چھ روٹیوں سے کم نہیں کھاتا تھا جب کہ لڑکی تین سے زیادہ نہیں کھاتی تھی۔ اماں عام طور پر ڈبے میں دس روٹیاں ڈالتی تھی۔ لڑکی کا جی بھی چاہتا تو چوتھی روٹی کو ہاتھ نہ لگاتی، شاید بھائی کا پیٹ بھی نہ بھرا ہو۔ لڑکی جنتی تھی باپ رے کتنا کھاتا ہے تو اسے ڈانٹ پڑ جاتی۔ لڑکے کے حساب سے بہت کم کھاتا ہے، لڑکے کے شریر کو زیادہ غذا چاہئے۔ بڑے کہتے۔ جس دن گھر میں باپو نے مرغا مارا ہوتا یا تالاب سے مچھلی نکالی ہوتی اس دن بھی غذا کا تناسب یہی رہتا۔ مرغے یا مچھلی کے ساتھ بھات بنا کرتا تھا۔ بھائی کے لئے دو پلیٹ اس کے لئے ایک پلیٹ۔

اسکول جاتے وقت اماں ہمیشہ یاد دلاتی۔ ''کھانے کا ڈبہ خوب چھپا کے بیگ میں رکھنا۔ جانور بہت دور سے خوشبو سونگھ لیتے ہیں۔ پیچھے لگے چلے آئیں گے۔'' پہلے ڈبہ پولی تھین میں ڈالا جاتا، پھر اسے اسکول بیگ کے اندر چھپا کر رکھا جاتا۔ دو میل پیدل کا رستہ تھا۔ راستے میں ندی تھی جو گاتی گنگناتی، کئی کاٹ کر نکل جاتی۔ گرچہ یہ پہاڑی علاقہ نہیں تھا، لیکن ندی نشیب میں بہتی تھی اور راستے کا حصہ اونچا تھا۔ اُچھان پر ہوتی تو بھی کبھی اس راستے پر نہیں چڑھ دوڑی تھی۔ ہنستی تھی، نہیں بھائی، اس راستے پر اسکول ہے۔ بچوں کو نہیں پریشان کرنا۔ پھر بھی ماں باپ ذرا گھبراتے تھے۔ پانی تو پانی، اس کا سر پھرنے میں کیا دیر لگتی ہے، اس لئے جب خوش مزاج ہا گستی کو غصہ آتا تو وہ ذرا اس سے دور ہی دور رہنے کو کہتے۔ کہتے پانی پر نظر رکھنا۔ چڑھتا محسوس ہو تو واپس آجانا اور وہاں جانور دکھائی دے تو سر جھکا کے چپ چاپ نکل لینا۔ چھیڑا نہ جائے تو جانور نقصان نہیں پہنچاتے۔

رات بارش خوب ہوئی تھی۔ پورا راستہ دھلا ہوا تھا۔ پھل، پھول، جانور سب صاف ستھرے اور درخت ایسے سبز جیسے بارش نے انہیں رنگ دیا ہے۔ پانی تو رنگ دھو ڈالتا ہے، لیکن کنکھ نڈو کے پیڑوں کو چھو کر آنے والے بادلوں نے تو جیسے ہرا رنگ انڈیلا تھا۔ بھر بھر بالٹی، بھر بھر بالٹی۔ سورج بادلوں کے ساتھ مل کر شطرنجی سائے بنا رہا تھا۔ خواہ مخواہ دل چاہے کہ ناچو۔ اس لڑکی نے جس پر نسک اتر رہا تھا، بازو پھیلائے، سوں سوں کر کے مٹی کی مہک ناک میں بھری اور گھوم گھوم کر ناچنے لگی۔

''کیا کر رہی ہے؟'' بھائی چلایا۔ وہ اس سے آدھا گھنٹہ بڑا تھا۔ ماں کا کہنا تھا آدھا گھنٹہ چھوٹا بھی ہو تو بھائی تو بڑا ہی ٹھہرا۔ اس لئے وہ ضرورت سمجھتا تو ڈانٹ لیتا تھا۔

''دیکھ نہیں رہے، ناچ رہے ہیں، تم بھی ناچو۔''

''دیں گے ایک کنٹاپ، اسکول کو دیر ہو رہی۔ سوتنتر تا دوس، وہ کیا کہتے ہیں کہ چل رہا ہے ریہرسل۔''

''ہی ہی ہی۔'' اس کی ہنسی کا انداز چڑانے والا تھا ''کا ہے کی سوتنتر تا؟'' لیکن پھر وہ ناچتی تھرکتی لڑکی بھائی کے ساتھ گیلی اور کنکروں بھری پگڈنڈی پر سدھے ہوئے قدم بڑھاتی

اسکول کے لئے آگے بڑھ گئی۔

بالوٹھاکر، مقامی غلطیات استعمال کی جائیں تو ''لکھ لوڑھا پڑھ پتھر'' تھے یعنی جاہل مطلق۔ کسی نے ان کو دستخط کرنا سکھایا تھا۔ ہندی میں لکھا بالوٹھاکر۔ انہوں نے پنسل اٹھائی اور جیسے بچے ڈرائنگ بناتے ہیں اس طرح ان الفاظ کی نقل اتاری۔ کئی بار بالوٹھاکر میں گھس گیا یا ٹھاکر بالو پہ چڑھ دوڑا تو ربر سے مٹا مٹا کر اسے درست کیا۔ آخر کار انہیں یہ ڈرائنگ بنانی آگئی جسے غور سے دیکھا جائے تو ''بالوٹھاکر'' پڑھا جاسکتا تھا۔ جب مردم شماری کے وقت خواندگی کی شرح بھی متعین کی جانے لگی تو بالوٹھاکر کو دستخط کر لینے کے سبب خواندہ قرار دے کر اعداد و شمار میں ایک کا اضافہ کر لیا گیا، لیکن یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ خود اپنے دستخطوں کی ڈرائنگ بنانے والے بالوٹھاکر کے نزدیک تعلیم کی بڑی اہمیت تھی اور یہی نہیں ساری کی بیسوں اونچ نیچ کے باوجود انہیں اپنی بیٹی سے محبت تھی اور اسے بھی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ بھلے ہی دسویں کے بعد اس کا بیاہ کر دینے کا ارادہ تھا اور بیٹے کو شہر بھیج کر آگے پڑھانے کا، لیکن بہر حال اسے اپنی رسوئی کے چھپر تلے قیدی بنا کر قطعی نہیں رکھا تھا۔ اس لئے سرکاری اسکول میں بھائی کے ساتھ اس کا نام بھی لکھوایا تھا۔ گاؤں کے اسکولوں میں سواری۔ گاڑی کا تصور تو تھا نہیں، نہ ضرورت تھی۔ کنارے کنارے بہتی ندی اور دونوں طرف پیپل، برگد، پاکر، سیمل، املتاس اور نہ جانے کون کون سے چھتنار درختوں کے درمیان سے وہ پگڈنڈی چلتی چلی گئی تھی جس سے گزر کر گاؤں کے سارے بچے اسکول پہونچتے تھے پھر ناوؤں پر بیٹھ کر اُدھر اترنے والے گوالے جو شہر دودھ پہنچاتے تھے وہ بھی اس پگڈنڈی سے ہوتے ہوئے گھاٹ تک جاتے تھے۔ صبح صبح ان کے المونیم کے برتنوں کی کھنک چڑیوں کی چہچہاہٹ کے ساتھ مل کر قدرت کے آرکسٹرا میں ایک اور ساز شامل کرتی تھی، لیکن یہ گوالے بچوں سے پہلے نکلتے اور بچوں کے بہت بعد واپس لوٹتے۔

اسکول میں دو پختہ کمرے تھے۔ ایک چھوٹا سا آفس تھا اور بڑا سا حاطہ جس میں چھتنار برگد کھڑا تھا۔ ویسے کنارے کنارے اور بھی بہت سے پیڑ تھے اور جنگلی جھاڑیاں جن کے بیچ مور پھرتے پھرتے تھے ور اپنی صورت کے ٹھیک برعکس کرخت آواز میں چلاتے۔ ان کے انڈے چرانے کو لومڑیاں یوں دبے پاؤں چلتیں جیسے گرمیوں کی دوپہر میں گھر والوں کی آنکھ بچا کر باہر

بھاگ نکلنے والے شیطان بچے۔ کبھی کبھی جھاڑیوں سے ان کی موٹی، ملائم بالوں والی دم دکھائی دیتی جسے کھینچ کر بھاگنے کی حسرت بہت سے بچے دل میں پالتے رہتے تھے۔ مینائوں کے جھنڈ بھرا مار کے اڑتے، طوطے اتنا شور مچاتے کہ پہاڑہ پڑھتے بچوں کو اپنی ہی آواز نہ سنائی دیتی۔ بلبلیں گیت سناتیں، کبوتر غٹرغوں کر کے گھوم گھوم کر ناچتے اور کبوتریوں کو رجھاتے۔

تو ان سب کے درمیان دو پختہ کمرے تھے اور ایک لق ودق لیکن سرسبز احاطہ۔ ساٹھ پینسٹھ طالب علموں کے نام درج تھے۔ روزانہ حاضری مڈ ڈے میل سے پہلے بیس بائیس اور مڈ ڈے میل کے دوران لگ بھگ چالیس ہوتی تھی جو کھانا ختم ہونے کے بعد پھر اور بجلی تعداد کو پہنچ جاتی۔ جو بچے شروع سے آخر تک رہتے اور باقاعدگی سے آتے یہ ان گھروں کے بچے تھے جو تعلیم کے بارے میں سنجیدہ تھے۔ آج کل حاضری بڑھ گئی تھی۔ پندرہ اگست کے لئے اسپورٹس کے مقابلے کی پریکٹس ہو رہی تھی۔ ایک آدھ ڈرامہ بھی کھیلا جانا تھا۔ جو بچے ان سرگرمیوں میں حصہ رہے تھے، انہیں مڈ ڈے میل کے علاوہ ایک تکونی پڑیا میں گڑ چنا ملتا تھا جس کے بیچ سے کبھی کبھی دو عدد ٹافیاں بھی نمودار ہوتی تھیں اور بچے خوش ہو کر کہتے تھے ''آج چاکلیٹ اور ملا'' اسپورٹس میں انہیں مزہ آتا تھا۔ پھر پندرہ اگست کو جھنڈا لہرایا جاتا تھا جس کے بعد دونے میں مٹھائی اور نمکین کی معقول مقدار رہتی تھی۔ لڑکیاں صرف جن گن من اور دو ایک دیش بھگتی گیتوں میں شامل تھیں۔ لڑکے اسپورٹس کے لئے دیر تک رکتے تھے۔

''جا تو گھر جا۔'' آدھا گھنٹہ بڑے بھائی نے بہن سے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

''ہم کچھ دیر رک لیں تو حرج کیا ہے۔'' بہن نے جواب دیا۔

نا، نا، تو جا۔ لڑکا کودتا پھاندتا برگد کے نیچے چلا گیا جہاں پی۔ ٹی ٹیچر تھے۔ لڑکی بیٹھی رہی۔

''بڑی ڈھیٹ ہے۔'' کوئی دو گھنٹے بعد لڑکا آیا تو اس نے قدرے ناراضگی کے ساتھ کہا۔ ڈھیٹ نہیں، ڈرپوک، لڑکی نے دل میں کہا۔ ادھر وہ پہلے ہی چلی جاتی تھی۔ ساتھ میں دو چار لڑکیاں رہتی تھیں، لیکن کچھ آگے جا کے سیدھی پگڈنڈی میں ایک شاخ پھوٹتی تھی جو جنگلی جھاڑیوں کے اندر اندر دوسری طرف نکل جاتی تھی۔ وہ لڑکیاں گاؤں کے اس حصے سے آتی تھیں۔ کوئی دو فرلانگ کا راستہ لڑکی کو تنہا طے کرنا ہوتا تھا۔ پچھلے دو تین دن سے اس نے محسوس کیا تھا جیسے کوئی اس

کی نگرانی کر رہا ہے۔ دو آنکھیں جو اس کو دیکھتی تھیں، دو پیر جو اس کے پیچھے پیچھے کسی سائے کی طرح چلتے تھے۔ کچھ سانسیں جو ہوا پر تیر کر اس کی گردن پر ٹھہر جاتی تھیں۔ ضرور کوئی تیندوا ہے۔ تیندووں کے بارے میں سنا تھا کہ وہ بڑے صبر سے جانوروں یا انسانوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ تیندوے ہی کیوں، کتے اور لکڑبگھے بھی اور بھوت؟ نہ جانے کتنے پیپل کے درختوں پر چڑیلیں بسیرا کرتی تھیں۔ وہ سانس روک کر کچھ عورتوں کے پیر دیکھتی، لیکن عورتیں اس پگڈنڈی پر شاذونادر ہی آتی تھیں۔ تو کیا ہوا، چڑیلیں تو ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ سرسراتی ہوئی اوپر اوپر پہنچ جاتی ہیں۔

چل، اب تو اٹھ۔ لڑکی نے خوشی خوشی بستہ سنبھالا۔ بھائی ساتھ ہوتا تو اسے کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ وہ اس کا بڑا بھائی تھا۔ دونوں نے کاندھوں پر بستے لٹکائے اور ہاتھ میں ہاتھ دیئے چل پڑے۔ کچھ دور تک کچھ لڑکے اور بھی چلے۔ پھر یہ دونوں ہی رہ گئے۔ اگست کا آسمان کچھ گہرے رنگ کا ہو چلا تھا۔ لڑکے نے بستے میں رکھے چھاتے کو چھو کر اطمینان کیا۔

اچانک لڑکی کو ایسا ہی محسوس ہوا جیسے پچھلے دو تین دنوں سے محسوس ہو رہا تھا۔ کوئی ہے، کہیں کوئی تو ہے۔ اس نے بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی دھن میں سیٹی بجاتا چل رہا تھا۔ چھاتا ٹٹولتے ہوئے اس کا ہاتھ بہن کے ہاتھ سے الگ ہو گیا تھا۔

گھاس سرسرائی۔ سانپ ہے کیا؟ پیڑوں کی قطار کے درمیان کوئی سایہ سا رینگا۔

''بھیا، سانپ''۔

لڑکے نے چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔

''نہیں تو، جلدی جلدی پیر بڑھا۔ بارش آنے کو ہے۔''

اب کسی کی سانسیں اس کی گردن پر رینگیں، اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ''بھیا'' اس نے چیخنا چاہا، لیکن آواز نہیں نکلی، قدم جیسے پتھر ہو گئے۔ بھائی دو چار قدم اور آگے ہو گیا تھا۔ سارا کچھ چشم زدن میں ہو گیا۔ لڑکی یکایک پلٹی اور اس نے زور کی چیخ ماری۔ یہ کسی کے پلٹ کر چیخ مارنے سے بھاگ جانے والا تیندوا نہیں تھا۔ اس نے لڑکی کے سبک جسم کو بجلی کی سی تیزی سے دبوچا اور بائیں مڑ کر گھنے سبزے میں غائب ہو گیا۔ چلتے چلتے اس نے چیخ سے متوجہ ہو جانے اور

پیچھے دوڑ پڑنے والے بھائی کو ٹنگڑی ماری تھی جو منہ کے بل گر پڑا تھا اور لڑکی اس کی مضبوط گرفت میں یوں کلبلا رہی تھی جیسے سارس کی لمبی چونچ میں آئی ہوئی چھوٹی سی مچھلی۔

گھنے درختوں کے بیچ الجھی بیلوں نے ایک منڈوہ سا بنا رکھا تھا۔ اس کے آس پاس کی گھاس اور بڑے پیڑوں کی جھک آئی ڈالیاں ہاتھی نے صاف کردی تھیں۔ وہیں بھالو اور اجگر کے ساتھ بیٹھا وہ آج کامیابی کی توقع کے ساتھ تیندوے کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر سارس کی لمبی چونچ میں کلبلاتی چھوٹی مچھلی کی طرح شانوں پر لڑکی کو لادے وہ نمودار ہوا۔ تینوں نے مسرت بھری چیخیں ماریں۔ اچانک بڑی بڑی بوندوں نے جنگل کو آلیا۔ لڑکا حواس بحال کر کے اٹھا اور چوٹوں کی پرواہ کر کے چھاتا اور بیگ پھینک کر ناک کی سیدھ میں دوڑ پڑا۔ کہیں لڑکھڑایا، کہیں جھاڑیوں سے ٹکرایا، لیکن دوڑتا رہا اور گھر پہنچ کر ہی دم لیا۔ ہاں اس کی چیخیں تب بھی جاری رہیں۔

''تیندوا لے گیا، تیندوا لے گیا۔''

لوگ لاٹھی، ڈنڈا، پھاوڑا، کدال لے کر دوڑے۔ کالے بجنگ، لانبے اور مضبوط مسیح کی دیوار سے ایک زنگ آلود تلوار لٹکی رہتی تھی وہ اسے ہی لے کر بھاگا۔

لڑکی نے لرزتی ہوئی پلکیں کھولیں۔ اجگر اپنے بل اس کے گرد کس رہا تھا اور اسے سانس گھٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ بھالو نے دانت نپور رکھے تھے۔ وہ ایک ایسی ہنسی ہنس رہا تھا جو غلاظت میں سنی ہوئی تھی۔

''تم ہم'' لڑکی کے سارے خوف پر حیرت نے غالب آکر اسے آواز عطا کی۔ ''تم تو گجیندر بھیا کے سالے ہو۔''

''ہاں اور اب تمہارا بھائی ہمارا سالا ہے۔ ہم چاروں کا۔'' بھالو نے سرد لہجے میں جواب دیا اور اسے شہد کے چھتے کی طرح نچوڑ کر رکھ دیا۔

کچھ دیر بعد تیندوے نے پنجہ مارا تو اس کی کچی مٹی کی صراحی جیسی گردن ٹپ سے ٹوٹ گئی۔ گردن کے ساتھ وہ لڑکی بھی رنگ جس کے چہرے سے ہوتا ہوا جسم پر اترنے لگا تھا اور جو محض چودہ برس کی تھی۔ تبھی تو تیندوا اپنی کھردری زبان سے اسے چاٹ گیا تھا۔

ہاتھی ناراض ہو کر چنگھاڑا ''ارے یہ تو مر گئی۔''

''مرتا تو تھا۔ یہ گجیندر بھیا کے سالے ویسی ہی تو تھی۔''

''تمہارے کیا بچا ساتھ والے تینوں اس سے پیچھا چھڑا رہے تھے۔''

''ہاں بہت نازک سی گڑیا تھی، بچی بھی ایک سانس باقی معلوم ہوتی ہے۔ [illegible] ہے۔'' اس سے قبل کہ وہ سانس بھی ختم ہو، ہاتھی نے اسے سونڈ میں لپیٹ لیا، پھر چند قدم دور کالی مٹی کے [illegible] کی طرح اچھال کر اس گڈھے میں پھینک دیا جو انہیں بنانے کے لئے مٹی کاٹے جانے کے سبب گہرا ہوتا جا رہا تھا اور جس میں جولائی اگست کی بارش نے گدلا پانی بھر دیا تھا۔

دوسرے دن صبح پانی کی لاش ابھر آئی تھی۔

''تم نے تیندوا دیکھا تھا؟'' پولیس والوں نے بھائی سے پوچھا۔

''صاف تو نہیں دیکھ سکے تھے، ایک سایہ جیسا تھا، بس چیخی تھی اور تب ہی ہم منہ کے بل گر پڑے تھے۔''

''تیندوا نہیں۔ یہ تو آدمی معلوم ہوتے ہیں۔''

''کتنے آدمی؟''

''[illegible]''

اس ساری کارروائی کے بعد تیسرے دن لڑکی کا جسم بستی کے شعلوں سے چاٹا اور لوٹ کر [illegible] ''ہم نے اسے صرف جانوروں سے ہی نہیں سادھو جان کیا تھا۔''

○○○

ریلنگ پر بیٹھی فاختہ

مرزا صاحب نے اپنی بڑی سی بالکونی پر چڑیوں کے لیے نہایت عمدہ انتظام کر رکھا تھا۔ ایک مٹی کے کونڈے میں صاف پانی بھرا رہتا تھا۔ پھر ایک اور مٹی کے بڑے سے مستطیل گملے میں بھر بھری مٹی ڈلوادی تھی۔ چڑیاں مٹی میں نہانا بہت پسند کرتی ہیں۔ یہ گملا خاصا لمبا اور کوئی دس انچ چوڑا تھا۔ گوریاں اور فاختائیں اس میں پھڑ پھڑ کر کے لوٹتیں۔ کبھی کبھی بینا بھی لوٹ لگالیتی۔ اس گملے میں ان کی مرحومہ بیوی پودینہ لگا کر رکھتی تھیں۔ سارے سال ہرا بھرا رہتا۔ ان کے جانے کے بعد دھیرے دھیرے خشک گھاس جیسا ہو گیا۔ تب اسے اُکھڑوا کر اس میں چڑیوں کے لیے مٹی کے غسل (mud bath) کا انتظام کر دیا۔ ایک بڑے سے چینی کے پیالے میں، جو مہمانوں کے آنے پر زیادہ سالن نکالنے کے کام آتا تھا، کاکن رکھی جانے لگی۔ امیرو بوا جو آ کے کھانا پکا جاتی تھیں، پیالہ دیکھ کر لالچ کرنے لگیں۔ ''بھیا ای تو ہمیں کا دے دیجے۔'' مرزا صاحب خاموشی سے اٹھے، الماری کھکھوڑی اور ایک پورا ڈنر سیٹ نکال کر بوا کے سامنے رکھ دیا۔ ''لیجیے یہ لے جایئے۔'' بوا ان کا منھ تکنے لگیں۔

''لے جاؤ بوا۔ میں اکیلا آدمی، کتنے برتن استعمال کروں گا۔''

''بٹیا، دلہن بی بی۔ ۔'' وہ ہکلائیں۔

''کوئی نہ لے جائے گا یہ چیزیں۔ سب ہمارے بعد پڑی رہیں گی۔'' وہ چڑیوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

فلیٹ کشادہ تھا۔ اسی لحاظ سے ایک بڑی اور دو چھوٹی چھوٹی بالکونیاں تھیں۔ بڑی

بالکونی میاں بیوی کے بیڈ روم سے ملحق تھی۔ بیوی کو پھول پتوں اور پودوں کا بہت شوق تھا۔ سبزیوں تک کے پودے گملوں میں اگا رکھے تھے لیکن ہاں قریب کے کمرے سے ملحق چھوٹی بالکونی میں انھوں نے ایک بہت بڑے گملے میں منی پلانٹ کا صرف ایک پودا لگایا تھا۔ وہ موس اسٹک (moss stick) پر چڑھ کر اتنا گھنا اور اونچا ہو گیا تھا کہ اس میں چھپ کر بلبل نے گھونسلا بنایا اور بچے نکالے۔ بیوی بہت خوش ہوئیں۔ کسی کو ادھر جانے نہ دیتیں کہ بلبل ڈر نہ جائے۔ نگرانی رکھتیں کہ انڈے بچے چیل کوؤں کی دسترس سے بچے رہیں۔ بچے خیریت سے بڑے ہو کر اڑ گئے تو اور زیادہ خوش ہوئیں۔ ان کے انتقال کے بعد اپنے بچے جو اڑ گئے تھے، کچھ روز کو گھر واپس آئے۔ سوگوار ماحول میں بھی رونق رہی۔ پھر سب اپنے اپنے مستقر کو روانہ ہو گئے۔ مرزا صاحب بالکل تنہا۔

یہ وہی تنہائی تھی جس سے وہ کچھ دنوں سے خائف رہنے لگے تھے۔ بیوی ستر کے اوپر جا رہی تھیں۔ وہ خود پچہتر پار کرنے ہی والے تھے۔ میاں بیوی اس عمر کو پہنچ جائیں تو ایک دوسرے کی موت کا خوف ستانے لگتا ہے۔ بیوی بڑی اچھی بلی تھیں۔ اس عمر میں بھی جسم چھریرا تھا۔ کہیں کوئی خم بھی نہیں آیا تھا۔ چہرہ پُر رونق، نہایت سگھڑ گرہستن۔ یوں تو بیوی کیسی بھی ہو، بڑھاپے میں بڑی کارآمد ہو جاتی ہے۔ مرزا بے حد اداس رہنے لگے۔

ادھر اس کرونا نام کی آفت نے زندگی مزید دوبھر کر دی۔ لاک ڈاؤن کا اعلان ہوا تو پارک تک میں نکلنا بند ہو گیا۔ وہاں ان کی عمر کے کئی احباب اکٹھا ہو کر گپ شپ کرتے، ٹہلتے، یوں دو تین گھنٹے نکل جایا کرتے تھے۔ مرزا کو کتابوں سے شغف نہیں تھا۔ بس اخبار پڑھ لیا کرتے تھے۔ ٹی۔ وی کون دیکھے۔ کم بخت ٹی۔ وی والے کسی بھی اِشو کو پکڑ کر ہفتوں اسے مٹھائی سے چینٹے رہتے ہیں۔ کبھی جی نہیں بھرتا۔ مسلمانوں کا مسئلہ ہوا تو دو چار کرایے کے مولانا لے آئے۔ کچھ احمق ایسے آ گئے جنھیں نہ دین کی خبر نہ دنیا کی، پھر بھی ہر موضوع پر بولنے کو تیار۔ مرزا نے ٹی۔ وی کھولنا ہی بند کر دیا۔ بیوی تھیں تو کبھی کبھار کھل بھی جایا کرتا تھا۔

انھوں نے پودوں کی طرف توجہ کی۔ کچھ بالکل لانبے اور از حد دبلے ہو گئے تھے جیسے ہمارے دیہی مزدور جو طویل مسافتیں طے کر کر کے پیدل گھر واپس آ رہے تھے۔ کچھ بالکل خشک

ہو چکے تھے۔ کچھ ذہین قسم کے ایسے بھی تھے جو زندہ تو تھے لیکن بے رونق۔ مرزا نے یو۔ٹیوب دیکھ دیکھ کر باغبانی کی معلومات فراہم کیں۔ ہفتہ بھر کی محنت کے بعد رفتہ رفتہ ٹیریس گارڈن کی رونق بحال ہوگئی۔ انھیں محسوس ہوا کہ مصروفیت اور سرسبز پودوں سے ملی مسرت نے ان کا ڈپریشن خاصی حد تک کم کر دیا ہے۔

یہ چھوٹا سا باغیچہ بحال ہوا تو چڑیاں، بھنورے، تتلیاں، سبھی آنے لگے۔ خاص طور سے وہ لوازمات مہیا کرا دینے پر جو چڑیوں کو یہاں آنے پر مائل کرتے۔ گوریاں جو تقریباً ناپید ہوگئی تھیں، دو۔دو، چار۔چار کر کے آنے لگیں۔ مٹی میں پھر پھر کر کے نہاتیں تو بڑی پیاری لگتیں۔ فاختہ کا ایک جوڑا آتا۔ ریلنگ پر بیٹھ کر بلبل چہچہاتی۔ مینائیں بھی چکر مار جاتیں۔ بس طوطے نالائق تھے۔ دور سے ٹیں ٹیں کرتے نکل جایا کرتے تھے۔ بس اپنے حلوے مانڈے سے کام۔ کسی اور سے کوئی مطلب نہیں تھا۔

ایک مشکل تھی۔ بلبل کاکن نہیں کھاتی تھی اور مینا بھی۔ میرو بوا نے بتایا کہ جب اس نے بچے نکالے تھے تو ان کا کھانا باہر سے لے کے آتی تھی۔ خود بھی کھا آتی ہوگی، لیکن کہاں؟ کیا چڑیوں کے ہوٹل میں؟

مرزا کو بیٹھے بیٹھے ہنسی آ گئی۔ بچوں کی طرح وہ چڑیوں کی ایک دنیا اور اس دنیا میں ہوٹل کے تصور سے محظوظ ہو رہے تھے۔ امیرو بوا اتفاق سے پاس ہی تھیں۔ انھوں نے میاں کی گہری مسکراہٹ محسوس کی اور اپنی آنکھیں پونچھیں۔ ضرور میاں کو بی بی کی کوئی اچھی، میٹھی سی بات یاد آ گئی ہے۔

پھر امیرو بوا نے ہی بتایا کہ جب بی بی نے محسوس کیا کہ کچھ چڑیاں کاکن نہیں کھاتی ہیں تو وہ ان کے لیے پیالے میں ڈبل روٹی یا رات کی روٹی خوب باریک توڑ کر بھگو دیتی تھیں۔ ملائی جیسی ہو جاتی۔ بلبل اسے شوق سے کھاتی اور مینا بھی۔ ایک سوگوار سی مسکراہٹ مرزا کے ہونٹوں پر پھر کھیل گئی۔ اسپیشل ڈش۔ چڑیوں کا ہوٹل تو یہیں ہے۔ انھوں نے بوا سے کہا کہ وہ ایک اور کٹوری ڈھونڈ کر لا لیں۔ پھر اپنے ہاتھ سے ڈبل روٹی توڑ کر پانی میں بھگوئی اور کاکن کی بغل میں پیالہ رکھ دیا۔

واقعی اب مینائیں اور بلبلیں بھی کھانا کھانے لگیں۔ پانی پینے تو آتی ہی تھیں۔ مرزا کا جی خوش ہو گیا۔ وہ کوئی اخبار اٹھا کر کرسی اس طرح ڈال کر کمرے میں بیٹھتے کہ بالکونی کا پورا منظر

سامنے رہتا اور چڑیوں سے واسطہ بھی بنا رہتا۔ کبھی صبح، کبھی شام [illegible] دھوپ سے لطف اندوز ہوتے۔ پھر انھیں چڑیوں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوتا گیا۔ [illegible] میں بھی [illegible] پہچانتے جب کہ ان میں یہ فرق بہت واضح ہوتا ہے۔ [illegible] انھیں ایک بار خیال آیا کہ انسان فطرت سے کتنی دور چلا گیا ہے۔ [illegible] آج کے مصنوعی ذرائع میں اس نے انھیں [illegible] نقصان کس کا ہو رہا ہے۔

چڑیاں بے حد چوکنی رہا کرتی تھیں۔ دانہ چگتے یا بھیگی روٹی کھاتے وقت بھی وہ اس قدر ہوشیار رہتیں کہ پتا بھی کھڑکتا تو پھر سے اڑ جاتیں۔ کبھی کبھی یہ بھی معلوم ہوتا کہ [illegible] امیرو بوا نے بتایا کہ اوپر منڈلاتی چیل [illegible] انھیں خطرے کا احساس ہو جاتا ہے۔ زندگی --- زندگی کتنی عزیز شے ہے۔ ان ننھی منھی جھری جانوں کو بھی [illegible] زندگی ہے دشمن سے عافیت ہے تو زندگی ہے۔

مرزا کو ایک دن چڑیوں کا شور کچھ غیر معمولی محسوس ہوا۔ آوازوں میں چہکار نہیں بلکہ جوش تھا اور شاید [illegible] غصہ بھی۔ انھوں نے قدرے قریب جا کر غور کیا۔ [illegible] گوریاں آ گئی تھیں اور تین فاختائیں بھی تھیں۔ گوریاں [illegible] چونچیں چلا رہی تھیں۔ [illegible] پہلے دونوں نے کافی مقابلہ کیا پھر ہار [illegible] شروع کیا۔ فاختائیں آگے بڑھیں تو [illegible] فاختاؤں پر چونچیں چلانے میں الگ [illegible] گوریاں بھی شامل ہو گئیں۔ [illegible] ریلنگ پر جا بیٹھیں۔ [illegible]

[illegible] کرتے تھے۔

[illegible]

''جی بھیا'' وہ دوڑی ہوئی آئیں۔

''کاکن ختم ہوگئی کیا؟''

''ڈبا ہاں ہو جیسے بھیا۔''

''تو یہاں کیوں نہیں ہے۔ یہاں لاکے ڈالو۔''

''ڈلے رہیں بھیا۔ سیرے سیرے کبوتر آ آ کے کھائے گئیں۔ چڑیَن کا بھگائے دوسن۔''

ہاں کبوتر بھی آنے لگے تھے۔ بستیاں وہیں بسا کرتی ہیں جہاں دانے پانی کا ٹھکانا ہو۔ بھیگی ڈبل روٹی دیکھ کر ایک دن کوؤں کا جوڑا بھی اُتر آیا۔ جب تک صرف کاکن رہی وہ نہیں آتے تھے۔ اڑتے اڑاتے ایک آدھ چونچ پانی میں بے شک مار جاتے۔ لیکن اب برابر آنے لگے تھے۔ مرزا سخت نالاں ہوئے۔ پھر سوچا کہ چلو برداشت کرلو آخر انسانوں میں بھی تو بہت سے لوگوں کو مجبوراً برداشت کرنا پڑتا ہے، ان کی ذات خواہ کتنی بھی باعث کوفت کیوں نہ ہو۔ آخر میں کوے تو قدرت کے صفائی کرمچاری ہیں۔ کہیں گدھوں کی طرح یہ بھی غائب ہونے لگے تو فضا کی آلودگی اور بڑھ جائے گی۔

لیکن پھر ہوا یہ کہ مینا جو اکثر بلبل کو ڈرا کر بھگا دیا کرتی تھی خود ڈر کر بھاگنے لگی۔ ایک دن کوؤں نے اسے دوڑا کر بھگا دیا تھا۔ اب وہ جب ہی آتی جب کوے نہ ہوں۔ اس کے بعد کچھ بچتا تو بلبل کے حصے میں آتا۔ کوؤں کا پیٹ تو سود خوروں اور رشوت خوروں کی طرح کبھی بھرتا ہی نہیں تھا۔

ادھر بلبلوں کی آر جار بڑھ گئی تھی۔ صبح صبح آکر چہچہاتیں اور فلیٹ کو رونق سے بھر دیتیں۔ مرزا نے دیکھا دو بلبلیں اکثر چونچ میں تنکا لے کر آتی ہیں۔ کئی بار بالکونی سے باہر بھی کسی چڑیا کو چونچ میں تنکا دبا کر اڑتے دیکھا تھا۔ بہت ہی پیاری لگی تھی۔ حتیٰ کہ ایک بار ایک کوے کو دیکھا کہ چونچ میں ذرا موٹی، خشک ٹہنی لے کر اُڑا جا رہا تھا۔ وہ بھی برا نہ لگا۔ کوؤں کی آواز کرخت نہ ہو اور گندگی نہ کھاتے ہوں تو وہ اتنے بدصورت نہیں لگیں۔ بڑے سڈول، چمکیلے جسم ہوتے ہیں ان کے لیکن مشکل یہ ہے کہ کچھ لوگ گندگی نہ کھائیں تو دوسروں کے لیے صفائی کہاں سے ہو۔

یہ ان امیدوں والے خوش خبری سنائی۔ ''جو چھوٹی انڈا ... ہیں۔'' مرزا نے جو ابھی محسوس کیا تھا کہ بلبل تھوڑی بالکونی سے ... دیوان ... ٹھٹھی رہتی ہے۔ انڈے جانے پر ... کی بھی کمی ہی نہیں۔

وہ نے مزید معلومات فراہم کیں ''آج دیکھے ہیں بیالے میں ... انڈے رکھے ہیں۔''

''اب کو اتنا تک زیادہ مت جھانکئے۔ بلبل ڈر جائے گی۔''

''جب وہ ادھر ادھر ہوتی ہیں تبھی ہم جھانک لیتے ہیں۔''

جو بلبل کے بارے میں صیغہ جمع استعمال کرکے بڑے احترام سے بات کرتی تھیں، مرزا وہیں آ گئی۔ لیکن ... جھانکنے سے منع کرنے والے مرزا ایک روز خود تجسس پر قابو نہیں رکھ سکے۔ اندازہ کیا کہ وہ اس وقت نہیں ہیں، کہیں گئی ہوئی ہیں تو انھوں نے پنجے بل ہو کر اندر جھانکا ... ۔ وہ بہت خوش ہوئے تھے۔ بڑی نفاست سے بنائے گئے ڈول، پیالہ نما گھونسلے میں تین چھوٹے چھوٹے کالی مائل بھورے رنگ کے انڈے رکھے ہوئے تھے۔ بڑے ہی پیارے لگتے ہوئے۔ ان کے پیچھے ہٹتے ہی انڈوں پر بیٹھی بلبل پھدک کر الگ ہوگئی تھی لیکن وہ چھوڑ کر گئی نہیں۔ مرزا تیزی سے ہٹ گئے، بلبل اسی تیزی سے واپس انڈوں پر آن بیٹھی۔ یہ پورا واقعہ چشم زدن میں ہوگیا۔ بس کوئی منٹ بھر سے بھی کم میں۔ نہ جانے کتنے واقعات یونہی چشم زدن میں ہوجاتے ہیں۔ کسی کی موت، فسادات، لینڈ سلائڈ، ریپ، ڈکیتی اور انسان سوچتا رہ جاتا ہے ارے یہ کیا ہوا، یہ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا۔ لیکن بلبل کے ساتھ ابھی کچھ برا نہیں ہوا تھا۔ مرزا صاحب تو ان کے دوست تھے، اور ان کی اہلیہ۔ وہ تو چڑیوں سے کہتی تھیں ---- ''جا میری ...'' ... کسی۔ اس وقت وہ زیادہ دھیان بھی نہیں دیتے تھے اور بیوی کو جذباتی احمق سمجھا کرتے تھے۔ لیکن اس وقت وہ خود ہی جذباتی احمق بن گئے تھے۔ بلبل تو انڈوں پر بیٹھی رہتی ہے اسے ... ملتا ہوگا۔ وہ متفکر ہوگئے۔ امید والے نے تسلی دی کہ بلبل کا مرد اس کے لیے کھانا پہنچاتا ہوگا۔ ... فکر نہ کریں۔ آخر یہ جو لاکھوں چڑیاں اڑتی پھرتی ہیں یہ انڈے سے ہی تو نکل کر آتی ہیں۔ جب بچے نکل آتے ہیں تو مرد، مادہ دونوں مل کر کھلاتے ہیں۔

کوئی پندرہ دن بعد بچے نکل آئے۔ بلبلیں آتیں اور بھیگی ڈبل روٹی لے جاتیں۔

کوے ہوتے تو صبر سے انتظار کرتیں۔ آج مرزا نے ایک چالاکی کی کہ ڈبل روٹی رکھی ہی نہیں۔ زیادہ مقدار کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کوؤں کے پیٹ بہت بڑے تھے اور پھر کبوتر۔ کوے آئے، پانی پی کر چلے گئے۔ دس بجے کے بعد مرزا نے کٹوری رکھی۔ بلبل اُتری لیکن اس کے اُترتے ہی جانے کہاں تاک میں بیٹھے ہوئے کوے بندوق کی گولی کی طرح برآمد ہوئے اور بلبل کو ڈرا کر بھگا دیا۔ کبوتر بھی آ گئے تھے۔ لیکن شاید بلبل اس دن بچوں کے لیے کہیں اور سے بھی کچھ نہیں لا سکی تھی اور خود بھی بھوکی تھی۔ اسے محسوس ہوا کچھ ہمت دکھانی ہی ہوگی ورنہ بچے مر جائیں گے۔ وہ بڑی تیزی سے دونوں خوف ناک کوؤں کے بیچ سے گزری اور اتنی ہی سرعت سے چونچ بھر کر بھیگی ملائم روٹی لے کر منی پلانٹ کی طرف اُڑ گئی۔ کوؤں نے گردن ٹیڑھی کر کے خوں خوار نظروں سے اس کی طرف دیکھا، کبوتر بھی کچھ جز بز ہوئے۔ اچھا چلو لے لو تم بھی تھوڑا بہت۔ 'لائنز شیئر' (lion's share) تو ہمارا ہی رہے گا۔ بچوں کو بس منٹ بھر میں کھلا کر کامیابی پر نازاں بلبل پھر اُتری۔ ذرا دور دور تھی اور موقع تلاش کر رہی تھی۔ کوؤں نے ارادہ بھانپ لیا اور اس بار اسے دور تک دوڑا دیا۔ کوے اس وقت تک تین چوتھائی روٹی صاف کر چکے تھے۔ دو مینائیں آ کر ان سے اُلجھ گئیں۔ وہ نسبتاً بے خوف چڑیاں تھیں۔ دراصل ان کی بے خوفی ہی ان کا ہتھیار تھی ورنہ ڈیل ڈول تو فاختہ کا بھی ویسا ہی تھا۔ بلکہ قدرے بڑا۔ امیرو بوا انھیں پنڈوک کہا کرتی تھیں۔ وہ زیادہ تر ریلنگ پر بیٹھی ٹکو کی رہتیں۔ ان کے کو کنے پر کسی کو اعتراض نہیں تھا۔

گاندھی جس دور میں جیے وہ دور ایسا تھا کہ اہنسا کا اصول کام آ گیا۔ اب اہنسا کے پیروکار ڈرپوک کہلاتے ہیں یا مجبور۔ درواقعی زیادہ تر صورتوں میں ایسا ہی ہوتا بھی ہے۔

کوے چلے جاتے اور کبوتر اور مینائیں بھی کھا لیتیں تب فاختہ نیچے اُترتی اور گوریاں بھی آ جاتیں۔ اگر کبوتروں سے کا کن بچی ہوتی تو کھاتیں ورنہ صبر شکر کر کے پانی پی کر کبھی اور چلی جایا کرتیں۔ کبھی مرزا کو خیال آ جاتا تو وہ بڑے پرندوں کے چلے جانے کے بعد تھوڑی کا کن اور رکھ دیتے۔ اس 'ڈونیشن' سے ان کا پیٹ بھر جاتا لیکن یہ ہر روز نہیں ہوتا تھا۔ آخر مرزا بھی ہر وقت چڑیوں لیے بیٹھے تھوڑے ہی رہتے تھے۔

بلبل اس دن بڑے غلط وقت پر آئی اور ایک ماں کے لیے غلط صحیح کیا، مر بھکے چوزے

ہر وقت چونچ پھیلائے رہتے اور بلبل کے جاتے ہی ہر چوزہ اپنی بساط کے مطابق پہلے کھانا چھیننا چاہتا۔ تین میں سے ایک کچھ کمزور تھا۔ اسے دھکا دے کر دو مضبوط چوزے ہمیشہ پیچھے کر دیتے۔ وہ کمزور ہوتا جا رہا تھا اور باقی دونوں اور زیادہ مضبوط۔ دو دن پہلے کی کامیابی کے خمار نے بلکہ یوں کہیں کہ مستانے بلبل کی عقل سب کر لی۔ اس نے ایک کوے کے سر پر منڈلا کر اسے ایک چونچ رسید کر دی۔ بلبل کی چونچ سے کوے کو چوٹ تو کیا ہی لگی ہوگی، بس شدید توہین کا احساس ضرور ہوا۔ بلبل کی یہ مجال۔ وہ غضب ناک ہو کر اس کے پیچھے دوڑا۔ بلبل کسی طرح جان بچا کر بھاگ گئی۔ کوا بھی پلٹ آیا۔ اچھا تمھیں سبق سکھانے کی ضرورت ہے اس نے سوچا۔ یوں نہ مانو گی۔ اب کی آؤ تو۔

دوسرے دن چھوٹی بالکونی صاف کرنے کے لیے گئی امیرو بوا نے زور سے پکارا۔

"اے بھیا، تنی ادھر آؤ تو..." ان کی آواز میں واضح الارم تھا۔ مرزا تیزی سے دوڑے۔ کیا ہوا ہوا۔ برتیا نے کاٹ کھایا کیا۔ وہ ناک پہ انگلی رکھے کھڑی تھیں۔ بلبل کا گھونسلا اُجڑا ہوا تھا۔ دو بچے غائب تھے، ایک نیچے مرا پڑا ہوا تھا۔ دونوں بلبلیں شاید جان بچا کے بھاگ گئی تھیں۔

بڑی بالکونی کی ریلنگ پر بیٹھی فاختائیں کو کے جا رہی تھیں۔

OOO

ترقی کی راہ پر گامزن ایک شہر

وہ قصبہ نما شہر قصبہ نما نہ رہ کر خالص شہر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ سچ پوچھیے تو ابھی پوری طرح نہیں ہوا تھا۔ معاملہ ذرا الجھا ہوا تھا۔ کہیں کہیں تو لگتا تھا ساری پرانی چیزیں، پرانے لوگ غائب ہو گئے تھے اور کبھی اچانک لگنے لگتا تھا کہ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ سب ویسا کا ویسا ہی ہے، مگر پھر بھی ہو تو بہت کچھ رہا تھا اور بہت کچھ ہو چکا تھا۔

اب دیکھیے پہلے کبھی سول لائنز کا علاقہ چھوڑ کر باقی کہیں سے بھی کوئی کار گزرتی تو گلی محلے کے لونڈے اور کتے دونوں اس کے پیچھے لگ لیتے۔ لونڈے تو لونڈے، اچھے بھلے لوگ بھی ایک بار تو منہ کھول کے ضرور دیکھ لیتے اور کہتے، ڈی ایس پی صاحب جا رہے ہیں یا ارے باپ رے یہ تو کلکٹر صاحب کی موٹر ہے۔ ایک دن لوگوں نے گردن گھما گھما کے دیکھ کے کہا کہ انجینئر صاحب جا رہے ہیں، ان کے معائنے کے بعد بجلی کے کھمبے گڑنا شروع ہو جائیں گے اور شہر میں بجلی آجائے گی۔ بس دیوالی اور پندرہ اگست کے موقعے کے لیے مٹی کے دیے رہ جائیں گے جو چھجوں اور منڈیروں پر جگمگ کرتے ہیں۔ اب ان کا بدل بجلی تھوڑے ہی ہو سکتی ہے (مگر صاحب اب تو ہو گئی تھی۔ دیوالی پر چینی قمقمے جلنے لگے تھے۔ رہا پندرہ اگست تو اب کوئی سرے سے چراغاں ہی نہیں کرتا تھا۔ جھنڈا لہرانے، جھنڈا اینچنے اور کچھ تقریریں سننے سے کام چل جاتا تھا۔ لوگ آزادی کے عادی ہو گئے تھے، ہر طرح کی آزادی کے۔ اور یہ شہر بھی ترقی کی راہ پر گامزن تھا)

تو صاحب بجلی آگئی۔ اسٹیشن، سرکاری ہسپتال، افسروں کے بنگلوں اور پھر سڑکوں سے ہوتے ہوئے متمول لوگوں کے گھروں میں پہنچی، اور اب تو تعوذ باللہ، شہر میں سب کے یہاں جل رہی تھی، میٹر نہیں لگا تو کٹیا لگا کر کھینچ لی جاتی تھی۔

بجلی آئی تو سڑکوں پر سرِ شام کھمبوں پر لگے لیمپ روشن کرنے والا ننھا معروف جو معروف کم ننھا زیادہ تھا، بے روزگار ہو گیا اور اس نے ٹھیلے پر موسمی پھل لگانے شروع کیے۔ میونسپلٹی نے نہ اسے کوئی معاوضہ دیا نہ کوئی اور روزگار۔ اب ننھے کو مرے کئی برس ہو چکے ہیں۔ اس کے لڑکوں نے پھل فروشی وراثت کے طور پر اختیار کر لی ہے۔ ایک پوتا ذرا زیادہ تیز نکلا تھا، اس نے ٹھیلے کی بجائے زراعت شروع کی۔ شہر کے ساتھ ننھے معروف کا کنبہ بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہوا۔

لطیف عرف لطیفو نانائی عرف نوا کے گھر کے سامنے بنے کنویں کی جگت کو لالہ بشیشر ناتھ نے پختہ کرا دیا تھا۔ کنویں کا نصف حصہ نوا کے اوسارے میں تھا اور نصف سڑک پر آ جاتا تھا۔ پختہ کرا دینے سے ایک اونچا چبوترا بن گیا تھا۔ یہاں سے سارے محلے والے پانی لیتے تھے۔ مسلمان شرفا کے گھر پَن بھرے پانی پہنچاتے تھے اور ہندو شرفا کے یہاں کہار یہ کام کرتے تھے۔ عوام الناس اپنی راکھ سے چمکائی ہانڈیاں خود لے کر آتے تھے۔ آبادی زیادہ نہیں تھی اور زندگی بڑی السائی، نیندی سی چلا کرتی تھی اس لیے پانی لینے والوں کی قطار اتنی لمبی نہیں ہوتی تھی کہ لڑائی جھگڑے اور تو تکار کی نوبت آتی رہا کرے۔ رفتہ رفتہ کچھ محلوں میں ہینڈ پمپ بھی نمودار ہونے لگے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ان کے لگنے کے بعد کنوؤں کا پانی کھارا ہو گیا تھا۔ ترقی ہوتی تو بڑی میٹھی ہے لیکن کچھ چیزوں کو کھارا کرتی چلی جاتی ہے۔ اب بھی اتنی قیمت تو چکانی ہی پڑے گی۔

نوا والے کنویں پر رونق خوب ہوا کرتی تھی۔ اس محلے میں ہینڈ پمپ بہت بعد میں آیا تھا۔ رونق لگانے میں موٹے تھلتھلے، عموماً صرف ایک دھوتی میں ملبوس پنا کے ابا کا بڑا ہاتھ تھا۔ ان کی صورت اور نام دونوں سے ان کے مذہب کا پتہ لگانا مشکل تھا۔ کوئی دھوتی کھینچ دیتا تو معلوم ہو جاتا کہ وہ مسلمان ہیں لیکن عام حالات میں کسی کے مذہب کا پتہ لگانے کے لیے اسی کسی مذموم حرکت کی ضرورت قطعی نہیں ہوتی اور یوں تو محلے میں لوگوں کو تو یہ تک پتہ رہتا تھا کہ کس کے گھر دال گھی سے بگھاری گئی اور کس کے گھر تیل سے۔ لوگوں کی دلچسپیوں کے محور بھی تیزی سے بدلتے

رہتے تھے۔ ان دنوں ملک کی سیاست کو استحکام حاصل تھا لیکن محلے کی سیاست آج کی سیاست کی
طرح جلدی جلدی بدلا کرتی تھی۔

پنا کے ابا دھوتی تلے جو بھی ہوں، صبح صبح پیٹ بھر کے ڈکاریں لیتے بالٹی سنبھالے کنویں
کی جگت کے نیچے کھڑے اپنی باری کا انتظار کرتے۔ اگر دیر لگتی نظر آتی تو بے صبر ہو کر بول پڑتے،
''ارے ہالی ہالی پانی بھرو۔ ہم سویرے سے پھو کھائے نا ہیں ہیں۔ پانی لے جائیں تو بوڑھا کچھو
بناویں۔'' تبھی کوئی لقمہ دیتا، ''چاچا ہم تو دیکھے رہیں۔ بھنسارے تہارے کھٹیا پہ ڈالے ساگ
روٹی کھات رہیو۔'' دوسرا اس کی تصدیق کرتا، ''ہمہو دیکھے رہیں۔ چار چار روٹین پہ بھر کٹورا
ساگ۔ اب کون ساگ رہا پالک کہ ناری...''

پنا کے ابا غصے سے اکھڑ جاتے۔ ''سرو تمہار اماں بہنا کے دہن رہیں ساگ روٹی۔
ارے ہمار بوڑھا تو ابہین اٹوے سانٹ رہیں جون ہم چلے آئے پانی لیوے۔''

بالٹی رکھ کے وہ لونڈے کی طرف گھور کے دیکھتے تو قہقہے بلند ہوتے۔ روز کوئی نہ کوئی
مسالہ ضرور مل جاتا تھا انھیں چڑھانے کا لیکن تھے بڑے بے ضرر انسان۔ کبھی کبھار بیوی کو کوٹ
ضرور دیا کرتے تھے لیکن آخر بڑی محبت سے 'ہمار بوڑھا' کہہ کر اسی کا ذکر بھی تو کرتے تھے اور پانی
لانے اسے کبھی کنویں پر بھی نہیں بھیجتے تھے۔ ہمیشہ خود لے جاتے۔

شہر ترقی کی راہ پر گامزن ہوا تو کنویں کی جگت توڑ کر اسے بھر دیا گیا۔ اس کی جگہ میونسپلٹی
والوں نے ہینڈ پمپ لگا دیا۔ محلے کے لوگ اب بھی وہاں آتے لیکن فرق یہ تھا کہ ہینڈ پمپ میں
پانی مقررہ وقت پر ہی آتا تھا۔ اس لیے لوگوں کو ان اوقات میں ہی پانی لے لینا ہوتا تھا۔ بحث اور
جھگڑے شروع ہو گئے جو کبھی کبھی طول بھی پکڑ لیتے۔ کچھ عرصے بعد مزید ترقی ہوئی تو ہینڈ پمپ
میں پانی آنا لگ بھگ بند ہو گیا۔ لوگوں کو کوئی خاص افسوس نہیں ہوا اس لیے کہ اب تقریباً سبھی
گھروں میں نل لگ گئے تھے۔ بے شک وہ لگے بندھے وقت پر پانی دیتے۔ اس لیے پانی کی
وقت اب بھی تھی۔ کسی وقت پانی غچہ بھی دے جاتا تھا۔

شہر جب قصبہ زیادہ اور شہر کم تھا تب اس میں چھوٹے سے سرکاری اسپتال کے علاوہ دو
ڈاکٹر تھے اور دو ہی حکیم اور ایک ہومیوپیتھ جن سے اوّل الذکر دونوں صاحبان بہت چڑتے تھے

اس لیے کہ وہ ایک ریٹائرڈ پوسٹ مین تھے جو ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ کتابیں پڑھ کر ایک پرچون کی
دوکان کے اوسارے میں تین ٹانگوں والی میز اور ایک اسٹول رکھ کر 'کلینک' کھول کر بیٹھ گئے
تھے۔ اب فرض کیجیے کوئی کھانسی زکام کی شکایت لے کر گیا تو ایک شیشی گولیاں دے کر ساتھ میں
ہدایت دیتے۔ ''پان کے پتے پہ کڑوا تیل لگائے کے گرم کر دا ور گلا پہ رکھ کر رومال سے باندھ
لیو۔ اکیلے گولی سے پھ نہ ہوسے۔'' ان کے علاوہ ایک چشمے والے، ایک ریٹائرڈ سرکاری
کمپاؤنڈر، مشن والوں کی ایک تربیت یافتہ مڈ وائف مارتھا، ایک غیر تربیت یافتہ لیکن نہایت تجربہ
کار دائی اور ان گنت اوجھا۔ سیانے، پیر۔فقیر بھی تھے جن میں سے زیادہ تر نہایت ڈراؤنی
صورت والے تھے بلکہ ان کے علاج کے طریقے بھی اکثر خوف ناک ہی ہوا کرتے تھے۔ شہر،
مضافات اور بھیڑیوں کے بھٹ جیسے دور افتادہ گاؤوں کی طبی ضروریات ان سب سے پوری
ہو جاتی تھیں۔ لوگ مر جاتے تو اسے اللہ/بھگوان کی مرضی مان کر صبر کر لیا کرتے تھے معالج سے
انھیں کوئی شکایت نہیں ہوتی تھی۔ ڈاکٹروں کے پیٹے جانے جیسا کوئی واقعہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ لوگوں
نے تنی ترقی بھی نہیں کی تھی۔ ہاں آنکھوں کا معاملہ ہی ایسا تھا کہ لوگوں کو فیض آباد یا سیتا پور جانا
پڑتا۔ تیسرے کے لوگ لوٹتے تو چشمے والے ان کا چشمہ بنا دیا کرتے تھے۔ زیادہ تر غریب غربا تو
نمبر بھی انھیں سے لے لیتے تھے جو وہ مختلف شیشے آنکھ پر رکھ رکھ کے طے کر دیا کرتے تھے۔ سال
میں ایک بار جاڑوں کے موسم میں موتیا بند کے آپریشن کا کیمپ لگتا تھا۔ ایک ہفتے بھرتی رہنا پڑتا تھا
اور کہیں جو کھانسی آ گئی تو روشنی غائب۔ اب اللہ جانے کھانسی ور آنکھ میں کیا تعلق تھا۔ لیکن
بے چارے، بڈھے بھی بڑے صابر ہوا کرتے تھے۔ ٹھیا لیے کھٹ کھٹ کرکے چلتے، کسی سے کوئی
شکوہ نہ کرتے۔ کرم کا پھل، بھوگ کا کھیل۔ اس سے تھوڑی لڑا جا سکتا ہے۔

پنا کے ابا کی طرح چشمے والے کا نام بھی شاید ہی کوئی جانتا تھا۔ وہ چشمے والے تھے اور
بس۔ ویسے محلے میں جو درا اندازی ہوتی ہے اس کے تحت اتنا سب جانتے تھے کہ وہ باجن
(برہمن) ہیں۔ ان کی عزت ان کی ذات اور ان کی افادیت دونوں کی مرہون منت تھی لیکن محلے
کے حرام زادے لونڈوں کی کون کہے وہ ایسے ایسے خرافات کھیل کھیلا کرتے تھے وہ بھی بیچ سڑک
پہ۔ علاوہ پٹھو، کھو کھو، کبڈی، گلی ڈنڈا، کوڑا جمال شاہی وغیرہ وغیرہ کے ایک کھیل یہ بھی تھا کہ وہ

صف باندھے کھڑے ہوتے اور سُر تال میں کہتے

آٹھ بجون کرڑ کا تیل؛ بلّی نے ہگا ڈھائی سیر
ڈھائی سیر میں کیا ہوگا، پنڈت جی کے بیاہ ہوگا

یہ کھیل عموماً اس وقت کھیلا جاتا جب چشمے والے یا کوئی اور شریف صورت، شریف صفت انسان جاتا دکھائی دیتا۔ آس پاس کے سنجیدہ لوگ مسکراہٹ دبا دبا کے لونڈوں کو تنبیہ کرتے لیکن انھیں پتہ تھا کہ نہ کوئی ان کی بکواس کی طرف توجہ دیتا ہے نہ برا مانتا ہے۔ ان کی اپنی تفنن طبع کے لیے شام پڑے اسی طرح کی خرافات سنائی دیتی تھی کہ اس وقت سب سے بڑی خرافات یعنی موبائل کا ظہور نہیں ہوا تھا۔ چشمے والے سر جھکائے اپنا لکڑی کا بکسا بغل میں دبائے گزر جایا کرتے تھے۔ بس ایک بار شاید گھر سے ہی کچھ خفگی لیے ہوئے نکلے تھے کہ یہاں ٹھکوا گئے۔ ' ارے تمہارا ماں کے بیوہ نا ہیں بھوا ہے ابھی تلک۔ پہیلے او کرا کے تو بیاہ کرا دیو۔ پوتے بھر ماں ہوئی جائے۔ (پاؤ بھر میں ہی ہو جائے گا)

مصری لال کے یہاں ریڈی ایٹر کا کام ہوتا تھا۔ وہاں دو موٹر گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں اور ڈرائیور کام کرا رہے تھے۔ وہ زور سے ہنس پڑے۔ ''آج پنڈت جی گسیا گئیں'' مصری نے مسکرا کے کہا پھر ایک بڑی سی لوہے کی چھڑ لڑکوں کی طرف یوں لہرائی جیسے اسی سے ماریں گے۔ لڑکے کھلکھلا کے ہنسے۔ ''ٹھہرو بیٹا۔ ایہن سکھن کے بد اس بھرتے ہیں'' لڑکے اور زور سے ہنسے۔

چشمے والے کچھ عرصے بعد اللہ یا (گمان غالب ہے کہ) بھگوان کو پیارے ہو گئے۔ لونڈوں کا کھیل پھر بھی جاری رہا۔ پنڈت جی تو اور بہت سے بھی تھے یا کم زکم لگتے تھے۔ ہاں چشمے والے کا بیٹا باقاعدہ چشمہ بنانے کی تربیت لے کر آیا اور اس نے ایک دوکان کھول لی۔ دوکان کے سائن بورڈ پر ایک مشہور ایکٹرس کا معنک اور مسکراتا ہوا چہرہ تھا۔ بھیڑیے کے بھٹ جیسے گاؤں تو اب بھی تھے وہاں کے لوگ آتے تو سمجھتے کہ کبھی اس ایکٹرس نے یہاں آ کر چشمہ بنوایا تھا اور خوب مرعوب ہوتے۔ اب تربیت یافتہ چشمہ بنانے والے کے علاوہ دو ماہر امراض چشم بھی آ گئے تھے۔

قصبہ نما شہر تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہی کیوں سبھی طرح کے ڈاکٹروں کی ایک پوری ٹولی پیدا ہو گئی تھی۔ اب ڈاکٹر رام چرن داس گرگ بی۔ایس سی، ایم بی بی ایس (الٰہ آباد) اور ڈاکٹر آشیش کھرجی بی۔ایس سی، ایم بی بی ایس (کنگ جارج لکھنؤ) کے لال کمپیروالی شیشیوں کا مکسچر پی کر (جن پر خوراک کے نشان لگے ہوتے تھے) اب کوئی اچھا نہیں ہوتا تھا۔ پہلے کلینک قائم ہوئے، پھر ایک نرسنگ ہوم کھلا اور اس کے ساتھ ہی دو جانچ گھر۔ ان میں مریضوں کو ٹھگا جاتا اور وہ بخوشی ٹھگے جانے کے لیے تیار رہتے۔ ''اب کھون پیساب کی جانچ نہیں ہوگی تو بیماری کا پتہ کیسے چلے گا۔'' معمولی جاڑا بخار کے لیے خون، پیشاب، تھوک، چھاتی کا ایکسرے سب لکھ دیا جاتا۔ جانچ گھر والے بڑی ایمان داری سے ڈاکٹروں کا کٹ انھیں دے جاتے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ طبی سہولیات بہت بہتر ہو گئی تھیں۔ زچہ بچہ اموات کی شرح میں بے شک کوئی کمی نہیں آئی تھی اور فیملی پلاننگ کا تصور بھی ابھی قبول عام کی سند نہیں حاصل کر سکا تھا۔ پھر بھی کچھ تھا جو بہت بہتر تھا اور آئندہ مزید ترقی کا ضامن بھی۔ مثلاً ہوٹل۔ مثلاً کچھ کارخانے۔ مثلاً دو سکول اور ایک کالج۔ سب پرائیویٹ۔

ہوٹل کھلے تو تین چار ہی تھے لیکن ان کی اولادیں بہت سی تھیں۔ مثلاً ڈھابے اور چائے خانے۔ شہر میں بہت سے چٹے سر والے بزرگ موجود تھے جنھیں اپنے بچپن کے کچھ لوگ یاد تھے جو نیلے رنگ کے وردی نما کپڑے پہنے ہوئے آتے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں چائے کا بڑا سا برتن ہوتا تھا جس کے نیچے انگیٹھی فٹ ہوتی تھی۔ ٹونٹی والے اس برتن میں دودھ شکر ملی بڑی خوش رنگ چائے ہوا کرتی تھی۔ ایک لڑکا بید کی ٹوکری میں کلھڑ لیے ساتھ ساتھ چلتا، تین چار لوگوں کی یہ ٹیم گھر گھر جا کر مفت چائے بانٹا کرتی تھی۔ کچھ تجسس، کچھ مفت آیا مال ہاتھ لگنے کو غنیمت سمجھنا، کچھ ہندوستانیوں کی مفت خوری کی جبلی عادت کے تحت زیادہ تر لوگ یہ مشروب خوشی سے قبول کر لیا کرتے تھے۔ جاڑوں میں گرم مشروب ویسے بھی اچھا لگتا ہے لیکن چائے کو عام بنانے والوں نے گرمی کا انتظام بھی کر لیا تھا اور اس طرح کے نعرے جگہ جگہ دیواروں پر نمودار ہو گئے تھے کہ گرمیوں میں گرم چائے پہنچاتی ہے ٹھنڈک۔ (ایک جگہ تو یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ گرمی میں

گرم چائے ٹھنڈ پہنچاتی ہے ڈک۔ یہ شفیق الرحمٰن نے دیکھا تھا) خیر گرمی میں چائے ٹھنڈک پہنچائے نہ پہنچائے، رفتہ رفتہ یہ لوگوں کی عادت بننے لگی جس میں گرمی سردی کی قید نہ رہی اور ایک نئی کلچر وجود میں آ گیا۔ یہ صارف کلچر کا خاص فارمولہ بھی ہے۔ پہلے عادت ڈالو پھر سامان مارکیٹ میں لے آؤ۔ سستا شروع کرو، مہنگا کرتے جاؤ۔ ایک بار عادت لگ گئی تو کوئی چھوڑنے والا نہیں۔ عادت سہولت کی ہو یا کھانے کی۔ مگر ہاں چائے بسکٹ میں ایک بات تو ہے: بڑا غریب نواز کھانا ہے۔ اب دیکھو نا غریب تو اب بھی بہت تھے لیکن ایسے گھر شاذ و نادر ہی ملتے جہاں لوگ کھائے بغیر سو گئے ہوں۔ موسہروں نے موس اور سیار کھوّے نو غنوں نے سیار کھانا بند کر دیا تھا۔ اتنا کمانے لگے تھے کہ گھٹنے ہوئے گیہوں کے میدے اور ڈالڈا یا چربی ڈال کر بنائے گئے موٹے بسکٹ اور چائے کے سستے ناشتے سے پیٹ بھر لیا کریں۔ یہ گیان تنک داس عرف تنکو نے دیا تھا جس کا کہنا تھا کہ اس کے دادا کے وقت تک گھر میں مری کھائی گئی تھی لیکن تنکو کے باپ نے نہیں کھائی تھی اور باپ کی اولادوں میں سے لوگوں نے صرف مری کھانے کا ذکر سنا تھا، کھائی کسی نے نہیں تھی بلکہ اس کے ذکر پر کسی بھی نارمل انسان کی طرح انھیں بھی گھن آنے لگتی تھی۔ کوئی مرا ہوا، تقریباً سڑا جانور کھا کیسے سکتا ہے۔ ہاں کھال اتارنا دوسری بات ہے۔ یہ تو پیشہ ہے۔ ویسے بھی کھال اتارنا، کھال کمانا مَیلا ڈھوئے سے تو بہتر ہے۔

تنکو کی ایک دُور کی رشتہ دار چاچی کے ایک محلے میں میلا ڈھونے کا کام کرتی تھی ویسے شہر میں جتنے بھی یہ کام کرنے والے تھے، وہ کہیں نہ کہیں آپس میں رشتہ دار ہوتے تھے تنکو ان چند مردوں میں تھا جو گلی محلوں کے نکڑ پر بیٹھ کر جوتے گانٹھتے اور پالش بھی کر دیا کرتے تھے۔ لوگ ان کے پاس رک کر لاپروائی سے پیر بڑھاتے یا اخبار میں لپیٹا جوتا تھپ سے گراتے جس کی مرمت کرنی ہوتی تھی لیکن تنکو کی وہ رشتہ دار جسے وہ جمنا کاکی کہا کرتا تھا، کمر پہ مَیلے کا ٹوکرا رکھے، چٹی کا ڈھاٹا باندھے، لہنگا چھڑکاتی، گلٹ کی چھنچھریں بجاتی تنکو کے پاس سے گزرتی تو وہ کسی اضطراری ردعمل کے طور پر ذرا سا سمٹ جاتا اور سانس روک لیتا تھا۔ پھر بھی وہ تنکو کی طرف مسکراہٹ پھینکنا نہ بھولتی جو تنکو کو زہر لگا کرتی تھی۔ اس زہر بھری مسکراہٹ والی کا کام اب ختم ہو گیا تھا اس لیے کہ کم از کم شہر کے اندر اب سروس لیٹرین نہیں رہ گئے تھے اور گاؤں دیہات میں تو پہلے بھی بیت الخلا

نہیں تھے اور اب بھی نہیں تھے اور آنے والے طویل عرصے تک نہیں ہونے والے تھے۔ لوگ کھیتوں میں فراغت حاصل کرتے یا کہیں بھی چلے جاتے۔ بوڑھی جمنا اب جھونپڑی میں بیٹھ کر بن بنی رہتی تھی اور اس کی بہو رام کلی لڑکیوں کے اسکول میں صفائی کرمچاری بحال ہو گئی تھی۔ شام کو ایک بڑے گھر میں جھاڑو بہارو بھی کر آتی۔ اس کا بیٹا سکول میں پڑھنے جاتا تھا۔

شہر صرف ترقی کی طرف گامزن ہی نہیں تھا آگے بڑھنے کے عمل میں مضافات کو نگلتا بھی جا رہا تھا۔ پہلے بس کوئی میل۔ دو میل چل کر تمباکو کے کھیت ہوا کرتے تھے۔ پھر کچھ دور اندر جا کر کھاد بنانے کا کارخانہ اور چمرٹولی ہوا کرتی تھی۔ چمرٹولی کو بعد میں گاندھی جی کے اصرار پر ہریجن بستی کہا جانے لگا تھا۔ اب وہ ہریجن بستی کے مرحلے سے بھی گزر گئی تھی اور دلت بستی کہلاتی تھی لیکن بہت سے لوگ جو پرانی اقدار میں یقین رکھتے تھے اسے چمرٹولی ہی کہنے پر مصر تھے۔ ان کی لفظیات میں چوری چماری جیسے روزمرہ بھی برقرار رہ گئے تھے گرچہ اب لفظ چمار اہانت انگیز قرار دے دیا گیا تھا اور کسی کو چمار کہنے پر قانونی کارروائی ہو سکتی تھی۔ خیر تو شہر رینگ رینگ کر بہت سے کھیتوں، تالابوں اور چھوٹی موٹی بستیوں کو ہضم کرتا چمرٹولی، عرف ہریجن بستی، حال دلت بستی تک پہنچ گیا۔ کھاد کا کارخانہ بھی اس کی زد سے باہر رہا۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ دلت بستی کے کچھ لوگ اب بھی کھائیں نہ کھائیں، مرے جانور اٹھا ضرور لے جاتے تھے کہ یہ کام انھیں کا تھا۔ وہ انھیں چھیل چھال کر چمڑا نکالنے کے بعد ڈھانچہ کارخانے کے سپرد کر دیتے۔ دونوں چیزوں سے انھیں کچھ آمدنی ہو جایا کرتی تھی جو ان کے عام محنت، مزدوری کے کام کے علاوہ ہوتی تھی۔ شہر نے ان دونوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ دھیرے دھیرے کھیت باغ، آبادی چھدری ہوتے ہوتے سولہ سو پچاس ایکڑ سرکاری زمین تھی جس میں چھ سو پچاس ایکڑ کو چراگاہ قرار دے دیا گیا تھا۔ اس میں سے دھیرے دھیرے تقریباً چھ سو ایکڑ زمین پر دلت بستی والوں نے قبضہ کر کے سخت محنت کی اور اس پر کھیتی کرنے لگے۔ یہ سب بہت ہی سست رفتاری سے خاصے طویل عرصے پر محیط ہو کر ہوا تھا لیکن اب کھیتوں کو لہلہاتے ہوئے بھی کافی زمانہ ہو چکا تھا۔ دلت خاصے بہتر ہونے لگے تھے۔ ان کے لڑکے پڑھنے جا رہے تھے۔ عورتیں کھیتوں میں کام کرتیں اور شام کو تعلیم بالغان سنٹر کے چکر بھی لگاتیں۔ شہر کے متوازی ایک قصبہ نما ابھرنے لگا تھا۔ اب کھیتوں کے بغل میں نیم پختہ

مکان بھی بن رہے تھے۔

کئی بار ناجائز قبضہ ہٹانے کی بات ہوئی تو مقامی ایم ایل اے نے رسوخ کا استعمال کر کے اسے دبا دیا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ آیا ہوا بلڈوزر لوٹ گیا۔ اب یہ کیسے ہوا یہ تو اہل سیاست جانیں۔ لوگوں نے یہ ضرور دیکھا کہ اس کے سامنے کچھ سیاہ فام چمکتے جسموں والے کم عمر لڑکے اور ناک کی کیل گھماتی، چنّی سر پر درست کرتی لڑکیاں آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ کاغذی کارروائی پوری کرنے اور پچویشن کی شکایت درج کرانے کے بہانے ایڈمنسٹریشن غائب ہو گیا۔ دلت ہی نہیں، مہادلت۔ بھڑوں کا چھتہ۔ معاملہ فوراً دھماکہ خیز ہو جائے گا۔ کیا پتہ کچھ مارکاٹ ہو جائے۔

مجسٹریٹ صاحب گھر آ کر بیوی کو دن کی ساری روداد سنایا کرتے تھے۔ یہ بھی سنائی۔ وہ نہایت لاپروائی سے بولیں رے دو چار چمار پاسی تو ہر جگہ روزی کنشار رہتا ہے۔ یہاں بھی کسی دن کٹ جائے گا۔ پھر ملازم کو آواز لگائی۔ صاحب بیٹھ چکے ہیں، گرم پھلکا لاؤ جلدی۔ صاحب سنجیدگی سے بولے۔ ”یہ علاقہ نسبتاً پُرسکون ہے۔ پُرسکون ہی رہے۔ ایک دو بھی کٹ گئے تو مصیبت تو ہماری بھی ہوگی۔“ ”کسی کی مصیبت ہوئی کیا؟“ بیوی اسی لاپروائی سے بولیں۔ ”دلت کٹیں۔ اقلیت کٹے۔ ٹرانسفر ہو جائے گا اور کیا۔“ پھر جلدی سے بولیں۔ ”بھاگل پور سے رویدی کا ٹرانسفر تو راجیو گاندھی بھی نہ کرا سکے۔ پولیٹکل پیروی چاہیے۔“

”خاموش رہا کرو۔“ صاحب قدرے برافروختہ ہو کر بولے۔ ”عورتوں کو ہر معاملے میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے۔“

شہر کٹی کاٹ کاٹ کے مضافات اور پھر گاؤں کے حصے نگلتا رہا اور وہ بستی سرکاری زمین نگلتی رہی۔ اب مشکل یہ ہے کہ جس کو جہاں نگلنے کی اوقات مل جاتی ہے وہ ہر اس چیز کو نگل جاتا ہے جو اس کے مصرف کی ہو۔ اور کبھی کبھی تو بے مصرف بھی لیکن زمین سے زیادہ مستحکم اور مصرف کی چیز قضا و قدر نے بنائی ہی نہیں اس لیے زمین کے اور دعوے دار بھی پیدا ہونے لگے کہ وہ وسیع و عریض قطعہ بستی گرنگا تھا۔ ایک پیر صاحب جو اب تک نہ جانے کہاں سوئے پڑے تھے، اچانک صدیوں کی نیند کے بعد جاگ پڑے اور ایک خاں صاحب کے خواب میں نمودار ہوئے

کہ ان کی قبر بنوا کے ان کی روح کو سکون دیا جائے۔ ایک بابو صاحب کے یہاں کچھ پشتینی کاغذات برآمد ہوئے جن کے مطابق اس زمین کے ایک ٹکڑے پر ان کے باپ دادا کے وقت سے حق چلا آ رہا تھا۔ ایک صاحب نے بغیر ایسی کسی چیز یعنی پیر صاحب یا کاغذات کے ہی ایک جگہ چہار دیواری کرا دی، راتوں رات کچھ پیڑ لگوائے اور مارا ماری کر کے دیسی صابن بنانے کا کارخانہ قائم کر دیا۔ شہر پھر بھی پُرسکون رہا اور ترقی کی طرف گامزن کہ اب ایڈمنسٹریشن نے کروٹ بدلی اور سرکاری اعلان ہوا کہ جو لوگ وہاں عرصے سے کھیتی کر رہے ہیں وہ زمین کے مالک قرار دے دیے گئے ہیں، جنھوں نے دوسری طرح قبضے کیے انھیں بے دخل نہیں کیا جائے گا لیکن کورٹ سے مقرر کچھ جزوی معاوضہ دینا پڑے گا۔ لیکن باقی زمین پر تجاوزات کی صورت میں سخت کارروائی کی جائے گی خواہ وہ کوئی ہو۔

”یہ چمار سیار مفت میں اتنی زمین لے گئے اور ہم تھوڑی سی پر ہی قابض ہوئے تو معاوضہ دیں۔ کچھ نے سوچا ارے ہم تو ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہی رہ گئے۔ کچھ ہی لے لی ہوتی تو قلیل معاوضے میں مل جاتی۔ اور معاوضہ کون دیتا ہے۔ وہ بھی تو دیکھنے کی بات ہے۔ اب یہ دلت تو اور شیر ہو کر ہماری چھاتی پہ مونگ دلیں گے۔

کچھ بڑے دبنگوں کا خیال کچھ الگ ہی تھا۔ یہ شہر سے اتنے قریب کی زمین میں کھیتی کا کیا تک ہے۔ یہ لوگ حاشیے پر رہتے تھے تو جب شہر نے حاشیہ نگل لیا تو انھیں اور پیچھے سرکنا چاہیے۔ شہر تو ترقی کر رہا ہے۔ کرتا رہے گا تو کیا بیچ شہر میں کھیتی ہوگی، اور یہ دلت ہیں کہ سر پہ چڑھے چلے آ رہے ہیں۔ ابھی سننے میں آیا کہ ان کے یہاں کی ایک لونڈیا نے فرمائش کی ہے کہ اس کا دولہا گھوڑے پہ چڑھ کے اسے بیاہنے آئے۔ جس لڑکے سے آنکھ مٹکا ہے وہ کان پور ٹینری میں کام کر کے پیسے کما کے لایا ہے، ادھر اماں ابا ناجائز قبضہ کر کے کھیتی کرتے چلے آئے ہیں وہ الگ۔ مٹا گئے ہیں، مگر لونڈیا ہے طرح دار۔ کالی ضرور ہے مگر کیا نمک ہے چہرے پر اور کیا لوچ ہے شریر میں۔ بات کرنے والے نے منہ میں آئی رال گٹکی۔ سننے والے نے ہنس کر کہا ”اٹھا لائیں کیا؟“

”ایسا آسان نہیں رہ گیا ہے اٹھانا۔ چناؤ قریب ہے اتنا ہلّہ مچے گا کہ ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔“

"تو کیا واقعی گھوڑی پہ چڑھ کے آگے دُلہا؟"

"سن تو رہے ہیں۔"

"چڑھ کے دیکھے۔ اسے کاٹنا آسان نہ ہوا تو گھوڑی کو تو کاٹ ہی دیں گے۔ سارا گڑ گوبر ہو جائے گا۔"

"گھوڑی بچاری نے کیا قصور کیا ہو گا۔ کاٹنا ہے تو لونڈے کو کاٹو اور لونڈیا کو اٹھا لاؤ۔ ایک بستار کی جگہ چار ملیں گے۔ رہا چناؤ تو ہم دیکھ لیں گے، ہماری جات کے بھی ووٹ نہیں ہیں کیا؟"

حاضرین قہقہہ لگا کر ہنسے پھر سنجیدہ ہو گئے۔ "مرڈر کی نہ سوچو ورنہ پولیس کو ہماری عورتوں کے گہنے اتروانے اور ہماری جمع جتھا لوٹنے کا موقع ملے گا۔"

"پولیس ان کا ساتھ دے گی؟" لہجہ استہزا تھا۔ "تھانے میں ایک آدمی نہیں ہے ان کا۔"

"ساتھ دے نہ دے ہم سے تو ساتھ نہ دینے کی قیمت لے لے گی۔"

یہ باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ مہینے گزرے۔ کھیتوں میں ربیع کی فصل لہلہائی۔ گیہوں کے شاداب پودے، چنا، مٹر، سرسوں۔ جدھر دیکھو آنکھوں کو تراوٹ۔

بشن نے طمانیت سے اپنے سات بیگھہ اور ترلوچن نے دس بیگھہ گیہوں پر نظر ڈالی۔ اس بار فصل بھرپور تھی۔ بیٹے۔ بیٹی کا بیاہ اسی لگن میں کر دیا جائے۔ پگلی کہیں کی۔ کہتی تھی راجیش گھوڑی پہ چڑھ کے آئے۔ ہمیں تو ڈر لگتا ہے مگر کہتی ہے پاپا، اب وہ سمے نہیں رہا۔ دیکھتے ہیں ہمیں کون روکے گا۔ دیکھتے نہیں کتنا وکاس ہوا ہے۔ شہر وہ ہے کیا جو پہلے تھا؟ آدمی جن کے وچار بھی بدلے ہیں، اور ہاں ہمیں ایک ٹی وی ضرور دیجیے گا۔ تھوڑا پیسہ ہم نے کمایا ہے وہ ہم ڈال دیں گے۔ پورا بھار آپ پر نہیں پڑے گا۔"

جس زمانے میں مضافات میں تمباکو کے کھیت ہوا کرتے تھے، پنڈت رام رتن شرما کی زمین بھی تھی۔ وہ ایک مسلمان کو بٹائی پر دی ہوئی تھی جو کاشت ہی نہیں کرتا بلکہ سُرتی کا بیوپار بھی کرتا تھا۔ سُرتی کا کاروبار کرنے والے مسلمان رنگی کہلاتے تھے۔ جب تمباکو کے کھیت ختم ہونے لگے رنگیوں کے لڑکے دوسرے دھندوں میں لگ گئے سُرتی بیچنے والے بہت کم رہ گئے (ہاں ان کی ذات برقرار رہی۔ وہ رنگی تھے، رنگی رہے)۔ لیکن کسی طرح پنڈت جی کا رنگی بٹائی دار اب بھی اپنے

ٹکڑے پر کھیتی کرتا رہا۔ اس طرف کی زمینوں کے دام بہت بڑھ گئے تھے اس لیے کہ شہر ترقی کی طرف گامزن تھا۔ کھیتی کی زیادہ تر زمین پر کہیں رہائشی مکان بن گئے تھے، کہیں چھوٹے موٹے کارخانے، کہیں بازار اور چائے کی دوکانیں۔ بس وہ زمین بچی تھی جس پر دلتوں کا قبضہ تھا اور خالی پڑا سرکاری حصہ۔ بڑھاپے کی سرحدوں پر کھڑے شرما جی کو خیال آیا کہ ظہور میاں سُرتی والے سے، جو انھیں کی طرح بوڑھے تھے کہا جائے کہ بٹائی سے کوئی فائدہ نہیں وہ زمین کی باقاعدہ قیمت ادا کر کے پکا کاغذ لکھائیں ورنہ تیار رہیں۔ جھنجھٹ ہو جائے گا۔ شرما جی کے بیٹے تو نہیں ہیں لیکن دامادوں نے بلا مچا رکھا ہے۔

وہ ظہور میاں سے بڑے خوش گوار ماحول میں بات چیت کر کے ادھر سے گزر رہے تھے کہ لونڈوں کے ایک جھنڈ کو تالیاں ٹھوک ٹھوک کے سُر تال میں کہتے سنا:

آنکھ مچولی گڑ کا تیل؛ تلی نے ہگا ڈھائی سیر
ڈھائی سیر میں کیا ہوگا: پنڈت جی کے بیاہ ہوگا

شرما جی ٹھٹھک کر رکے۔ پھر بے اختیار ہنس پڑے۔

شرما جی ٹھٹھکے اس لیے کہ یہ کہت داستان پارینہ تھی۔ شہر میں لڑکے اب اس طرح کے بے ہودہ کہت نہیں دوہراتے تھے۔ بچ سڑک کھیلتے بھی شاید ہی تھے۔ نئی گاڑیاں چلنے لگی تھیں، پھر بانکوں کا تو حساب ہی نہیں تھا۔ پرانے کھیلوں کی جگہ کرکٹ اور فٹ بال کھیلے جا رہے تھے۔ ٹی وی بھی اکثر گھروں میں راہ پا گیا تھا۔ لوگ شام کو اس سے چپک کر بیٹھ جاتے۔

"چاچا ہنس کیوں رہے ہیں۔" ساتھ چلتے ان کے بھتیجے کے دوست رنبیر سنگھ نے کہا۔ رنبیر کا تعلق اس کنبے سے تھا جس کے پاس اچانک کچھ کاغذات نمودار ہو گئے تھے جن کی بنا پر ان لوگوں نے ایک خاصے وسیع پلاٹ کو گھیر لیا تھا اور اب اس پر دوکانیں بن رہی تھیں۔

"ہنسوں نہ تو کیا کروں۔ بچپن میں میں بھی یہ بے سر پیر کی بے ہودہ کہت دوہراتا اور بھول جاتا تھا کہ میں خود پنڈت ہوں۔"

"تب کی بات دوسری تھی چاچا۔ تب ہم بے سوچے سمجھے بولتے تھے۔ کسی کو چڑھاتے نہیں تھے۔ اب دیکھیے اسی سے کہا جب آپ ادھر سے جا رہے تھے۔"

''چھوڑو نا بیٹا لڑکے ہیں۔''

''لڑکے؟ یہ ایک نمبر کے شاطر، چوٹے، حرام زادے۔''

''بس، بس۔ بزرگوں کے سامنے ایسے شبد منہ سے نہیں نکالے جاتے۔''

''کیسے شبد؟'' رنبیر کی سمجھ میں نہیں آیا۔

لڑکے تالیاں بجاتے ساتھ ساتھ ہی چل رہے تھے۔ ''ڈھائی سیر میں کیا ہوگا، پنڈت جی کے...''

جو سب سے آگے تھا، الفاظ اس کے منھ میں رہ گئے اس لیے کہ رنبیر نے اچانک جھپٹ کر اس کے منھ پر کرارا تھپڑ رسید کیا تھا۔ وہ چھوٹی عمر کا دبلا، کالا کلوٹا سا مریل لڑکا چکرا گیا۔ نکسیر پھوٹ گئی تھی۔ روتا چلاتا بھاگا۔ دوسرے لڑکے بھی بھاگے۔

''یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' پنڈت جی نے خفگی ظاہر کی۔

''کیوں نہیں کرنا چاہیے تھا؟'' وہ چھنکا۔ ''ہمت دیکھیے حرام زادوں کی۔ ڈھائی سیر تلی کے کو میں باہمن کا بیاہ کرا رہے ہیں۔''

''ارے تو راجپوتوں کا تو نہیں کرایا۔'' پنڈت جی پھر ہنس پڑے۔

''آپ نے کچھ سی. پی. آئی جوائن کرلیا ہے؟ نکسل ہو گئے ہیں کیا؟ کچھ سوزن ہیں ان کے پکش میں۔''

وہ باقاعدہ ناراض ہو گیا تھا۔ ہمارے چاچا سینئر تھے لیکن انھیں کا ایک جونیئر ان کے سر پر افسر بن کے آن بیٹھا۔ اور جانتے ہیں کون ہے وہ؟'' وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے نتھنے پھول پچک رہے تھے۔

''کون؟''

''تنک داس کے بھائی کا پوتا۔''

''ہوں۔'' رام رتن شرما کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

تنک کا چچیرا بھائی چرم کار برادری کا چودھری تھا۔ زمین قبضہ کرکے اس پر کڑی محنت کی۔ فصلیں اچھی ہوئیں تو اس نے اپنے بیٹے کو اسکول بھیجا۔ سرکاری اسکول تھا۔ الگ ٹاٹ پر تو

نہیں بٹھایا گیا لیکن دوسرے بچے الگ الگ کو رہا کرتے تھے۔ اس طرح تین لڑکے اور تھے۔ ایک کمہار تھا، ایک مسلمان ڈفال اور ایک مُرلی۔ تنک کے چچیرے بھائی کا پوتا لیکٹری سینی ڈپارٹمنٹ میں دو رسیر ہنا اسے ریزرویشن کی وجہ سے پولی ٹیکنک میں آسانی سے داخلہ ملا تھا۔ پھر نوکری بھی اسی لیے ملی۔ پھر پروموشن بھی۔ ایک ہمارا لڑکا ہے جوتے گھس گئے۔ نوکری نہ نوکری کی دم۔

''محنت کر رہا ہے؟'' شرما نے مختصر سا سوال کیا۔

''دن رات کر رہا ہے۔ جنرل کٹگری میں نوکری ہے ہی کتنوں کے لیے۔ اوپر سے کچھ گھوس دینے والے بھی ہیں۔ کھیت بیچ کر گھوس دے لیتے ہیں پھر گھوس لے کر نقصان کی بھرپائی ہو جاتی ہے۔''

''ارے تو سرکاری نوکری کے پیچھے پڑے کیوں ہو۔ مسلمانوں کو دیکھو۔ کون مائی باپ ہے۔ بے چارے اپنے اپنے دھندے میں لگ جاتے ہیں۔''

رنبیر نے ذرا مشکوک نظروں سے شرما جی کو دیکھا۔ ان کی باتوں میں کچھ عجیب سی چیرائند تھی۔ ایک ناپسندیدہ مہک۔ خود تو بڑے افسر بن گئے تھے۔ یہاں آکے چلے دوسروں کو نصیحت کرنے۔ کہیں ہمارے پلان میں لنگڑی نہ لگائیں۔

پلان ہفتہ بھر کے اندر عمل میں آ گیا۔

شرما جی کی چھٹیاں باقی تھیں۔ ابھی وہ گئے نہیں تھے۔ ریٹائر ہونے ہی والے تھے اس لیے بچی ہوئی چھٹیاں لے لی تھیں۔ گرچہ یہاں انھیں بے آرامی ہی محسوس ہو رہی تھی۔

خر آئی دلتوں کے لہلہاتے کھیتوں کے درمیان گائے بھینسوں کا ایک بڑا ریوڑ چھوڑ دیا گیا تھا اور ایک اور نوکھی تدبیر آزمائی گئی تھی کہ فصلیں پوری طرح تباہ ہونے میں کمی نہ رہے۔ اس کی تیاری کافی پہلے سے تھی۔ ببول، کیکر، برگد، پاکر جیسے درختوں کا ایک بڑا جنگل کچھ ہی دور پر تھا۔ وہاں نیل گایوں کی بھرمار تھی۔ چارے کی فراوانی کی وجہ سے وہ ادھر کا رخ کم ہی کرتے تھے۔ ان کا ایک منظم ہانکا کر کے انھیں کھیتوں کی طرف ٹھیل دیا گیا۔ اتنی تعداد میں جانور آ گئے تھے کہ فصل برباد ہونے میں زیادہ وقت بھی نہیں لگا۔ جتنا کھایا اس سے زیادہ روندا۔

جس طرح وارانسی کے باوجود بنارس آج بھی رائج ہے اسی طرح دلت بستی عرف ہریجن ٹولہ عرف چمرٹولی کہلاتی اس بستی میں پھنس پڑ گئی۔ بوڑھے جوان بچے عورتیں سب دہاڑیں مار کر رو دیے۔ سو گمبو خوش ہوا۔

لوگ پہلے مکھیا جی کے پاس پہنچے۔ انھوں نے کہا نیل گائیں تو نقصان کرتی چلی آرہی ہیں۔ اس بار ذرا زیادہ ہوگیا۔ اس میں کوئی کیا کرسکتا ہے۔

سرپنچ پتی نے بھی یہی بات کہی۔

اب یہ بھی شہر کی ترقی ہی تھی کہ اطراف کی پنچایتوں میں عورتیں الیکشن لڑکے پنچ اور سرپنچ تک بن جاتی تھیں۔ ان کے لیے سیٹیں ریزرو تھیں لیکن شاید ہی کوئی ایسی دعا کرتی تھی جو خود اپنا عہدہ سنبھالتی تھی۔ شوہر مونچھوں پہ تاؤ دیتے اور چھاتی چوڑی کر کے چلتے تھے۔ آخر انھیں کے ایما پر تو عورت الیکشن لڑنے نکلی تھی اور انھیں کے پٹھوں کی طاقت سے جیتا کرتی تھی۔ یہاں سرپنچ اوما دیوی تھیں۔ گھونگھٹ کی اوٹ میں اُپلے تھاپتے یا اوسارے کی لیپا پوتی کرتے ان کی گوری، چوڑیوں بھر بازو دکھائی پڑ جاتے ور بس۔ باقی پنچایت کے انتظامی امور ان کے شوہر بھولا سنگھ سنبھالتے تھے جو اوما دیوی کے سرپنچ بننے کے بعد سے سرپنچ پتی کہلاتے اور پنچایت کے سارے انتظامی امور سنبھالتے تھے۔

انھوں نے یہ بھی جوڑ دیا —— اور ہاں ذرا لونڈوں کو سنبھال کے رکھو۔ بابھن راجپوت کو گالی نہ دیں۔

کیسی گاری ہجور۔ بلکتے لوگوں میں سے کوئی بولا۔

سنا ہے جیسے ہی اونچی جات والا ادھر سے نکلتا ہے آنکھ مچون گھورو کا تیل الاپنے لگتے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ لڑکے تو جانے کیا کیا اوٹ پٹانگ بکتے چلے آئے ہیں۔ ابھی جو یہ پنڈت رام رتن شرما کایا کلپ کر کے لوٹے ہیں بچپن میں یہ خود بلی نے ہکا ڈھائی سیر والا گیت الاپتے تھے۔

لوگوں نے مایوس ہوکر تھانے کا رُخ کیا۔ شروع میں سوچا تھا بات پنچایت سے طے ہوجائے کچھ معاوضہ مل جائے۔ آگے کے لیے معاہدہ ہوجائے لیکن تھانہ انچارج نے رپورٹ

لکھنے سے انکار کر دیا۔ کچھ بحثا بحثی ہوئی۔

"یہ پہلے پیڑ سے باندھ کر جوتوں سے مارے جاتے تھے تبھی ٹھیک رہتے تھے۔ آج تو سالوں کو ان کی ذات کے نام سے پکارنا جرم ہوگیا ہے۔"

"ہاں مداری کو مداری کہو، پاسی کو پاسی، جلاہے کو جلاہا، موسہر کو موسہر مگر چمار کو چمار نہ کہو یہ کہاں کا قانون ہے۔"

"مار یے تا پیڑ سے باندھ کے۔" دو دلت جوان آستین چڑھا کے ذرا آنکھیں نکال کے بولے۔

"ارے یہ تو شدھ کھڑی بولی بول رہا ہے۔ کہاں سے پڑھ کے آیا ہے؟"

کان پور ملٹری میں کام کرتا ہے اسی لیے اکڑ رہا ہے۔ چھٹی لے کے بیاہ کرنے آیا ہے۔ کسی نے پوری معلومات مہیا کرادیں۔

"ملٹری کی حالت تو تم لوگوں نے پتلی کرا دی ہے۔ بہت آرمی کی چھٹی ہوگئی۔ مال نہ بن رہا ہے نہ نکل رہا ہے۔" اس نے زور سے تھوکا۔ "کیسے تو ہم بچے رہ گئے۔"

"پرسوں تمھارے یہاں گائے کا چمڑا نکالا گیا ہے۔" ایک پولیس اہل کار نے کہا۔

"ہمیں سب خبر رہتی ہے۔" گائے کا چمڑا سن کر بہت لوگوں کے کان کھڑے ہوگئے۔

"اسے یہاں لیوا کراتا ہے۔ مری گئو تھی۔ پوچھ آؤ پنڈتائن کی تھی۔" وہ اور جوان بر فروختہ ہو کر بولے۔ بوڑھوں نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "وہ پچھیا کے گھر والوں نے چھیلی تھی۔ وہ ہم سب میں دب ہیں۔ اب اور کوئی یہ کام کر بھی نہیں رہا۔"

پولیس والوں نے ایک دوسرے کی طرف خاموش نگاہوں سے دیکھا۔ ان کی خاموشی بڑی منحوس تھی۔ ویرانے میں بولتے الو جیسی۔ ایف۔ آئی۔ آر نہیں درج کی گئی۔ دلت واپس لوٹ گئے لیکن دونوں کان پور والے لڑکے تیل پلائی ہوئی لاٹھیوں جیسے مضبوط جسم والے۔ دھمکی دے کر گئے کہ بڑے صاحب کے پاس جائیں گے۔

ب کی ویرانے کی خاموشی کو اُلوؤں کی ہنسی نے توڑا۔ دبی دبی سی منہ چڑاتی ہنسی۔ لڑکوں نے آنکھیں تریریں۔ تھانے میں بھیڑ بڑھ گئی تھی وہ چھٹنے لگی۔

واقعی کیا بڑے صاحب کے پاس جائیں گے؟ ایک وہ میاں آگ موتتے رہتے ہیں اور دوسرے اب یہ موری کی اینٹ چوبارے چڑھ رہی ہے۔ مندر میں گھس جاتے ہیں۔ ڈھابوں میں برتن دھو رہے ہیں۔ کیا کیا جائے کام کرنے والے نہیں ملتے۔ ملتے ہیں تو یا میاں سلمان یا پھر یہ چم کٹے۔ وہ بھی پڑھ پڑھ کے بھاگ رہے ہیں۔ سرکار بھسماسُر تیار کرا رہی ہے۔ ایک دن اسی کو بھسم کریں گے۔

شکایت ایس پی صاحب تک پہنچ گئی، اور جیسے فصل تباہ کرنے کے لیے انوکھا طریقہ ایجاد کیا تھا ویسے ہی ان لوگوں نے شکایت کے لیے انوکھا طریقہ نکالا۔ چار پانچ عورتیں جن میں وہ گھوڑی پہ بارات بلانے والی بھی تھی، کوٹھی کے پھاٹک کے باہر بیٹھ گئی اور زور زور سے بین کر کے رونا شروع کر دیا۔ دربان نے قدرے ہمدردی سے انھیں دیکھا۔ اسے لگا ان میں جو جوان چھوکری ہے شاید اس کی عزت لوٹی گئی ہے۔ اس نے کہا "ادھر جا کے پیڑ کی چھایہ میں بیٹھ جاؤ۔ گیارہ بجے حاکم کی گاڑی نکلے گی تو جور جور سے چلا کے رو دیجیو۔" عورتوں نے معنویت سے اسے دیکھا اور ہدایت پہ عمل کیا۔ جیسے ہی اندازہ ہوا گیٹ کھل رہا ہے ان کے بین آسمان چھونے لگے۔ گاڑی رُک گئی۔ ایس پی صاحب نے دوسرے دن بلایا۔ اس وقت وہ کہیں دورے پہ جا رہے تھے۔

لیلیں یوں بھی کہیں کہ کسی دانستہ سازش کا امکان نہیں ہے۔ جنگل کی طرف سے نیل گایوں کا ریوڑ آن پڑا تھا۔ گائیں، بھینسیں تو کبھی کبھی دو چار یوں بھی گھس ہی جاتی ہیں۔ پتہ نہیں کس کی تھیں۔ ہاں بدری بابو کی گائے غائب ضرور ہے۔ لگتا ہے...

کمل تفتیش کا حکم تھانے چلا گیا۔ بدری کی غائب گائے کے بے بھی اور اس شکایت کے لیے بھی کہ دبنگوں نے دانستہ ریوڑ ہنکایا تھا۔ صرف نیل گائیں نہیں تھیں۔ اور وہ اس سے پہلے آتی بھی نہیں رہی تھیں۔

اوپر سے حکم آیا تو پولیس والے جگہ سے ہلے۔ تفتیش شروع ہوئی۔ معاوضہ دینے کی مانگ زور پکڑنے لگی۔ ایک گروپ بدری کی گائے کے لیے کھڑا ہوا تھا۔ ہنگامہ جاری تھا گائے کہاں گئی۔ گائے بدری کی نانی کے یہاں تین گاؤں دور آرام سے ناند میں کھلی بھوسہ کھا رہی تھی۔ تبھی

ایک واقعہ ہو۔ میڈیا والے دوڑ پڑے اور کھانے کی میز پر تنہا بیٹھی ایس. پی کی نوجوان بیوی قاب سے چاول نکالتے ہوئے بڑبڑائیں، جہاں جائیں یہ تماشہ ہوگا ہی ہوگا۔ نکل گئے سویرے سویرے۔

مہوے کے پیڑ سے دو دلت جوانوں کے مردہ جسم جھول رہے تھے۔ کسی نے رات کے کسی پہر مار کر لٹکا دیا تھا۔ اس میں وہ بھی تھا جس نے گھوڑی چڑھ کر بارات لانے کی فرمائش کی تھی۔

اب وہاں میڈیا بھی تھا اور ٹی. وی بھی اور وہ سب ایک سنسنی خیز خبر لینے دوڑ پڑے تھے۔

قصبہ نما شہر تیزی سے ترقی کی طرف گامزن تھا۔

○○○

کوویڈ کے ماتم دار

پھول سنگھ عرف پھولن گھر لوٹا تو ہاتھ میں آٹا، دال، چاول جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ البتہ مار کھا کے آیا تھا۔ "ارے کیا ہوا کاجل کے پاپا۔" بیوی گھبرا گئی۔

پھولن نے پولیس والوں کو فرانے سے گالیاں دیں۔ کہتے تھے کرفیو ہے۔ جانتا نہیں۔ ہم نے کہا کہ گھر میں کچھ کھانے کو نہیں ہے۔ آٹا دال لینے جا رہے ہیں وہ بھی اُدھار۔ دوکان کھلنے کا تو حکم ہے تو انھوں نے ڈنڈے مارے اور کہا پانچ بجے دوکان بند کر دینے کا حکم بھی تو ہے۔

"چھ بجے ہر کوئی بول رہا ہے۔ پانچ بجے کیسے؟" بیوی بولی۔

"سو تو ہم نے بھی کہا تو ہم کو اور ڈنڈے مارے کہا سالے تو کہیں سے پینے کا جگاڑ کرنے جا رہا تھا۔ ہم نے کہا ماں قسم چار دن سے گلا سوکھا پڑا ہے۔ ایک بوند جو ملی ہو۔ دو ڈنڈے اور مارے۔ تین دن پہلے پی رہا تھا۔ کہاں سے لا رہا تھا راجیہ میں نشہ بندی تو اس سالے کرونا سے بہت پہلے سے ہے۔ ہم تو بول کے پھنس گئے ری سونا۔ ڈر گئے تھے کہیں ہاتھ پاؤں ٹوٹ گیا تو چار پیسے بھی کہاں سے لائیں گے۔"

"چلو اتنے پر ہی چھوڑ دیا اور جو کہیں بند کر دیتے ماں کے یار اور کہتے بتا شراب کہاں مل رہی ہے تو؟ ہم سے زیادہ تو یہ پیتے ہیں۔"

سونا کو خوب یاد تھا۔ بڑا جشن جس کے محلے میں چرچا ہوا تھا۔ صوبے میں شراب بندی ہوئے چوتھی دن ہوئے تھے۔ پولیس والوں نے ایک ٹرک پکڑا۔ اس پر تہہ کیے ہوئے رُوئی کے کارٹن تھے۔ اتنے کہ ٹرک بوجھ سے ڈگمگا رہا تھا۔ چنگی پر کچھ تکرار ہوئی۔ لو ان کی تو قسمت کھل

گئی۔ رُوئی کے تہہ کیے ہوئے بکسوں کی تہوں میں شراب کے کارٹن چھپے ہوئے تھے۔ بس ٹرک ضبط، دارو ضبط، خلاصی، ڈرائیور، مالک سب ضبط۔ پھر وہ دارو سے بھرے بکس تھانے سے غائب ہو گئے۔ اخبار والوں نے شور مچایا۔ کچھ پولیس والوں کا انٹرویو لیا۔ پولیس والوں نے کہا تھانے میں چوہے بہت ہیں وہ ساری شراب پی گئے۔ چوہے اور بکسوں میں بند شراب پی گئے۔ وہ بھی اتنی ساری۔ ارے جھوٹ بولو تو جھوٹ جیسا بھی تو لگے۔ یہ تو جس کے سر پر تاپ چڑھ جائے وہ ایسا پرلاپ کرتا ہے۔ محلے میں کئی گھروں میں ہندی اخبار آتا تھا۔ لونڈے پڑھتے اور ہنسی ہنسی ہنسی کر کے جیتے۔ سونا بھی لوٹ لوٹ کے ہنسی تھی۔ اس وقت اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ لوٹ لوٹ کے ہنسنے کا تو زمانہ ہی تھا لیکن ابھی اسے پھر ہنسی آ گئی۔ کیوں کہ بات بہت پرانی نہیں تھی وہ ہنسنے لگی ہا ہا ہا، ہو ہو ہو، چوہا سب دارو پی گیا۔ دارو پی کے کیا کیا ہوگا۔ دُم پکڑ کر کھڑا ہو کے ناچ ہوگا۔ ایک مضحکہ خیز منظر نے اس کے ذہن میں اُبھر کر اس کی فوری پریشانی جذب کر لی۔ ہزاروں چوہے دُم پکڑے ہو کر ناچنے لگے۔ ہو ہو ہو ــ بے بھگوان۔ ہو ہو ہو۔ پھولن نے پاس پڑی لکڑی اٹھا کر بیوی کو رسید کی۔ ہم ڈنڈے کھا کے آ رہے ہیں اور حرام زادی ہنس رہی ہے۔ اس کی ہنسی میں بریک لگ گیا۔ اُدھر تین سالہ بچی نے چلا چلا کر رونا شروع کر دیا۔

پھولن محبت کرنے والا انسان تھا بس کبھی کبھار ہاتھ اٹھا لیتا تھا لیکن ڈنڈا، جوتا وغیرہ اس نے کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ پھر وہ سارے گھونسے لاتیں یا تھپڑ سب متوقع ہوتے تھے۔ سونا پر ان کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا تھا اس لیے آج جو یہ غیر متوقع ڈنڈا پڑا اس کی چوٹ بہت تیکھی تھی۔

"کیوں رے نامرد۔ پولیس کے تو ڈنڈے کھا آیا۔ یہاں ہم پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ کیا کیا ہم نے؟ بڑا مرد بنتا ہے! پولیس سے ڈنڈا چھین کر انھیں کو مارتا تب جانتے بڑا مرد ہے۔" ایک تو نامرد کا خطاب اس پر یہ چیلنج۔ پولیس سے ڈنڈا چھینے اور پھر اسی ڈنڈے سے پیٹنے کی جرأت کا نتیجہ جاہل سے جاہل آدمی جانتا ہے۔ یہاں تک کہ عورت کو بھی جو تا چاہیے جس کو چیلنج دینے میں، دینے والے نے بڑی کنجوسی سے کام لیا۔ اس نے دو ڈنڈے اور مارے۔ "پولیس پہ ہاتھ اٹھاتے تو ہمارا منھ دیکھتی؟ تھانے سے سندور پوچھ دیا جاتا جو ناک تک لگا کے گھومتی ہے۔ چل جا دیکھ کھانا ونا ٹول کے۔ کچھ ہو تو بنا۔ بچی جس کے جنمی ہے اور مہارانی بنی پھرتی ہے۔ سونا ابھی تک

حیرت اور اہانت کے دوہرے احساس سے باہر نہیں آسکی تھی۔ رونا گناہ، مانگنے جانا گناہ، زیادہ ساج سنگار کرنا گناہ، اب ہنسنا بھی گناہ ہو گیا۔ ہم اور ہنسیں گے۔ چل مار آ کے۔

اس نے مصنوعی قہقہہ لگایا ہاہاہا، ہو ہو ہو ... چل مار۔ ''پھولن نے مزید پیٹنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ قہر آلود نظروں سے گھورتا اپنی چوٹیں سہلاتا، اوسارے میں جا کر بیٹھ گیا اور وہیں سے پکار کر بولا جا۔ جا۔ بنا کچھ۔ ضرور کچھ بگاڑ کر کے رکھے ہوگی۔

''ہاں سب بگاڑ تو ہمیں کو کرنا ہوتا ہے۔ تو کا تو کچھ کرے کا نہیں۔'' سونا بڑبڑائی۔

اس نے کچھ چاول بچا کر رکھے تھے۔ نمک مرچ بھی تھا اور تھوڑا سا کڑوا تیل بھی۔ ابھی کم از کم دو دن کا انتظام تھا کہ وہ بھوکے نہ سوئیں۔ ہاں یہ کہ صرف بھات اور بھونی مرچ کھانی ہوگی۔ لیکن وہ وہیں پھیل کر بیٹھ گئی اور تبھی اٹھی جب کاجل نے پکار لگائی۔ بھات دے ناں۔

اب تو اٹھے گی کہ اب بھی نہ اٹھے گی۔ پھول سنگھ نے زہر خند کے ساتھ کہا۔

سونا نے بچی کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا، ایک منھ والے گیس کے اسٹوو پر اُدہن چڑھایا اور چاول دھونے باہر نل پر چلی گئی۔ پولیس والے ڈنڈے وِنڈے چلا کے، دوکانیں بڑھوا کے، ٹھیلے والوں کو بھی بھگا کے، کسی سے کچھ پیسے، کسی سے کچھ سبزی۔ پھل وغیرہ وصول کر کے جا چکے تھے۔ سڑک بالکل سونی تھی۔ اس نچلے اور نچلے متوسط طبقے کے علاقے میں گھنی اداسی اُتر آئی تھی جو آج کل ہر شام اندھیرے کے ساتھ اترنے لگی تھی۔ بچے جو پہلے شام ڈھلے باہر سڑک پر دیر رات تک شور مچا مچا کر کھیلتے رہتے تھے اب گھروں میں بند تھے۔ پہلے شام تو روز اُترا کرتی تھی، یہ موت کا سناٹا نہیں۔ اس نے لگے ہاتھ المونیم کے برتن میں پینے کا پانی بھی بھر لیا۔ واپس آئی تو اُدہن کھول چکا تھا۔ اس نے جلدی سے چاول ڈالے۔ پک گئے تو پسا کر ان کی گاڑھی ماڑ ایک بڑے سے کٹورے میں نکالی۔ پھر کرچھل میں تھوڑا سا کڑوا تیل ڈال کر کچھ سرخ مرچیں تلیں۔ پھر اس نے پہلے پھول سنگھ کی تھالی تیار کی۔ بھات نکال کر ایک طرف نمک رکھا، ایک طرف تلی ہوئی مرچیں۔ ایک پیالے میں چاول سے نکلا ہوا ماڑ۔ پھر اس نے بچی کے لیے چاول نکالے۔ ان کے اوپر نمک چھڑکا، تھوڑا سا کڑوا تیل اور دو چمچ ماڑ ڈال کر نوالے بنا بنا کر اس کے منھ میں ڈالے۔ آج کل اسے اور کچھ نہیں مل رہا تھا۔ نہ بسکٹ، نہ کوئی پھل۔ دودھ کی

کون کہے اس لیے کھانے بیٹھتی تو چھوٹی تھالی بھر کر بھات ختم کر لیتی۔ سونا کو محسوس ہوا کہ بچی کو کھلانے کے بعد وہ خود کچھ بھوکی رہ گئی ہے۔ اس نے دو گھونٹ بچی ہوئی ماڑ نمک ڈال کر پی اور پتیلی میں جو بچا کھچا چاول تھا وہ شوہر کی تھالی میں ہی ڈال دیا۔ غصے کے باوجود اسے بہت ترس آیا۔ لمبا، چوڑا اپنا کڑیل جوان اور کھانے کو کیا مل رہا ہے۔ بھات اور بھونی مرچ۔ وہ معمولی حیثیت کے لوگ تھے لیکن اس طرح کا کھانا انھوں نے کبھی نہیں کھایا تھا۔ دال، ایک ترکاری اور روٹی چاول۔ ساتھ میں چٹنی۔ اتوار کو پھول سنگھ کی چھٹی ہوتی۔ اس دن ضرور مرغا، مچھلی یا بکرے کا گوشت پکتا۔ جب کبھی ماں کے گھر سے گھی آ جاتا، سونا بیسن کے لڈو بنا لیتی تھی۔ یوں بھی پھولن بچی کے بہانے کوئی نہ کوئی مٹھائی یا چاکلیٹ لیے چلا آتا تھا۔ تیج تہوار پر پوریاں تلی جاتیں، پوے پکتے۔

کاجل پیدا ہوئی تو پھول سنگھ کے ایک ہم کار نے گاؤں سے ایک بکری کا بچہ تحفے میں لا کر دیا تھا۔ اس کے سسرال میں بکریاں پالی جاتی تھیں۔ اس نے بتایا کہ لمبے کانوں والی یہ جمنا پاری بکری بچے کو پلانے کے بعد سیر۔ ڈیڑھ سیر دودھ دے گی۔ بکری کا دودھ بہت مفید ہوتا ہے۔ اور دودھ دے گی کب؟ پھول سنگھ اس انوکھے تحفے پر حیران ہوا۔

ارے بے وقوف۔ یہ پانچ مہینے کی ہے۔ سال بھر کی عمر ہوتے ہوتے بکری گابھن ہوتی اور بچے دیتی ہے۔ جاؤ رکھو۔ سونا کو یہ تحفہ بہت پسند آیا۔ کم خرچ بالا نشین۔ پاس میں پیپل کا درخت تھا۔ وہاں سے پتے آ جاتے۔ سبزی مارکٹ سے بہت سے پتے مل جاتے، جو سبزیاں خراب ہوتیں مل جاتیں۔ بکری باہر بندھی رہتی۔ کوئی جھنجھٹ نہیں تھا۔

بکری نکل گئی بھلا۔ پھر بھی اس کا ایک فائدہ تھا۔ بچی جب گرد و پیش پہچاننے لگی تو بکری کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی۔ چلنے لگی تو اس کے پاس خود پہنچ جاتی۔ لمبے لمبے کان پکڑ کر کھینچتی جانور عموماً بچوں کو کچھ نہیں کہتے۔ بکری بڑے آرام سے کان کھنچواتی بیٹھی ہوتی تو کاجل کو پیٹھ پر سوار ہونے دیتی اور اپنی جگالی جاری رکھتی۔ کاجل کھلکھلا کھلکھلا کر ہنستی تو بکری کے گابھن نہ ہونے کا قلق جاتا رہتا۔ جس ''بکری ایکسپرٹ'' نے لا کر دی تھی، اس نے کہا کہ عورتوں کی طرح کچھ بکریاں بھی دیر سے بچے جنتی ہیں۔ ایک سال نہیں دو، دو نہیں تین۔ منگری گھر کی فرد بن گئی۔

پھول سنگھ ایک پرائیویٹ پریس میں کام کرتا تھا۔ بڑا کارخانہ تھا۔ وہ مشین آپریٹر تھا۔ اتنی تنخواہ مل جاتی تھی کہ آرام سے گزارا ہو جاتا تھا۔ گزشتہ سال مارچ میں پہلی مکمل تالہ بندی ہوئی تو پریس بند ہو گیا۔ دو تین مہینے مالکوں نے تنخواہ دی، پھر ہاتھ روک لیا۔ جب آمدنی ہی نہیں ہے تو ہم کہاں سے لائیں۔ ہمیں تو خود اپنے گھر کے خرچ کم کرنے پڑ رہے ہیں۔ بے شک ان کی عورتوں نے زیور بنوانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا اور مردوں نے نئی گاڑی خریدنے کا۔ درمیان میں تالہ بندی میں تخفیف ہوئی، پھر کافی حد تک حالات نارمل ہو گئے لیکن پریس والوں نے تنخواہ میں تیس فی صد کٹوتی کر دی۔ یہ واقعہ ہے کہ ان کے یہاں کام پہلے کی طرح نہیں آ رہا تھا۔ دعوت نامے، وزیٹنگ کارڈ، لیٹر پیڈ چھپنے تو بالکل ہی بند تھے۔ ہر شخص ان ضروریات کو ملتوی کر رہا تھا یا بالکل ہی ختم کر رہا تھا جو 'ضروریات' کی صف سے نکالی جا سکتی تھیں۔ تبھی وبا کی دوسری لہر نے کرفیو اور پھر مکمل تالہ بندی ایک بار پھر کرا دی۔

پہلے لاک ڈاؤن میں کاجل کے اسّی فی صد زیور بک چکے تھے۔ وہ سب چاندی کے تھے لیکن بھاری۔ ماں نے شادی پر دیے تھے۔ چاندی کا بھاؤ بھی سونے کی طرح کافی بڑھا ہوا تھا اس لیے ان سے کافی دن کٹ گئے بے شک انھیں بھی، اپنا جو بھی معیار تھا، اس سے نیچے اُترنا پڑا تھا۔ سونے کے دو زیور اس دوسری لہر میں بک گئے۔ یہ اسے جان سے زیادہ عزیز تھے۔ ایک انگوٹھی اور ایک جوڑی ٹاپس۔ کہا جاتا ہے سہاگن کے جسم پر تھوڑا سونا ضرور رہنا چاہیے۔ اس نے ناک کی کیل خرید لی تھی تاکہ شگن پورا ہو۔

اب کیا برتن بھانڈے بیچیں؟ پکائیں کھائیں گے کس میں؟

ایک مہینہ اور۔ پھر پریس کھل جائے گا۔

ہاں لیکن ایک مہینہ۔ سوال دہشت ناک تھا۔

پھول سنگھ، سکندر کو بلا دیا۔ سکندر کی مٹن کی دوکان تھی۔ بکری کم ہو گئی تھی لیکن لشٹم پشٹم کھانے کا جگاڑ ہو جاتا تھا۔

بکری کا گوشت سستا بکتا ہے۔ اس نے کہا۔

بھلا ہے۔ بچے ہونے سے بکری خراب ہوتی ہے۔ خصی جیسا گوشت ہوگا۔

اب یہ ہم گاہکوں کو کیسے سمجھائیں گے۔ سکندر کی دلیل معقول تھی۔

''ٹھیک ہے جو دے دے۔'' پھول سنگھ نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔

بکری تنومند تھی۔ اور تین برس کی ہو چکی تھی۔ انسانوں کے لحاظ سے پچیس سال کی بھری جوانی۔ سکندر چار ہزار روپے کو راضی ہو گیا اور آدھا کلو گوشت۔

سکندر نے آ کر رسی کھولی تو کاجل نے بڑا ہنگامہ کیا۔ نہیں لے جاؤ نہیں لے جاؤ۔ سونا کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ غلطی ہو گئی۔ خود پھول سنگھ پہنچا آتا تو کاجل سمجھتی نہیں کہ بکری کسی اور کے یہاں جا رہی ہے۔ وہ آ کر اس کے پیروں سے لپٹ گئی۔ بکری بھی کچھ سمجھ رہی تھی۔ اس نے زور زور سے ممیانا شروع کیا۔ کاجل کی پکڑ ایسی مضبوط تھی کہ سکندر پریشان ہو گیا۔ چھوٹی بچی، چوٹ نہ لگ جائے۔ ادھر کاجل نے گلا پھاڑ پھاڑ کے رونا بھی شروع کر دیا۔

آخر پھول اٹھا، دو تھپڑ کھینچ کر رسید جے اس کے چہرے پر رسید کیے پھر اسے گھسیٹ کر تقریباً پٹخ دیا اور سونا پہ چلایا ہٹا اسے یہاں سے۔ بچی سکتے میں آ گئی۔ اسے کبھی مار نہیں پڑی تھی۔ اور یہ۔ یہ تو حد تھی پھولوں سے جسم کے لیے۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور زبان گنگ ہو گئی۔

اور تب۔ تب لانبے چوڑے بٹے کٹے پھول سنگھ نے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔

○○○

روٹی مچھندر اور وہ

تب مچھندر نے ایک موسہر کے گھر جنم لیا تھا۔

مچھندر کی ماں ایک اسکول میں مڈ ڈے میل (midday meal) بنانے کی نوکری کرتی تھی۔ کوئی ساٹھ بچوں کا کھانا پکانا، پکانے کے برتن دھونا اور پھر جگہ کو لیپ کر صاف کرنا ہوتا تھا۔ اتنے کام کے لیے اسے مہینے میں صرف ایک ہزار روپے ملتے تھے۔ وہ ملک کی ۲۶ لاکھ کو کری اس ورک فورس کا حصہ تھی جو اس کام پر مامور تھے۔ ۲۶ لاکھ میں ایک اکائی۔ خیریت یہ تھی کہ کھانے میں عموماً کھچڑی اور چاول جیسی چیزیں ہوتی تھیں۔ اتنے سارے لوگوں کے لیے روٹی نہیں پکا کرتی تھی۔

اچانک ایک دن اسکول میں ہڑکپ مچ گیا۔

کچھ لوگوں نے آ کر سارے برتن الٹ دیے۔ اس دن بچوں کو مٹر پلاؤ دیا جا رہا تھا۔ پلاؤ تو خیر نام کو ہوتا تھا لیکن بہرحال پتلی کھچڑی کھا کھا کے عاجز آئے ہوئے بچوں کے لیے ایک تبدیلی ہو جاتی تھی۔ اور بچے اس پلاؤ سے خوش ہو جاتے تھے۔ ساتھ میں دھنیے کی چٹنی یا پودینے کا موسم نہ ہوا تو املی۔ ہری مرچ کی چٹنی بھی ہوتی تھی۔

بچے بہت خوش ہو رہے تھے۔ انھوں نے مچھندر کی ماں کو بوری پر مٹر کی ڈھیری لیے مٹر چھیلتے دیکھا تھا۔ اسکول کا واحد چپراسی جو مچھندر کی ماں کی کچھ مدد کر دیتا تھا ساتھ میں مٹر چھلوا رہا تھا اور گاہے بگاہے دانے منھ میں بھی ڈالتا جاتا تھا گرچہ مچھندر کی ماں اس حرکت پر اسے خشمگیں نظروں سے گھورتی جاتی تھی۔

تبھی وہ آ گئے۔

انھوں نے بڑا زور کا ہلا مچایا، اور آخر میں چولہے پر چڑھا دیو قامت بھگونا ڈنڈوں کی مدد سے الٹ دیا۔ اُبلتے ہوئے چاول مٹی اور راکھ میں مل گئے۔ بچے گھبرا کر ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ شہر کے مضافات میں پانچویں کلاس تک چلنے والے اس اسکول میں دو چھوٹے کمرے تھے بغیر سیمنٹ کی ہوئی، محض اینٹوں سے بنی چہار دیواری کا ہوا کھلا ہوا میدان تھا جس میں کچھ کلاس آسمان تلے بھی لگا کرتے تھے اور چہار دیواری پر ہمیشہ اُپلے تھاپے ہوئے ہوتے تھے۔ ایک کنارے برگد کا چھتنار درخت تھا جس کے نیچے بڑا سا مٹی کا چولہا اور برتن بھانڈے رکھنے کے لیے اینٹیں جوڑ کر ایک نیچا سا چبوترہ بنایا گیا تھا۔ سنتے تھے اسکول کو سرکار کی طرف سے گیس کا چولہا ملنے والا تھا اور رسوئی پر ٹین کی چھت ڈلوانے کی بات بھی تھی۔

دو اساتذہ تھے اور ایک ہیڈ ماسٹر کل ''فیکلٹی'' یہی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ گھبرا کر باہر نکلیں، چار پانچ لوگ ڈنڈے پھٹکارتے، مونچھیں اینٹھتے بڑے ماسٹر صاحب کے سامنے آن موجود ہوئے اور زور زور سے ایک ساتھ بولنے لگے۔

''سب کا دھرم بھرشٹ کر رہے ہیں آپ لوگ۔ یہی سرکاری اسکول چلا رہے ہیں؟ کون سرکار ہے یہ؟ موسہرن کو کھانا بنانے کے لیے رکھا ہے؟ کے ٹھو موسہر چمار آتا ہے آپ کے یہاں؟ سب اونچی جات کا لڑکا ہے۔ اتی نیچی جات کا تو پانچ سات سے اُدھک نہیں ہی ہوگا۔ یہ اپوتر بھوجن کرا رہے ہیں آپ۔ ترنت ہٹائیے۔ آج کیول چتاونی دے رہے ہیں۔ کل ہو کے کچھ ہو گیا تو ذمے داری آپ کی ہوگی۔''

انھوں نے جواب کا انتظار نہیں کیا نہ ہی سوچ دیا۔ تینوں اساتذہ منھ کھول کھول کے رہ گئے۔

اسکول سرکاری تھا، تو تھا مچھندر کی ماں کو ہٹایا نہیں جا سکتا تھا لیکن وہ دیوتا، دیو ستاتی ایسی جگت بھاگی کہ پیچھے مڑ کر دیکھا تک نہیں۔ کسی نے اسے مارا پیٹا نہیں، اس کی دھوتی نہیں کھول دی۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس نے طاق پہ رکھی کل دیوی کے سامنے ایک چمچ تیل ڈال کے دیا جلایا۔

مچھندر کا باپ ایک دوکان پر سامان تولتا اور بڑے بڑے بورے پیٹھ پر لاد کر اتروا تا تھا۔ اسے مہینے کے تین ہزار ملتے تھے۔ ایک ہزار بڑی حقیر رقم تھی لیکن تین کے ساتھ ملتی تو چار بن

جاتی اور آنے میں آلو تیل نمک شامل کرا دیتی تھی۔ مچھندر کو وہ اسکول لے جاتی تھی۔ باقی تین بچے حال بچے یوں ہی گھومتے رہتے تھے۔ وہ زیر تعمیر فلائی اوور کے نیچے جا کر بھیک مانگتے یا سبزی مارکیٹ میں کوئی قدرے گلی سڑی سبزی یا پھل پھینکتا تو اسے اٹھا لاتے۔ بھیک مانگنے والی بات باپ کو نہیں معلوم تھی۔ بارہ سالہ مچھندر دوسری جماعت میں جاتے تھے انھیں کوئی فیس نہیں دینی ہوتی تھی۔ کتابیں بھی مل گئی تھیں لیکن ماں اس قدر گھبرا گئی تھی کہ اس نے مچھندر کو اسکول سے اٹھا لیا۔ کہاں تو وہ سوچ رہی تھی کہ اب ان کے بعد والے دو بچوں کا داخلہ بھی کرا دے گی۔ بس چوتھی اولاد جو ایک جھنگلی بیٹی تھی، گھر پر رہے گی۔ وہ نو برس کی تھی اور مزے میں بھات اُبال کر آلو کا چوکھا بنا لیتی تھی۔

ماں نے کہا۔ لڑکا کم از کم تین چار مہینے نہیں جائے گا۔ پھر چپ ہو جانے لگے۔

مصیبت یہ آن پڑی کہ دو پہر کو مچھندر اور اماں کا کھانا وہیں مل جایا کرتا تھا۔ بس کوئی چھٹی ہوئی تو وہ گھر پر کھاتے تھے۔ اب روزانہ ایک وقت کے کھانے پر یہ دو منہ بڑھ گئے۔

"ممی، موسہرن کیا ہوتا ہے؟" (شہر میں آ کر رہنے کے کچھ دن بعد سے مچھندر ماں کو ممی اور باپ کو پاپا کہنے لگے تھے)۔

"موسہر کی عورت۔" ممی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"موسہر کیا ہوتا ہے؟"

"جو مُوس کھاتا ہے۔" اس نے خلا میں دیکھتے ہوئے مزید بے نیازی سے جواب دیا۔

ہم لوگ مُوس کھاتے ہیں؟ مچھندر کو بڑی حیرت ہوئی۔ یہ جو سامنے سڑک پر تیزی سے فلائی اوور بن رہا تھا اس کے ملبے میں اکثر موٹے موٹے چوہے دوڑتے دکھائی دیتے تھے۔ انھیں تو ایک دن بھی نہیں کھایا گیا۔

"پہلے کھاتے تھے۔"

"کب؟"

"تمہارے پاپا کے دادا جی کے تھے۔ تمہارے پاپا نے بچپن میں کھائے ہیں۔ دادا جی بیٹھتے تھے۔ کھر پتوار جلا کر آگ تیار کرتے تھے۔ جاڑا ہوا تو ہاتھ تاپتے جاتے تھے اور ایک

لوہے کی سریا میں چوہا چڑھا کر اسی الاؤ میں بھونتے جاتے تھے۔ پڑیا میں نمک رکھے رہتے تھے چوہے کا ماس نوچ نوچ کے نمک لگا کے تھوڑا تمہارے پاپا جی کے منہ میں رکھتے جاتے۔ وہ سواد لے کر کھاتے۔ پھر گاؤں میں اتنا ہو گیا کہ کوئی مُوس نہیں کھانے لگا۔ مگر اتنا بھی نہ ہو گیا کہ مُوس نہ کھاؤ پھر بھی سال بھر پیٹ بھر لو۔ بہت سا گاؤں والا باہر بھاگ رہا تھا۔ ہم بھی آ گئے۔"

"تو جب اب مُوس نہیں کھاتے تو موسہر کیسے ہیں۔"

"موسہر ہماری جات ہے۔"

"جات کیا ہوتا ہے ممی۔"

"نہیں جانتے۔ پرکھوں سے سنتے آئے ہیں کہ طرح طرح کی جات ہوتی ہے۔"

مچھندر کو بڑی حیرت ہوئی۔ پر یہاں پٹنہ میں موسہر ٹولہ کہاں سے آ گیا۔

"بھی یہاں بھی موسہر لوگ رہتے ہوں گے یا باہر سے بہت پہلے آ کر بسے ہوں گے۔ ہم تو بس چار پانچ سال پہلے پٹنہ آئے تھے۔ تمہارا چاچا یہاں پہلے سے تھا۔"

"اب ہم مُوس نہیں کھا سکتے کیا؟ کیسا ہوتا ہے مُوس؟"

"ہے بھگوان، یہ لڑکا ہے کہ راکس۔ ہمارا ماتھا کھا گیا۔ چل نکل۔ نکل یہاں سے۔"

اس نے چولہے سے جلتی ہوئی لکڑی نکالی۔ اس کا دماغ کھد بد کھد بد کر رہا تھا۔ آس پاس دوکانیں زیادہ تھیں۔ رہائش مکان کم اور مکین اتنے پیسے والے نہیں تھے کہ نوکر رکھنے کی سوچیں۔ جھاڑو پونچھے کی نوکری بھی دو بھر تھی۔ ہاں درمیان میں فلائی اوور بن رہا تھا۔ ابھی کافی حصہ باقی تھا۔ وہاں وہ کام کے لیے کہہ سکتی تھی۔ شاید مل ہی جائے گا۔ ورنہ یہ ایک ہزار گھر کی ایک چوتھائی آمدنی تھی۔

انھیں دنوں مچھندر نے کہا "ممی چنتا نہ کرو ہم سے ککلئی نے کہا ہے کہ اس کی دوکان پر مدد کریں گے تو بیس روپے روز دے گا۔ سیکھ جائیں گے تو زیادہ پیسہ کمانے لگیں گے۔"

ککلئی سُور پالتا تھا اور ہفتے میں تین دن دو۔ تین سُور کاٹ کے وہیں آس پاس کھلے میں تخت پر رکھ کر ان کا گوشت بیچا کرتا تھا۔

"کیا کرنا ہوگا۔"

"سڑک پر گھسیٹ کر چوکی لا کر بچھائیں گے۔ سور مارنے پھر ٹکڑے کرنے میں مدد

کریں گے۔ جس دن نہیں مارنا ہے اس دن دیکھ بھال کرنا، ہنکا کر باڑے میں بند کرنا۔ کچھ کھانا پانی دینا۔ یہی سب۔ "بھلئی سے اکیلے نہیں ہو پاتا۔ چرتے چرتے جانور دور جل کمبھی بھری کیچڑ میں نکل جاتا ہے۔"

چھندر کی بات، ماں کو زیادہ پسند نہیں آئی۔ راستہ چلتے لوگوں کی نظر سور کے ماس پر پڑتی تو تھو تھو کرتے گزرتے تھے۔ چہروں پر بڑی گھِن ہوا کرتی تھی۔ جو ہندو گوشت کھاتے تھے وہ بھی بالعموم سور سے پرہیز رکھتے تھے مسلمانوں کی تو بات ہی چھوڑ دو۔ لیکن ادھر جو نقصان ہوا تھا اس کی کچھ بھرپائی تو ہو گی، سوچ کر ماں چپ ہو گئی لڑکا کمانے لگا تھا پڑھ کے بھی کیا کر لیتا۔

چھندر میں روپے روز پانے لگے۔ کسی کسی دن بھلئی بچا ہوا یکار سا ٹکڑا بھی اسے دیتا، اس دن گھر کے لوگ زیادہ خوش ہو جاتے۔ وہ چھندر کا بونس ہوا کرتا تھا۔ کچھ دن بعد ماتاجی کو بھی فلائی اوور پر گارا ڈھونے کی نوکری مل گئی۔ دو وقت کی روٹی کا بہ اطمینان انتظام ہو گیا۔ کبھی کبھی دل میں اسکول سے نکالے جانے کی بے عزتی دل میں ٹیس ضرور دے اٹھتی تھی لیکن اب اس پر دھول پڑنے لگی تھی لیکن تبھی "اوپر والے نے کہا کہ تمہاری جات ہی ایسی ہے کہ سب کو تم کھٹکو۔ تو کچھ لوگوں کا ماتھا گھما دیا۔" ایسا چھندر کی ماں کا کہنا تھا۔

کچھ ٹکل اخباروں نے سوائن فلو کی خبریں چھاپیں۔

سور ادھر اُدھر چرا کرتے تھے۔ شہر کے اس علاقے میں سڑک اور دورویہ مکانوں و دوکانوں کے بالکل پیچھے کچھ دور پر کیچڑ کا تالاب تھا جس میں جل کمبھی بھری رہا کرتی تھی۔ جھگی کے اکثر لوگ جو سُلبھ شوچالیہ کے شوچ لیوں میں رفع حاجت کے لیے ایک روپیہ دینا فضول خرچی سمجھتے تھے وہ وہیں جا کر رفع حاجت بھی کر لیا کرتے تھے۔ سوائن فلو کی خبروں کے بعد افواہیں بھی گشت کرنے لگیں۔ لوگوں نے سوروں کو پتھر مار مار کے بھگانا شروع کیا۔ دو چار پتھر بھلئی کو بھی لگ گئے۔ کچھ لوگوں کی بایولاجیکل عمر ان کی حقیقی عمر سے زیادہ ہوتی ہے۔ بھلئی اپنی عمر سے بہت زیادہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ مٹ میلی جلد، سرمئی بال، سفید داڑھی۔ کثیف کپڑے۔ چہرے پر اکثر ایک تنفر کی کیفیت جیسے وہ دنیا کا مشاہدہ کر رہا ہو اور نہایت تنفر کے عالم میں سوچ رہا ہو کہ سالو تم اپنے آسودہ چہروں اور پختہ مکانوں اور اسکول جانے والے بچوں کے باوجود ایک دن میری طرح ہی

مر جاؤ گے۔ بڑے صنعت کاروں، سیاست دانوں وراریں قبیل لوگوں کی بے پناہ دولت کا تو اسے اندازہ بھی نہیں تھا۔ وہ سب اس کے تخیل کی اڑان سے باہر کے لوگ تھے۔

تو سوروں کے ساتھ بھلئی کو بھی دو چار پتھریوں لگ گئے کہ وہ انھیں ہنکا کر کہیں دور لے جانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ بھلئی گرا تو لوگ بھاگ گئے لیکن دو چار دن بعد میونسپلٹی والوں نے سوروں کو پکڑ کر شاید انھیں ضائع کر دیا۔ بھلئی کو ایک معمولی سی رقم سرکار کی طرف سے ملی لیکن وہ کوئی اور دوسرا کام کرنا جانتا ہی نہیں تھا۔ کچھ دن میں اس رقم کو کھا پی کر ادھر اُدھر کوڑا اچھتا گھومنے لگا۔ ادھر چھندر کی اماں کے یہاں نئے بچے کی آمد آمد ہوئی۔ ابھی شروعات ہی تھی لیکن پانچ چھ کچے پکے بچے پیدا کرنے اور سخت جسمانی محنت کرنے کی وجہ سے اس بار شروع سے ہی اس کا جسم بھاری لگنے لگا تھا۔ وہ دن رات شوہر کو کوستی جو نس بندی کے نام سے بدکتا تھا اور کنڈوم کے استعمال کو بدعت جانتا تھا۔

چھندر کی عمر اب ڈیڑھ دو برس آگے بڑھ چکی تھی اور گھر میں کچھ پیسہ آنا بہت ضروری ہے یہ ان کی سمجھ میں آنے لگا تھا۔

تبھی اماں نے ایک عورت سے بات کی جس کا بیٹا کچھ اور دور پر واقع میدان میں بہت ہی سستے کپڑے بیچا کرتا تھا۔ وہ چھندر سے تھوڑا سا بڑا تھا۔

کچھ پونجی تو چاہیے ہو گی۔ اس عورت نے کہا۔ چھندر نے کچھ بچا یا نہیں؟ بھلئی کے ساتھ سور کا کام کرتا تھا۔

چھندر وہیں تھے۔ چٹ سے بولے۔ اماں سب لے لیتی تھی۔ ہاں کوئی ڈیڑھ سو روپے ہم نے چرا کر رکھے تھے۔ وہ نکال لیں گے۔

"اچھا کچھ ہم اُدھار دلوا دیں گے۔ وہیں میدان پر ہی ایک آدمی آتا ہے جو اُدھار بیچ دیتا ہے۔ مگر جلدی ادا کر دیجیو نہیں تو سود بہت لگ جائے گا"

دو دن سوچنے کے بعد ماں بیٹا راضی ہو گئے۔

چھندر نے پھول کمار کے ساتھ نِٹ ویر (Knitwear) کی سستی چیزیں بیچنی شروع کیں، زیادہ تر بچوں اور نوعمر لڑکیوں کے لیے۔ ایسے کئی لڑکے اور تھے۔ یہ میدان میں کنارے

کنارے اپنا سامان لگاتے تھے۔ پھر آئس کریم کے ٹھیلے، سبزی اور پھل فروش بیٹھتے تھے۔ کچھ بڑے بڑے خونچوں میں چنے مرمرے بھی رکھتے تھے۔ سب کی روزی روٹی چل رہی تھی لیکن کپڑے والے بڑا شور مچاتے تھے۔

لے لو پچیس۔ ایک دام پچیس

کوئی بھی اٹھالو۔ پچیس

نیلا پچیس پیلا پچیس۔ ہرا پچیس لال پچیس

آئے ہائے پچیس۔ اوئے ہوئے پچیس

عموماً ان کی آوازیں اس قدر سدھے ہوئے ڈھنگ سے اٹھتی اور گرتی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا تربیت پائے ہوئے گلے سے نکل رہی ہیں۔ ان کی آپس میں کسی سے کوئی مخاصمت نہیں تھی۔ گاہک ایک کے پاس سے دوسرے تک سرک جاتا تو وہ بڑبڑاتے بھی نہیں تھے۔ مچھندر نے بہت جلدی گلا پھاڑ پھاڑ کے چلّانا اور سُر میں سُر ملانا سیکھ لیا۔ گرمیوں میں لو سرائی پھرتی۔ سب ساتھ ایک ایک بوتل پانی رکھتے تھے۔ جن کی بکری اچھی ہوتی وہ ٹھنڈے پانی کے ٹھیلے والے سے ایک روپے کا ٹھنڈا پانی لے کر بوتل میں ملا لیتے تھے۔ زیادہ گرمی میں دوکانیں سہ پہر سے لگتیں دن ڈھلتا تو گاہک زیادہ آتے۔ اس بازار کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں بہت غریب ہی نہیں، نچلے متوسط طبقے یا متوسط طبقے کو چھوتے ہوئے لوگ بھی آجایا کرتے تھے۔ کیوں کہ سبزیاں اور پھل بچے ہوئے بازاروں کے مقابلے سستے ملتے تھے اور دو ایک چاٹ کی دوکانیں مشہور تھیں۔ پچیس روپے ایک دام والے کپڑے تو غریب غربا ہی خریدتے لیکن کچھ غریبی ریکھا سے اوپر کی لڑکیاں بھی خریداری کرتی دکھائی دیتیں۔ ڈھیر میں ڈبکی لگانے پر کبھی کبھی اتنے کم داموں میں بھی کوئی کُرتی (top) مل جاتی تھی جو اتنی گھٹیا نہ لگتی (دراصل یہ کمپنی کا 'سیکنڈز' کا مال ہوا کرتا تھا۔ بہت معمولی سے نقص کی وجہ سے ردّ کر کے کوڑیوں کے مول فروخت ہونے والا)۔ بقول ان لڑکیوں کے ایک مہنگا آئٹم خرید کر پیسے سوارت لگانے کے لیے کھینچتے رہنے میں بوریت بھی تھی اور اپنی کم مائیگی کا اعلان بھی۔ اس کی بجائے دو یا دو سے بھی زیادہ سستی چیزیں لے لیں اور مزے سے کچھ دن پہن کر پھینک دیں۔ پھر کچھ دوکانیں تھیں جن کا نعرہ تھا ہر مال ملے گا سو (۱۰۰) روپے۔ ظاہر

ہے ان کا سامان بہتر تھا۔ ان کے یہاں جینز اور پلازو پاجامے بھی مل جاتے تھے۔ یہ دوکانیں زمین پر ترپال بچھا کر نہیں لگتی تھیں بلکہ ان کے کھوکے تھے۔

مچھندر نے سنا، ذرا ہٹ کر ایستادہ کھوکے پر دو لڑکیاں کچھ دام کم کرنے کے لیے بحث کر رہی تھیں۔ دوکان دار بھی ایک نوجوان لڑکا تھا۔ مسکرا کر بولا، سو پچاس روپے کی تو آپ لوگ چاٹ کھا کے ڈکار بھی نہ لیں گی۔ یہاں سو روپے میں پینٹ مل رہی ہے تو پیسہ کم کرا رہی ہیں۔ پڑھی لکھی ہیں دیکھئے نا لکھا ہے ہر مال ملے گا سو روپے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دام۔ "ہاں یار۔ ایک لڑکی نے کچھ سوچ کر کہا۔ یہ بیچارے لُو دھوپ میں چلا چلا کر سامان بیچ رہے ہیں۔"

سستا لینا ہے تو ہمارے پاس آیئے۔ ہر مال پچیس۔ پھول کمار نے کہا۔ مچھندر نے مصرعہ اٹھایا۔ ہر رنگ پچیس، ہر ناپ پچیس۔ "پچیس روپے جی پچیس۔" اور آوازیں بلند ہوئیں۔

مچھندر بولے پچیس روپے کلو تو پیاز بک رہی ہے۔ ہم نے تو پیاز روٹی کھانی چھوڑ دی۔ پہلے دال سبزی نہ ہوتی تو پیاز ہی کھا لیتے تھے۔

اب کیا کھاتے ہو؟ لڑکی ہنسی۔ پھر دھیرے سے بولی "کیا اسٹریٹ اسمارٹ لونڈا ہے۔"

"نمک روٹی"۔ مچھندر نے کہا۔ اور بھات اور بھونی مرچ۔

جلدی کر۔ اس لڑکی کی سہیلی نے ٹہوکا دیا۔ economic سروے پھر کرے گی۔

لڑکیاں پھر کپڑے اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگیں۔ مچھندر اور ان کے دوست حلق پھاڑ کر پھر آوازیں بلند کرنے میں مصروف رہے۔

تبھی ایک ماں بیٹی قریب آئیں۔ ماں زیادہ عمر کی نہیں تھی اور خاصی چھمک چھلو لگ رہی تھی۔ بچی کوئی تیرہ چودہ برس کی رہی ہوگی۔ دو لانبی چوٹیاں سامنے پڑی تھیں۔ اونچی سی فراک پہن رکھی تھی۔ مچھندر کے دوست نے آنکھ ماری۔

بہن جی پچیس، ماں جی پچیس۔

لڑکیاں زیرِ لب مسکرائیں اور کپڑے چھانٹتی رہیں۔

ایک دوسرا لڑکا چلایا۔ ارے بڑھیا پچیس، بچیا پچیس۔

لے لو پچیس، آئے ہائے پچیس۔

خبردار جو بدتمیزی کی ہے۔ ایک بڑی زرا چیخی۔

بدتمیزی کیسی میڈم۔ دیکھیے دیکھیے۔ اس نے ایک چھوٹی بچی کے سائز کی خوش رنگ اونچی سی اسکرٹ اٹھائی۔ کوئی دو بالشت بھر۔ پھر ایک بلاؤز اٹھایا بہت ہی چیکیلے رنگ کا۔ ساڑی پر پہنا جانے والا۔ دیکھیے بچیا پچیس، بڑھیا پچیس۔ دونوں پچیس۔ دونوں پچیس۔

''ہم سب سمجھتے ہیں۔ کسی دن پٹ جاؤ گے۔ چلو یہ پکڑو دو سو روپے۔ چار ہم نے چھانٹ لیں اور چار اس کی ہیں۔''

اس نے سو سو کے دو نوٹ بڑھا دیے۔

''لے جاؤ پچیس۔ اٹھا لو پچیس۔'' لڑکیاں میلے سے پونی تھین کے تھیلے میں ڈالی گئی گتھیاں اٹھا کے چلنے کو ہوئیں۔

''ارے ہم سو دینے کو تیار ہیں'' ایک لڑکے نے جو چھندر سے بڑا کوئی سترہ برس کا تھا۔ لڑکیوں کی طرف نہایت بے ہودہ انداز سے دیکھ کر کہا۔

ابے چپ۔ چھندر کے ساتھی نے کہا۔ کوئی گاہک بگڑ گیا تو اچھا نہ ہوگا۔

اسی وقت ایک قربت آشکار شخص اپنی پھٹے حال بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رک گیا تھا۔ اس نے چھندر کی طرف نگاہ غلط انداز ڈالی اور آگے بڑھنے لگا۔

ارے یہاں بھی پچیس، وہاں بھی پچیس۔

لے لو پچیس، سو''' والے پچیس

چھندر کی آواز بیٹھ چکی تھی انھوں نے بوتل سے نکال کر پانی پیا۔ پانی بھی خاصا گرم تھا۔ وہی پانی انھوں نے چہرے پر ڈالا۔

گرمی تو سسری بڑھتی جائے گی۔

کچھ دنوں بعد گرمی واقعی شباب پر پہنچ گئی تھی لیکن چند ٹکے کمانے کے لیے کچھ لوگ سویرے ہی اپنی دکانیں لگا لیا کرتے تھے اور دوپہر کے لیے کچھ ڈنڈے وڈنڈے کھڑے کر کے بوری ڈال لیتے تھے۔ کچھ بڑے بڑے چھاتوں کی اوٹ میں بیٹھتے تھے۔ بیل اور آم کے ٹھنڈے شربت کی خوب بکری تھی تبھی لوگوں نے ایک نیا نظارہ دیکھا۔

وہ پتہ نہیں زمین سے اُگے تھے کہ آسمان سے آئے تھے۔ مگر آئے ضرور تھے۔

وہ بہت بڑے بڑے بل ڈوزر تھے اور ان کے ساتھ بہت سے آدمی تھے۔ انھوں نے زرد رنگ کے ہیٹ پہن رکھے تھے اور ہاتھ میں نہ جانے کیا کیا اوزار پکڑ رکھے تھے۔ چھندر کو معلوم ہوا کہ یہ زمین سرکاری تھی۔ بہت عرصے سے خالی پڑی تھی۔ اب یہاں بہت بڑا میوزیم بننے والا تھا۔ چھندر کو اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میوزیم کے لیے چار سو کروڑ کی رقم مختص کی گئی تھی۔ انھوں نے اسکول میں جو گنتی سیکھی تھی وہ ایک ہزار سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی اور ایک ہزار کا تصور بھی انھیں تھا کہ اماں کو ایک ہزار تنخواہ ملا کرتی تھی۔ باپ کو تین ہزار۔ اب بزنس چل نکلا تھا تو اس مہینے ان کی بچت ہر مرتبہ سے زیادہ ہو کر ایک ہزار ہو گئی تھی اور اماں نے آنچل کی ہوا کر کے ان کا منھ چوما تھا لیکن دو چار ہزار سے آگے کی رقم کتنی ہوتی ہے یہ وہ نہیں جانتے تھے۔

''میوزیم کیا ہوتا ہے؟'' چھندر نے سوال کیا۔

''جادو گھر'' لال بجھکو نے جواب دیا۔

''پٹنہ میں ایک جادو گھر تو تھا۔'' چھندر نے بہت سوچ کر کہا۔ وہ جب ننھے ننھے تھے تو ان کے کنبے کو پٹنہ بلانے والا رشتہ دار جادو گھر دکھانے بھی لے گیا تھا۔ ''ٹوٹ گیا کیا؟''

''نئے ہے'' لال بجھکو نے جواب دیا۔

''پھر اور کیوں؟''

''اے میں بیٹا سب اپنی اپنی اماں کو بیٹھا دیں گے۔'' لال بجھکو بیچ سے تھوکتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اتنی بڑی رقم میں کتنا شوچالیہ ہو سکتا تھا، روڈ درست ہو سکتا تھا، اسکول کا رشا سدھر سکتا تھا۔ وہ بڑبڑاتے جا رہے تھے۔ یہ دیکھو۔ یہ دیکھو سالا کھلے میں موت رہا ہے۔

جادو گھر میں کسی کی اماں کو بٹھایا جا سکتا ہے یہ چھندر کی سمجھ میں نہیں آیا۔ انھیں اپنی روٹی کی فکر ہو گئی تھی۔ انھوں نے چھوٹے دونوں بھائیوں کو اسکول بھجوانے کی سوچ رکھی تھی ان کا اسکول تو چھوٹ ہی گیا تھا (اب وہاں ایک کٹنگ ذات کی عورت کھانا بنا رہی تھی۔ وہ ہر بچن بچوں کو دور سے ان کی پلیٹ پر کھچڑی گرا دیتی تھی۔ تھپ کی آواز کرتی کھچڑی کبھی کبھی نشانہ چوک جانے پر پلیٹ کے مل جانے سے پلیٹ سے الگ بھی گر پڑتی تھی۔ تب وہ دوبارہ کھچڑی کے ساتھ گرم گرم

گالیاں بھی کھاتے تھے جو بطور اچار وہ بدمزاج عورت پروس دیتی تھی)۔ کوئی بات نہیں، بھائی کچھ پڑھ تو لیں گے۔ اب کم از کم انھیں موٹا حساب جوڑنا تو آ گیا تھا۔ راستوں کے ہندی میں لکھے سائن بورڈ پڑھ لیتے تھے۔ کہیں ہندی کا پھٹا اخبار دکھائی پڑ گیا تو اٹھا کر سرخیاں پڑھنے لگتے تھے۔

رپھائنل۔ دھت تیری سسریہ رپھائنل کون چیز ہے۔

ایک سرخی تھی۔ ہم نے گھر میں گھس کے مارا۔

''ارے کون مارا۔ کس کو مارا؟'' جگی جھونپڑی والے لڑتے تھے تو آس پاس کے لوگوں نے پولیس میں رپٹ لکھوادی کہ بڑا بلوا کرتے ہیں شانتی بھنگ کرتے ہیں اب یہ مرد کون کس کو مار رہا ہے۔ ہے کوئی رپٹ لکھانے والا۔ جگی میں تو گھر میں گھس کے مارتے بھی نہیں تھے۔ سڑک پر لڑتے تھے۔ گھر میں مارا تو آدمی نے اپنی عورت کو مارا۔ اس پر بولنے کا تو کسی کو ادھیکار نہیں۔

مچھندر کافی پریشان ہو گئے۔ لیکن پھر ایک گاہک کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اب تو گاہکوں کا توٹا پڑنے والا تھا۔ اور واقعی جیسے جیسے کنسٹرکشن کا کام شروع ہوا، دوکانیں ہٹائی جانے لگیں اور دو ہفتے کے اندر سب چلی گئیں صرف چاٹ اور آئس کریم کے ٹھیلے آس پاس رہ گئے۔ جب مچھندر کی اماں نے کام شروع کیا تھا تو فلائی اوور میں پہلے ہی کافی کام ہو چکا تھا۔ تبھی اسے بھی جواب مل گیا۔ صرف مچھندر کے باپ کی دوکان کی نوکری بچتی تھی۔ گھر میں ایک چھوٹا بچہ بھی بڑھ گیا تھا۔ جو اب چلنے کی کوشش کرنے لگا تھا اور جو ملتا منھ میں ڈال لیتا۔ اس کی بھوک سب سے زیادہ تھی۔

ماں بیٹا دونوں جادو گھر کے مزدوروں میں شامل ہو گئے۔ لیکن جادو گھر کے لئے جو ٹھیکے دار مزدور سپلائی کرتا تھا وہ ان سب سے روزانہ مزدوری کا دس فی صد لے لیا کرتا تھا۔ ذرا سی بھی احتجاج کی آواز سے اس کا پارہ چڑھ جاتا تھا۔ ایک بار اس نے ایک عورت کو ایسی کینہ توز نظروں سے گھورا تھا کہ وہ دوسرے دن کام پر ہی نہیں آئی۔ تیسرے دن اس کا شرابی شوہر اسے دھکے دے کر خود ہی پہنچا گیا اور ہاتھ جوڑ کر ٹھیکے دار سے بولا۔ صاحب تم اپنا پیسہ شوق سے کاٹو اب مجال نہیں کہ یہ بولے۔ صوبے میں شراب بندی ہو گئی تھی اور شراب بندی ہونے کی وجہ سے شراب مہنگی ہو گئی تھی، بند نہیں۔ پولیس کے نچلے درجے کے اہل کار پہلے سے زیادہ پینے لگے تھے اس لیے کہ جہاں کہیں بھی شراب کے بکسے پکڑے جاتے ان کا ساٹھ فی صد ان کے ذاتی اسٹاک میں چلا

جاتا تھا۔ اب یہ دس پرسنٹ تو کچھ نہیں تھا بھائی۔ یہاں تو سارا ریاضی پرسنٹ پر ہی ٹکا ہوا لگتا تھا۔

مچھندر کی ماں چار بیٹوں اور دو ساقط ہو جانے والے نامکمل بچوں کے باوجود بڑی گٹھی ہوئی تھی۔ پندرہ برس کی عمر میں پہلا بچہ پیدا ہوا تھا۔ ارے یہی مچھندر۔ وہ اب پندرہ کا تھا۔ تو اس کی جو عمر ہوئی اس عمر میں تو بڑے شہروں میں لڑکیاں چھتا سانڈ بنی گھوم رہی ہیں کسی کو پر نہیں مارنے دیتیں کہتی ہے ہمیں چاہیے ہی نہیں لیکن مچھندر کے گاؤں میں تو اب بھی لڑکیاں اٹھارہ سے پہلے بیاہی جاتیں اور بہت سے بہت اٹھارہ میں ماں بن جاتی تھیں۔

ایک دن ایک آدمی نے اس کی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑی لگاوٹ والی مسکراہٹ اس پر چھینکی۔ سولہویں برس میں موبائل پر گھٹیا ویڈیو دیکھ دیکھ کر مچھندر بہت کچھ جان گئے تھے انھوں نے ایک ادھا اٹھا کے اس پر دے مارا۔ مچھندر کی ماں نے سر پیٹ لیا۔ ارے وہ اس سے اپنے طور پر نمٹ لیتی یہ کیا کر دیا لونڈے نے۔ خیریت ہوئی کہ ادھا اس کے سر پر نہیں پڑا۔ صرف پنڈلی پر نکل ، دیتا گزر گیا۔ تھوڑے دن لنگڑانے کے بعد ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن مچھندر اچھی طرح پٹے اور اماں اور دونوں بھگا دیے گئے۔ اس دن دو تہائی کام ہو چکا تھا لیکن انھیں مزدوری بھی نہیں دی گئی۔

اب روٹی پھر گول گول آگے آگے بھاگ رہی تھی اور مچھندر اس کے پیچھے دوڑتے ادھر ادھر دیکھتے جاتے تھے کہ کہیں وہ پھر تو نہیں آ رہے لیکن فی الحال وہ ایکشن میں مصروف تھے۔

OOO

لگژری کار کے باہر

رم جھم نے درخت کے نیچے کی نرم زمین پر لکیریں کھینچ کر اکلی ڈکلی کھیلتی بچیوں پر نظر ڈالی۔

''اس کا دودھ بھات'' بڑی لڑکی نے نرمی سے تین سالہ بھائی کا ہاتھ پکڑ کر اسے پالے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ چھوٹی نے اثبات میں سر ہلایا اور مسکرائی۔

بیٹیاں سمجھتی ہیں کہ وہ کچھ 'اسپیشل' ہے۔ رم جھم نے بڑی طمانیت سے سوچا۔ ایک نظر چھتنار برگد کے نیچے کھیلتے بچوں پر ڈال کر جھونپڑی کا فرش اور اوسارا لیپنے میں مشغول ہو گئی۔ یہ کام کئی دن سے التوا میں پڑا ہوا تھا۔ اسے فرش لیپنے اور چولہے پر مزید مٹی چڑھانے کے لیے صاف، گوری مٹی کی ضرورت تھی جو وہ لا نہیں پا رہی تھی۔ گاؤں میں تو ہر طرح کی مٹی کی بہتات تھی۔ یہ شہر تھا۔ وہ بھی بڑا شہر۔ ایک صوبے کا نامی گرامی صنعتی مرکز۔ یہاں ایسی ایسی کالونیاں تھیں جنھیں گاؤں سے آنے والے تو کیا، اوسط درجے کے شہروں والے بھی پہلی بار دیکھتے تو ہکا بکا رہ جاتے۔ ہسپتال تھے جو فائیو تو کیا سیون اسٹار ہوٹلوں سے ٹکر لیتے تھے۔ عورتوں کے لیے مخصوص ایک ہسپتال کا نام ایتھینا (Athena) تھا۔ شاید اس میں جانے والے لوگ اس دولت مند اور تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو یونانی صنمیات سے تعلق رکھنے والی اس دیوی سے واقف ہوگا۔ پھر اسکول تھے جو رم جھم تو کیا متوسط طبقے کو بھی آنکھیں نکال کر دھمکاتے تھے، خبردار جو ہمارے اندر قدم رکھا ہے تو— یہاں وہ مٹی کہاں جو ہندوستان جنت نشان کی باؤنڈری لائن ہے۔

بچے ایک دوسرے کو دوڑا دوڑا کر کھیلنے میں مشغول تھے۔ ان کی قلقل مینا سی ہنسی کھلے آسمان تلے اپنے بل بوتے پر اُگ آنے والے درختوں، جھاڑیوں اور پودوں کے خوش رنگ

پھولوں پر منڈلاتی تتلیوں کے خوش نما پروں پر سوار ہو کر فضا میں بکھر بکھر جاتی تھی۔ ایسی ہنسی کون ہنستا ہے؟ فرشتے؟ وہ بھی شاید صرف اسی وقت جب وہ کسی انسان کو بے غرض نیکی کرتے دیکھ پاتے ہیں۔

کل دونوں لڑکیوں کو پکڑ کر ان کا سر دھلانا ہے۔ رم جھم نے فرش لیپتے ہوئے سوچا۔ اس کی ہتھیلیاں سرخ ہو گئی تھیں۔ گوری مٹی کے لیپ کے نیچے سے بھی ان کی سرخی دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے دھوپ اور تمازت میں تپے ہوئے سانولے رنگ کے نیچے سے اس کی جلد کا اصل گندمی سنہرا رنگ کبھی کبھی جھلک جاتا تھا۔

سر دھلانے کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے خیال آیا کہ شیمپو کے 'پوچ' ختم ہیں۔ وہ صرف نصف درجن لائی تھی۔ ہمیشہ ضرورت کے مطابق ہی لاتی ہے۔ لڑکیوں کے بالوں میں دو دو لگ جاتے ہیں۔ بلکہ ایسا کیچڑ جیسا جھاگ بنتا ہے کہ ایک اور استعمال کیا جائے تو زیادہ ٹھیک رہے۔ لڑکے کے لیے صابن ہی ٹھیک رہتا ہے۔ مرد کو اتنے تام جھام کی کیا ضرورت۔ وہ ہر حال میں مرد رہتا ہے۔ اب اسی کو دیکھ لو۔ وہ تیل لگا کر چوٹی گوندھ کر رکھتی ہے اور اس کے شوہر کے بال کھردرے، الجھے، پسینے میں بھیگ کر ماتھے پر جھک آتے ---- وہ ایسے ہی اچھا لگتا ہے۔ بے چارے کو موقع بھی نہیں ملتا کہ ساج سنگار کرے۔ اس کے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ آئی۔ دلہن بنے شوہر کا چہرہ نظروں میں گھوم گیا۔

رم جھم کی جب شادی طے ہوئی تھی تو ہلدی والے دن گاؤں کے پرائمری ہیلتھ سنٹر پر کام کرنے والی آشا دیدی نے اسے چھوٹے کنبے کے فائدے بتائے تھے اور کنبہ چھوٹا رکھنے کے طریقے بھی بتائے تھے۔ شرم سے سرخ چہرہ لیے رم جھم سر جھکائے سنتی رہی تھی اور سوچا تھا، بات تو ٹھیک ہی لگتی ہے لیکن جب دوسری بھی لڑکی ہی ہوئی تو اس نے سوچا کم سے کم ایک بار تو اور دیکھ لینا ہے۔ گاؤں کے پیر صاحب سے تعویذ بھی لے آئی۔ واقعی بیٹا ہو گیا۔ پہلے خیال نہیں کیا ورنہ ایک ہی کے ہو جانے پر ہی تعویذ لے آتی۔ خیر وہ خوش تھی۔ کھینچ تان کر گزارا ہو جاتا تھا۔ شہر میں کوئی بھوکا نہیں سوتا۔ اس کا کنبہ بھی کبھی بھوکا نہیں سویا تالہ بندی کے زمانے میں بھی نہیں۔ اور انھیں گاؤں بھی نہیں جانا پڑا جب کہ خود اس کی آنکھوں کے سامنے سے ننگے پیر، خستہ حال، بے یار و

مددگار انسانوں کا سیلاب گزرا۔ انھیں دیکھ کر وہ کانپ کانپ جاتی تھی۔

لاک ڈاؤن سے اس کے کنبے کے متاثر نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس کا شوہر کسی فیکٹری یا کسی ایسی جگہ کام نہیں کرتا تھا جو بند ہو گئی تھی۔ جھونپڑی سبزی کی بہت بڑی منڈی کے پیچھے تھی۔ بلکہ وہاں سوچ سمجھ کر بنائی تھی۔ یہاں کسان سیدھے کھیتوں سے لا کر پھل اور ترکاریاں بیچا کرتے تھے اور خود ان کے کارندے انھیں فروخت کرنے پر مامور رہتے تھے۔ بڑے بڑے المونیم کے بھاری ٹب پانی سے بھر دیے جاتے تھے اور ان میں ہری پتے دار سبزیاں دھو دھو کر نکالی جاتی تھیں۔ دیگر ترکاریاں لے کر آتے تو انھیں اتارنے اور دھونے کے کام پر جو لوگ مامور تھے ان میں رام جھم کا شوہر بھی تھا۔ اب سبزی ترکاری کے بغیر تو زندگی چلنے کی نہیں۔ یہ ضرور تھا کہ اب صاحب اور ان کی بیویاں جو گاڑی لے کر خود بھی آ جایا کرتے تھے صرف ملازموں کو بھیجتے تھے۔ محض ضرورت کے تحت لوگ نکل رہے تھے اور رام جھم جو کولونی کے کچھ نہایت اعلیٰ درجے کی رہائش گاہوں میں سے کچھ کے یہاں مالش کر کے زائد پیسے کما لاتی تھی، وہ آمدنی ختم ہو گئی تھی۔ پھر ایک بڑا عرصہ، دوسرا لاک ڈاؤن، وہ بھی گزر گیا۔ زندگی تقریباً معمول پر واپس آ گئی۔ بڑی بڑی گاڑیاں پھر آ کر لگنے لگیں۔ خود خریداری کرنے کا لطف ہی الگ ہے۔

ہاں، اسے بھی مرگا لانے جانا ہوگا۔ آج مرگا بھات کا پروگرام تھا۔ بہت دن کے بعد اس نے بچوں کو بتایا تو بہت خوش ہو گئے۔ اب تو لڑکا بھی تین کا پورا ہو کر چوتھے میں لگ گیا ہے۔ وہ بھی سمجھتا ہے مرگے کا ذائقہ۔ وہ مالش کے پیسے الگ رکھا کرتی تھی۔ کئی بار شوہر زبردستی پیسے لے لیتا تھا۔ لیکن ہمیشہ نہیں۔ پیسے وہ اڑاتا نہیں تھا۔ گاؤں میں ماں باپ کو بھیجتا تھا۔ اپنے پیسوں سے اس کے بہت کام نکلتے تھے۔ وہ مرگی کے ساتھ شیمپو کے پوچ بھی لانے لگی۔ نئی بزنس اسٹریٹجی نے چھوٹے چھوٹے پیکٹ بنا کر ہر چیز گاؤں دیہات کے غریبوں تک پہنچا دی ہے۔ جو کھلی اور مٹی سے سر دھوتے تھے وہ شیمپو سے سر دھونے لگے۔ سب بڑے لوگ شیمپو لگاتے ہیں۔ جن اعلیٰ درجے کے صاحبوں سے ان کے کپڑے دھلتے ہیں اب ان صاحبوں کی چھوٹی چھوٹی پڑیاں بھی عام ہیں۔ کوئی اچھا کپڑا ہوا، ایک پڑیا لا کے دھو لیا۔

اس نے ایک نظر پھر کھیتے بچوں پر ڈالی۔ لڑکیاں بہت چھوٹی ہیں۔ بڑی چھ برس کی،

[illegible]

بھی ذکر، جو اس کا واحد لباس تھا، اسے گلے سے لگا کر پیار کرنے لگیں۔ اتنی دور سے وہ تو سنائی نہیں دے سکتا تھا جو وہ کہہ رہی تھیں ---- رو نہیں، آج بھی کھانے کو مزہ کا بجات دے گی۔ لیکن بچہ جلدی سے آنسو پونچھ کر ہنسنے لگا تھا یہ ضرور دکھ میں آیا۔

گاڑی کے اندر ان کا چودہ پندرہ سالہ بیٹا بیٹھا مستقل ٹھن ٹھن کیے جا رہا تھا۔ اس نے اپنا پڑا کا بکس کھول رکھا تھا جو پچھلے پڑاؤ پر آٹھ سو روپے میں خریدا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید کبیدگی کے آثار تھے۔ کئی بار کہا کہ ہمیں اترنے دیجیے ہم خود اٹھائیں گے۔ بھیج دیا ڈرائیور کو۔ ہمیں زیادہ چیز ڈلوانا تھا۔ راستے میں کہیں سے دوسرا لے کر دیجیے۔

ان گندے بچوں پر ایک آخری نظر ڈال کر انھوں نے قدرے اطمینان کی سانس لی۔ کیوں کہ گاڑی ذرا سا رینگی تھی۔

○○○

کمینہ

اس کی صورت دیکھ کر ہی غصہ آتا تھا لیکن صورت روز دیکھنی پڑتی تھی اس لیے کہ وہ اس بلڈنگ کی صفائی پر مقرر تھا۔ بلڈنگ زیادہ بڑی نہیں تھی پھر بھی سولہ فلیٹ تھے، پارکنگ تھی، ایک خاصا بڑا کامن ایریا تھا۔ اس کے ساتھ صرف ایک معاون لڑکا اور تھا لیکن وہ عموماً اوپر نہیں آتا تھا۔

اس کی صورت دیکھ کر غصہ آنے میں اس کی حرکتوں اور لباس کا بڑا دخل تھا۔ رہی صورت تو خیر وہ اللہ کی بنائی ہوتی ہے اب اللہ میاں پہ کون غصہ کرے۔ کہا جاتا ہے کہ جب شیر شاہ ملک محمد جائسی کی صورت دیکھ کر ہنسا تھا تو انھوں نے کہا تھا "مجھ پر، اوپر ہنس رہا ہے کہ کمہار پر" لیکن صورت کے علاوہ بھی کچھ ہوتا ہے جو اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جاڑے کا موسم چھوڑ کر باقی دنوں میں وہ وہ چیختے چلاتے رنگوں کا گہری کٹی آستینوں کا بنیان اور لمبا سا ڈھیلا ڈھالا نیکر پہنے رہتا جو عموماً زمین کی رنگت ہوتا۔ بنیان البتہ نہ صرف صاف ہوتا بلکہ ہر دوسرے تیسرے دن ایک نیا ہی نظر آتا تھا۔ منگل کے روز فٹ پاتھ پر لگنے والے سستے کپڑوں کے بازار سے وہ کئی عدد اٹھا لایا کرتا تھا اور بدل بدل کر پہنتا رہتا تھا۔ ایک کان چھدوا رکھا تھا اس میں سرخ موتی پڑا ہوا چاندی کا ذرا اس کا 'اسٹائل اسٹیٹمنٹ' (style statement) تھا۔ محض سولہ سترہ سال کی عمر لیکن تمباکو کی عادت۔ اس حلیے بشرے کے ساتھ وہ کوئی صبح دس سے گیارہ بجے کے درمیان ہر فلیٹ سے کوڑا اکٹھا کرنے کے لیے گھنٹی بجاتا تھا۔ دروازہ کھلتا تو دروازہ کھولنے والے کو وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے پان چباتا ملتا۔ باچھوں میں پیک بھری ہوئی ہوتی۔ اس کے پاس ایک بہت بڑی سی چوکور بالٹی ہوتی جس میں چھوٹے چھوٹے پہیے لگے ہوئے تھے۔ ہر منزل پر وہ اسے کاندھے سے اتار کر

رکھ لیتا اور کوڑا اکٹھا ہو جاتا تو اگلی منزل کے لیے کاندھے پر رکھ کر کسی بندر کی سی پھرتی سے سیڑھیاں چڑھ جاتا۔ چوں کہ بلڈنگ صرف چار منزلہ تھی اس لیے اس میں لفٹ نہیں تھی۔

کبھی کبھی اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوتا تو اس کا باپ اس کی جگہ آ جاتا تھا جو کبھی کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ اس کا حلیہ بشری قدرے بہتر تھا۔ پھر وہ ہر وقت پان نہیں چباتا تھا، نہ کان میں ذر پین رکھتا تھا نہ بیٹے کی طرح الٹی سیدھی انگریزی بولتا تھا۔ ہاں اس کی بیوی کا کہنا تھا کہ وہ بیوی اور بیٹے کی کمائی چھین کر اس کا بڑا حصہ شراب میں اڑا دیا کرتا تھا۔ صوبے میں شراب بندی کے بعد وہ شراب لے کر کہاں سے آتا تھا اس سے اس کی بیوی کی عقل حیران تھی گرچہ وہ تھوڑی سی تفتیش کرتی تو اسے پتہ چل جاتا کہ علاقے کے تھانے میں جو شراب ضبط ہو کر آتی وہ دو گنے سے لے کر چار گنے داموں میں وہیں سے سپلائی بھی ہو جاتی تھی۔

لونڈے کی انگریزی سے مسز عباسی کو پتنگے لگتے تھے گرچہ وہ عموماً کچھ کہنے سے گریز کرتی فقط زیر لب ایک آدھ مہذب گالی دوہرا لینے کے لیکن بغل والے فلیٹ کے تواری خاندان کی نوجوان بہو وریشا اس کے منہ پر ہی بے تحاشا ہنسنا شروع کر دیتی جسے وہ قطعی خاطر میں نہ لاتا۔ ایک دن اس نے یوں ہی پوچھ لیا: "ارے بہت دن سے تیرا باپ نہیں آ رہا۔" اس نے سر کھجایا۔ پان سے کتھئی پڑتے ہوئے دانت دکھائے اور جواب میں ایک مختصر سا سوال کیا "کون؟"

"ارے تیرا باپ۔ باپ نہیں سمجھتا کیا؟"

"اوہ، ڈیڈی۔ ڈیڈی ناٹ کمنگ۔ ڈیڈی گونگ گیا۔"

"کیوں ناٹ کمنگ؟" وریشا کی ہنستی ہوئی آنکھوں میں شرارت جھانکی۔

"گونگ گیا۔ ڈیڈی کے ڈیڈی کا پنڈ دان۔"

اب سمجھ میں آیا۔ اس کا باپ اپنے آں جہانی باپ کا شرادھ کرنے گیا ہوا تھا۔ اس نے جھنجلا کر کچن کے کچرے کی بالٹی اس کے ڈرام میں جھٹکے کے ساتھ الٹی اور زیر لب بڑبڑائی۔ اب ان لوگوں کے یہاں بھی شرادھ ہونے لگا۔ ہر چیز میں برابری کریں گے۔

"بھابھی وہاٹ سینگ۔" (Bhabhi, what saying?)

اب کی وریشا کو جیسے بچھو نے کاٹ کھایا۔ وہ کنبے میں نئی نئی شامل ہوئی تھی ایک صفائی

[illegible]

[illegible] (eating paan) [illegible]

[illegible]

(bin bag) لگائے جاتے تھے ان پر پابندی سے بڑی مشکل تھی۔ ہر قسم کا سوکھا گیلا کوڑا، بچوں کی ڈائپر، غرض کہ جو چاہا ڈال دیا پھر بیگ نکالا اور کوڑا سمیٹنے والے کے حوالے کر دیا۔ بالٹی صاف کی صاف۔ شراب بندی کے بعد شراب تو بند نہیں ہوئی ان تھیلیوں کی کون کہے۔ اور جب تک گھر میں رکھے بیگ ختم ہوں گے تب تک قانون بھی ختم ہو چکا ہوگا۔ لوگوں کو یہ اطمینان تھا۔

سلیم نقوی کے ملازم نے بالٹی لا کر دی جس میں بن بیگ لگا ہوا تھا۔

"سر آپ کو معلوم ہے یہ بین ہو گیا ہے۔ اس نے ملازم کے سامنے قدرے جھک کر کہا۔ گورمٹ آرڈر اوپر سے۔" آج بھر لے لیتے ہیں نکل دیا تو نہیں لیں گے۔"

(وہ سبھی ملازموں کو بشمول گارڈ اور کیئر ٹیکر سر اور گھر میں کام کرنے والی ملازماؤں کو میم کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ ہاں گھر کے مکینوں سے رشتے لگا کر بات کرتا تھا۔)

ملازم نے خالی بالٹی مزاحیہ انداز میں اس کی پیٹھ پر دھپ سے ماری۔ "بیٹا ذرا باپ کو قانون سکھاؤ۔ شراب بندی ہوئے بہت دن ہوئے مگر ایک ہفتے بعد سے ہی پی کر ٹن رہنے لگا۔ سالا۔ ہمیں قانون پڑھاتا ہے۔"

"انکل پیتے ہیں۔ ڈیڈی بھی پیتے ہیں۔ ٹو ڈرنک (two drink)" اس نے بے نیازی سے کہا اور اپنا ڈرام آگے کی طرف بڑھایا۔

سلیم نقوی واقعی کبھی کبھی شغل کر لیتے تھے۔ عادی گرچہ نہیں تھے۔ لیکن اس کم بخت کو کیسے خبر۔ ملازم کو بڑی حیرت ہوئی۔ سب کی برابری کرتا ہے۔ اور حرامی آرہ کا بھوج پوری بولنے والا انگریزی چھانٹتا ہے۔ وہ بڑبڑ کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ مالکن کو بتا دیا وہ کیا کہہ رہا تھا۔

قانونچی کہیں کا۔ دیکھتے ہیں کتنے دن قانون چھانٹے گا۔ بظاہر تو وہ چہکیں لیکن دل میں بڑی شرمندہ ہوئیں اب یہ نقوی صاحب کا موازنہ اس نے اپنے باپ سے کر ڈالا۔ پچھلے وقتوں میں ان کے سایے سے بھی بچا جاتا تھا، ورنہ بات بے بات جوتے لگتے رہتے تھے تبھی ٹھیک تھے اب سر پہ چڑھ کے موت رہے ہیں۔

باقی سارے قانونوں کا جو بھی ہو لیکن ادھر جو فضا میں ارتعاش تھا اس نے جس قانون کی صورت اختیار کی اس کی پیروی ضرورت سے زیادہ کی جانے لگی۔ وہ لوگوں کے رگ و ریشے میں

گھس گیا کہ وہ قانون موت کے خلاف تھا۔ مکمل لاک ڈاؤن۔ گرچہ لازمی خدمات انجام دینے والے اس سے بری تھے۔ ان میں ان کمینوں کی خدمات بھی برقرار تھیں لیکن یہ قانونچی تو غائب ہو گیا۔ پتہ نہیں کیوں۔ ویسے کبھی ناغہ نہیں کرتا تھا۔ کبھی بیمار تک نہیں پڑتا تھا یا معمولی کھانسی بخار کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، لوگوں کو یاد نہیں تھا کہ اس نے کب چھٹی لی تھی۔ اس کے ساتھ جو معاون لڑکا تھا وہ کبھی کبھی ضرور چھٹی لیتا تھا لیکن اس دن یہ اس کے حصے کا کام بھی کرا لاتا تھا۔ اب یوں تو سارا رہنا یوں دبکا پڑا تھا جیسے عقاب کو دیکھ کر چوہے بل میں گھس جائیں لیکن کیا صفائی وہ بھی وبا کے دور میں لازمی خدمات میں نہیں تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ تقریباً سبھی لوگوں نے اپنے جز وقتی ملازمین کی چھٹی کر دی تھی۔ صرف دو تین گھر تھے جن کے یہاں درون خانہ ملازمین تھے یعنی وہ جو ساتھ ہی رہتے تھے۔ باقی فلیٹوں میں کام کر کر کے خواتین کی حالت پست ہو رہی تھی۔ باہر کوڑا پھینکنا تو اور بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔ گھر کا ہی کوئی فرد ماسک لگا کر دستانے پہن کر ہفتے میں دو یا تین دن بلڈنگ سے باہر نکلا، کوئی دوسرا شخص مل جاتا تو دونوں چھٹک کر ایک دوسرے سے دور بھاگتے اور سڑک کے کنارے کھڑے میونسپلٹی کے ڈمپر میں کوڑا الٹ کر تیز تیز چلتے ہوئے گھر آ کر ہاتھ یوں دھوتے جیسے جلد چھیل کر پھینک دیں گے۔ کامن ایریا میں جالے لگنے شروع ہو گئے تھے۔ نیچے گراؤنڈ میں مٹی جم رہی تھی چاروں طرف ایک عجیب سی ناخوشگوار بو کا احساس ہونے لگا تھا۔ ملازمین کے لیے نیچے دو بیت الخلا بنے ہوئے تھے ان کا بھی برا حال تھا گرچہ اب استعمال کرنے والوں میں صرف درون خانہ ملازم تھے اور بلڈنگ کا گارڈ جسے گھر نہیں جانے دیا گیا تھا اور ایک صاحب کے گیراج میں سونے کی جگہ دے دی گئی تھی۔ کیئر ٹیکر بھاگ نکلا تھا۔

اچانک ایک دن ساری بلڈنگ نے اطمینان کی سانس لی۔ لاک ڈاؤن کے پورے تین مہینے بعد کمینہ واپس آ گیا تھا گرچہ اس کا معاون لڑکا ابھی غیر حاضر تھا۔ اگلے تین چار دن کے اندر اس نے تنہا ہی پوری بلڈنگ کی صفائی کر ڈالی کامن ایریا کا فرش چمچمانے لگا، جالے جھاڑ دیے گئے، لوگوں کو کوڑا ڈالنے بلڈنگ سے باہر نہیں نکلنا پڑنے لگا۔ سب کی گندگی صاف کر ڈالی۔ بولا کچھ نہیں کہاں گیا تھا، کیوں گیا تھا، کمینہ کہیں کا۔

○○○

مُرگی چور

"بگلا چلے کچہری کو، جوادرو ئیں مہری کو ---جوادمرگی چور۔"

قصائی باڑے کے ننگے دھڑنگے بچوں کا ایک دستہ اپنی محبوب تفریح یعنی جوادمرغی چورکو چڑانے میں مصروف تھا کہ اچانک ہی کندھے پر سرخ انگوچھا ڈالے، بگلی سی اُنگی دھوتی باندھے موٹی موٹی گالیاں بکتا ہوا جواد اپنے چھپر سے برآمد ہوا۔ پتہ نہیں کسی لوک کتھا کے بگلے کے کچہری جانے اور جواد کے اپنی بیوی کو رونے میں کیا تعلق تھا لیکن بچوں کے تخیل کی اڑان اور شاعرانہ صلاحیتوں میں کسے شک ہے۔

"ٹھہرتو جاؤ کم بختو۔ جواد دہاڑا۔ "اس محلے کی عورتوں کو شاید اور کوئی کام نہیں ہے۔ کتیا کی طرح بچے جن جن کر سڑکوں پر چھوڑ رکھے ہیں۔ شریف آدمیوں کی نیند حرام کرنے کے لیے۔"

مرغیاں چرانے کے باوجود اسے شرافت کا دعویٰ تھا۔ اس کی دھاڑ سے گھبرا کر بچے چند قدم بھاگے تو سہی لیکن پھر اپنی جگہ جم کر تالیاں بجانے لگے۔ "بگلا چلے کچہری کو۔" کالے موٹے چکنے بچوں پر سے گالیاں پھسل کر یوں ڈھلک جاتی تھیں جیسے بطخ کے پروں سے پانی کے قطرے۔

جواد کو اس لقب مرغی چور سے اتنی چڑ نہیں تھی جتنی بیوی کو رونے والے طعنے سے تھی۔ مرغیاں تو اس نے چرائی تھیں اور ڈنکے کی چوٹ چرائی تھیں لیکن بیوی کے بھاگ جانے والا واقعہ اس کی دُکھتی رگ تھا۔

سنا ہے کسی زمانے میں قصائی باڑے میں رہنے والے ان غریب مفلوک الحال لوگوں میں، جن میں اکثریت قصائیوں کی تھی، جواد کی بڑی عزت تھی۔ اس وقت وہ محلے کے واحد پڑھے

[illegible]

کمال کھینچ کر سرخ سرخ بوٹیاں بنانے لگے۔ جیسے جیسے چھری مشاق ہوتی گئی، جواد کی شرم ٹوٹتی گئی۔ مہینہ دو مہینہ میں ہی پیشہ ور قصائی نظر آنے لگے۔ زبان پر چند گالیاں بھی چڑھ گئیں۔

جواد کے گالیاں بکنے اور گوشت کاٹنے میں براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا گالیوں کا اصل سبب تو ناظمہ تھی جس نے بستر علالت سے اٹھتے ہی، اٹھتے بیٹھتے اس بات کا رونا شروع کیا تھا کہ شیخ پورہ کے چودھری کی بیٹی کا شوہر اس ذلیل پیشے کی روٹی کما رہا ہے۔ وہ انھیں اپنے جسم کو ہاتھ نہ لگانے دیتی "تمہارے جسم سے کچے گوشت کی مہک آتی ہے۔" وہ کہتی اور جواد تلملا کر رہ جاتے۔ جواد کی اس دلیل کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا کہ کوئی پیشہ ذلیل نہیں ہوتا بشرطیکہ محنت کا آذوقہ فراہم کرتا ہو۔ ذلیل تو وہ ہیں جو محنت کرنے والوں کو ذلیل کہیں۔ ویسے یہ اونچا فلسفہ ملک عزیز میں بیشتر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ تنگ آ کر جواد نے بدلو سے معذرت کر لی اور پھر گھر میں بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دنوں بعد انھیں نکما اور نکھٹو ہونے کے طعنے ملنے لگے۔ ایک دن ناظمہ ان کے سامنے اپنی چوڑیاں رکھ گئی تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ "حرافہ۔" وہ دھاڑے مگر حرافہ کو مارنے کے لیے اٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں ہی منجمد ہو کر رہ گیا کہ ابھی ان میں اتنی ہمت نہ تھی۔ انھیں دنوں گھر میں بچھو کا آنا جانا بڑھ گیا تھا۔ لوگوں میں کانا پھوسی شروع ہو چکی تھی۔ جواد ایک کان سے سنتے دوسرے سے اڑا جاتے۔ "بکتے ہیں مردود۔" وہ خود کو تسلی دیتے اور ہر بار سوچتے کہ آج گھر جا کر ناظمہ کو ضرور ماروں گا۔ مار کے آگے سنا ہے بھوت بھاگتے ہیں۔ جھوٹ سچ سب سامنے آ جائے گا۔ کمزور پسلیاں نکلے ہوئے سینے میں بچھو کی گردن ناپنے کی ہمت تو تھی نہیں اس لیے لے دے کر ناظمہ کو ہی مارنے کا خیال آتا۔ مفلسی، گالیاں بکنے اور کچھ دن تک بدلو کے ساتھ گوشت کاٹنے کی وجہ سے محلے میں اب ان کی وہ پہلی سی ساکھ نہیں رہی تھی۔ وہ اب انھیں میں سے ایک تھے جن کے ساتھ رہ رہے تھے۔ محلے داروں اور "جواد ماسٹر" کے درمیان کھنچی ان دیکھی دیوار گر چکی تھی۔ تب ہی ایک دن بدلو نے ان کا رستہ روک کر کہا

"باجی ایب لڑکا ہم سے نہ سنبھلے تو کیا کریں۔ مگر جوان ہو کے مہریا (بیوی) تم سے نہ سنبھلے یہ ہمری سمجھ میں نہیں آتا۔"

جواد سر سے پیر تک شعلہ بن گئے۔ خشک ہڈیوں کا گودا پٹرول بن کر دھڑ دھڑ جلنے لگا۔

[illegible]

ان کی کھبی بڑھتی جاتی۔ لوگوں کا پانی لانے کے بعد جو وقت بچتا، اس میں وہ گالیاں بکتا۔ انگلیوں پر کچھ گنتا اور پھر انھیں یوں جنبش دیتا جیسے کسی کا گلا گھونٹ رہا ہو۔

اس چھوٹے سے گندے سے محلے میں میونسپلٹی کا صرف ایک نل تھا۔ پانی بھرنے والوں کی قطار لگی رہتی تھی جن میں اکثر عورتوں کی ہوتی تھی۔ کچھ پردے دار عورتیں جن کے شوہر صبح سویرے کام پر نکل جاتے، تیری میری خوشامد کر کے دوسروں سے پانی بھرواتی تھیں۔ نگی ہو جانے کے بعد سے جواد کا واحد مشغلہ جس سے دو وقت روٹی مل جاتی، پانی بھرنا ہی تھا لیکن ان کی مرضی کا مرہون منت۔

پردے کے پیچھے سے کوئی عورت گڑگڑاتی۔ "اے بھیا، پانی بھر دیو۔ آٹا گوندھنے تک کو نہیں ہے۔" بھیا نکی کی جون میں ہوتے تو سارے گھڑے مٹکیاں بھر ڈالتے نہیں تو ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر انگلیوں پر کچھ گنتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ ان کی خوشامد کرنے والی عورتوں میں ادھر کچھ دنوں سے ایک ہستی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ نور محمد رکشے والا حال ہی میں دلہن رخصت کرا کے لایا تھا۔ بیاہ ہوئے تو چار سال ہو گئے تھے مگر اس وقت دلہن بے حد کم سن تھی۔ اب کی چودہواں برس شروع ہوا تو لڑکی والوں نے رخصتی کا تقاضا بھی شروع کر دیا تھا۔ نور محمد صبح تڑکے رکشا لے کر اسٹیشن نکل جاتا۔ کلکتے سے آنے والی گاڑی ٹھیک پانچ بجے پلیٹ فارم پر لگ جاتی تھی۔ سویرے سویرے خاصی آمدنی ہو جاتی۔ نئی دلہن کی فرمائشیں بھی تو پوری کرنی تھیں۔ اخراجات بڑھ چکے تھے۔ اس لیے نورا کوئی ٹرین نہیں چھوڑتا تھا۔ نورے کے جانے کے بعد امیرن پھٹے ہوئے ٹاٹ کا پردہ اپنی مہندی رچی انگلیوں سے سرکاتی اور سامنے منڈیر پر بیٹھے ہوئے جواد کو کنکھیوں سے دیکھ کر خوشامد بھرے لہجے میں کہتی

"اے بھیا پانی نہ چاہیے کا؟"

جواد کی آنکھوں میں شرارے ناچ جاتے۔ خستہ حال پھٹے سے ٹاٹ کے پردے کے پیچھے سے نظر آتی سوتی تازی پرچھائیں کو دیکھ کر انھیں کسی پلی ہوئی مرغی کا خیال آتا جو کسی کے آنگن میں بندھی، انتہائی طمانیت کے ساتھ دانہ چگتی، کٹ کٹ کناک کرتی احساس تحفظ میں سرشار جواد پر ہنس رہی ہو۔ کبھی کبھی ٹاٹ کے روزن سے اس کی پل پل رنگ بدلتی آنکھیں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

گداگن

مولوی صاحب نے اس کا نام زینب خاتون رکھا تھا۔ کچھ دن تک دادا، جنہوں نے اردو اسکول میں پرائمری تک کی تعلیم حاصل کی تھی اسے صحیح تلفظ اور پورے نام کے ساتھ زینب خاتون پکارتے رہے لیکن دادی نے کچھ عرصے تک اسے صرف 'باؤ' کہنے کے بعد سے جنوا کہنا شروع کیا اور یہ عرف اس سے چپک گیا۔ یہ زینب کے مقابلے میں آسان تھا اور پھر اس میں دادی کی محبت کی مٹھاس بھی تھی۔ نام کی یہ تاریخ اسے اس لئے معلوم تھی کہ لوگ اکثر یہ دوہراتے تھے کہ دادی نے اسے لاڈ میں کتنا بگاڑ رکھا تھا۔ بس ایک بار ہی مٹی کھانے پر اسے ایک چپت لگایا تھا ''کارے جنوا پھر مٹی کھا کے آئی ہے'' لیکن بجائے ڈرنے یا شرمندہ ہونے کے وہ ٹھیک دادی کے انداز میں دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کے کھڑی ہوگئی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی ''ہاں کا ئی''

اور لوگ ہنس ہنس کے دوہرے ہوگئے۔

پھر اس کا پورا اور صحیح نام نکاح کے وقت ان مولوی صاحب نے ہی لیا جواب بوڑھے ہو چلے تھے ''زینب خاتون ولد محمد اسمٰعیل مرحوم تمہارا نکاح محمد امام الدین ولد محمد سراج الدین مرحوم بعوض دو ہزار ایکسو اکیاون روپیہ سکہ رائج الوقت'' توقف کرنے پر سرخ آنچل سے ڈھکا اس کا سر دادی نے زور سے نیچے کیا تھا جیسے پھر مٹی کھا کے آنے پر چپت لگا رہی ہوں۔

''مہر بہت بندھا دیا اماں۔'' امام دین نے ماں سے کہا

''چپ۔ مہر کون دیتا پھرتا ہے۔ تیرے ابا نے دیا تھا؟ ہمارے وقت میں پان سو بھی ایسا ہی لگا تھا۔ مرتے مر گئے کبھی اکٹھے پان سو گھر کے خرچ کے لئے بھی ہاتھ پہ نا رکھے۔ سو پچاس

[illegible]

اماں کی یہی عادت سی تھی۔ ایک بات چند بار کہتی۔

''اچھا ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔'' اس نے [illegible]

''جا اب جلدی سے گھر میں جا کر [illegible] تیرے ابا تو مرتے مرتے بھی ہماری بات [illegible] کا غم ہے''

امام دین [illegible] کوٹھڑی میں جا چکا تو جہاں [illegible] اور مہندی [illegible] ساتھ [illegible] باندھ رکھی تھی۔ [illegible] زینب کو ہمیشہ یاد رہ گئی۔

[illegible] محلے پڑوس کی خواتین بہو کو دیکھنے آئیں۔ اس واقعہ کا بھی گفتگو کا موضوع ہے۔ ''[illegible] امام دین تو [illegible] لگ رہے ہیں۔'' کسی نے [illegible]

''[illegible] ہے۔''

''[illegible] صاف ہے [illegible]''

[illegible] امام دین کی والدہ نے کہا۔ ہماری [illegible] کالی [illegible] جیسے بچوں کی لین لگی ہے۔''

''امام دین [illegible]''

''[illegible] عورت سے کہتی ہے۔''

[illegible] ہنسنے لگیں۔

''[illegible] روانہ ہوئے۔

[illegible] اس سے زیادہ [illegible] چوڑی [illegible] امام دین کو پانچ [illegible]

دین ریلوے میں گیٹ کیپر تھا۔ سرکاری نوکری تھی جس کا اس کی ماں کو بڑا زعم تھا۔ اکثر کہتی تھی اگر تاڑی کی لت نہ ہوتی تو بھاری جہیز والی لڑکی ملتی۔ بات کھل گئی تھی۔ جو لوگ زیادہ دے سکتے تھے اور موٹر سائیکل کا وعدہ نہیں بلکہ فوری طور پر موٹر سائیکل دروازے پر کھڑی کر جاتے وہ پینے کی بات سن کر کتراتے تھے۔ امام دین کی اماں کا خیال تھا کہ شادی میں دیر کی تو نشے کی لت بڑھ جائے گی۔ اب مہرارو آ کے چھڑائے گی۔ کچی لت میں چھڑا لینا آسان ہوتا ہے۔ لڑکی کا باپ نہیں تھا ورنہ تو شاید یہ لوگ بھی ہاتھ نہ آتے۔ امام دین کو بہو پسند نہیں آئی۔

"کیا دیکھ کے لائیں اماں؟ ایسا چوڑا سا موہنہ ہے، طباق جیسا۔" کوئی تیسرے چوتھے دن اس نے ماں سے کہا۔ "گھورتی ہے تو لگتا ہے کھا جائے گی۔"

"واہ بیٹا واہ، گوری صورت، بڑی بڑی آنکھیں۔ کیا وہ چاہیے، وہی ناچنے والی، کیا نام ہے کہ ملکہ شیرنی۔"

"اماں اس کا نام یوں بگاڑو تو تمہارے اوپر مقدمہ ٹھوک دے گی وہ ناچنے والی۔"

"نہیں جی سینما دیکھ دیکھ کے سب کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وکیل صاحب کی بی بی بھی کہہ رہی تھیں کہ ان کے لڑکے کو خوبصورت لڑکی چاہیے بھلے ہی جہیز نہ لائے۔ اب کوئی ناک میں نہ سما رہی۔ دوڑتی پھر رہی ہیں۔"

زینب کا استخوانی ڈھانچہ ذرا چوڑا تھا۔ چہرہ اور پیشانی بھی چوڑے تھے لیکن وہ صاف رنگت، ستھرے نقوش اور لانبے قد کی گدبدی سی لڑکی تھی۔ سولہواں سال بس ابھی گیا ہی تھا۔ الھڑپن چہرے پر لہریں لے رہا تھا اس کے قد، کاٹھی نے پہلے ہی دن امام دین میں ایک احساس کمتری جگایا۔ اس نے دوستوں کی محفل میں سنا تھا کہ اس طرح کے جسم والی لڑکیوں کو مطمئن کرنا ہر مرد کے بس کی بات نہیں ہوتی اور امام دین تو تھا ہی منحنی سا۔ لبوترا، چھوارے جیسا موہنہ۔ اسے دیکھ کر زینب کو ان نیولوں کی یاد آتی جو اس کے گھر کے احاطے میں کھڑے آم کے درختوں کی جڑ میں بل بنائے رہتے تھے۔ وہ اسے دیکھتی تو بے اختیار ہنسی آتی۔ ہنسی نہ روک پاتی تو موہنہ پھیر لیتی اور امام دین جل بھن کے خاک ہو جاتا۔

امام دین نے ڈنڈ پیلنے شروع کئے اور زینب کو حکم دیا کہ روز رات کو چار پانچ چھوارے

[illegible]

سالڑکا بڑا محنتی تھا اور اس کے ہاتھ میں بڑی صفائی تھی۔ آج یہ صفائی اور وہ ہنر اس کے کام آیا۔

جلد ہی امام دین کو معلوم ہوا کہ اس دوران اسے اس دھول سے الرجی ہو گئی تھی جو پینٹنگ سے پہلے دیواروں کو رگڑنے سے اڑا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ پینٹ کی مہک سے بھی اس کا سر چکراتا، جی متلانے لگتا اور سینے میں سانس گھٹتی سی محسوس ہوتی۔

"اسے ساتھ لے جایا کر۔ ایک دن ماں نے حکم صادر کیا۔ دیواروں پر سریس پیپر بھی رگڑے گی اور دھول بہارنے کا کام کرے گی۔ ساتھ میں جوڑ کر رکھا ہے اس کا پیسہ بھی یہی کمائے گی۔"

آئیڈیا برا نہیں تھا۔ زینب عرف جنو ایمبڑی بنانے کا کام چھوڑ کے شوہر کے ساتھ جانے لگی۔ سر پر دوپٹہ کس کے باندھتی اور سر جھکا کے بیل کی طرح کام میں لگ جاتی۔ سننے میں آنے لگا کہ امام دین سے زیادہ تو اس کی کم عمر جورو محنتی ہے۔ اب تو وہ پینٹ بھی کر لیتی ہے۔ امام دین کئی کئی دن کام سے غیر حاضر رہنے لگا۔ ملتا ہوا کام چھوڑ دیتا یا اکیلے ہی بیوی کو بھیج دیتا۔ کتنی بھی محنتی ہو لیکن اکیلے کام اس کے بس کا نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی عورت سے گھر میں پینٹنگ کراتا۔ اسسٹنٹ کے طور پر ٹھیک تھی۔ آمدنی بڑھتے بڑھتے پھر کم ہونے لگی۔

کئی لوگوں کی شرکت میں ایک بار امام دین کو ہوٹل میں کام ملا، جس کا ایک حصہ ابھی زیر تعمیر تھا۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ اگر وہ گنگا سے بالو ڈھونے لگے تو اسے پینٹنگ کے تکلیف دہ کام اور گھٹن کی شکایت سے چھٹکارا مل جائے گا۔ ہاں بالو ڈھونے کے لئے دو ورنہ ایک گدھا تو چاہئے ہی۔

پیسے نکال۔ اس نے بیوی سے کہا۔ لہجہ اس کے تن و توش کا ٹھیک الٹا تھا۔ نہایت [illegible]۔ تین چار دن کے لڑائی جھگڑے کے بعد ہی زینت نے گولک توڑی۔ دراصل ماں بیٹا دونوں متحد ہو جاتے تھے۔ اکیلے تو شاید امام دین سے نپٹ بھی لیتی لیکن بنی کٹی تند خو ماں سے نپٹنا بہت مشکل تھا۔

اس نے گولک توڑا۔ سارے پیسے موتہہ پر مارے۔ اور دونوں بازو کمر پر رکھ کے کھڑی ہو گئی۔

"نامرد کہیں کا۔ تھو ہے۔"

[illegible]

امام دین نے کام بہت کم کر دیا اور زینب پر زور ڈالنے لگا کہ وہ ہاتھ بٹائے۔ ''زرے جنوا، تے بھی چل گدھا لے کے۔ اماں ہے نا، ٹرکن کو سنبھال لے گی۔'' ماں سے کہتا ''اماں تے اسے اسی لئے بیاہ کے لائی تھی نا کہ مضبوط ہاتھ پاؤں والی ہے، کام سنبھالے گی۔''

شروع میں زینب کا جی چاہا کہ وہ گنگا میں کود جائے جو اس دلدل سے چھٹی ملے۔ اب یہ گدھوں پہ بالو لادہ کے تعمیرات تک پہونچاتا۔ لیکن پھر اسے محسوس ہوا کہ گھر پہ تین بچے، لڑاکا ساس اور کام چور، نشہ خور امام دین۔ بالو لادنے کو گدھے لے کر نکل جانے میں بڑی عافیت ہے۔ اتنی دیر وہ سکون سے رہتی ہے۔ امام دین کی ماں بچوں سے بڑی محبت کرتی ہے۔ بیٹا ہو جانے کے بعد بیٹیوں سے اس کی غیر ارادی چڑ بھی ختم ہو گئی تھی۔ کنسٹرکشن سائٹ پر ایک مرتبہ جوان مزدور نے اس کے ساتھ دست درازی کی تو اس نے ایک زنانے کا تھپڑ رسید کیا اور کمر پہ ہاتھ رکھ کے، تن کر کھڑی ہو کر ایسی مردانہ گالیاں بکیں کہ اس کی کیا، دوسروں کی بھی سٹی پٹی گم ہو گئی۔ جوان عورت اچھا قد، کاٹھی، صاف رنگت لیکن کوئی اب چھیڑنے کی ہمت نہ کرتا۔ اس کی دبنگ شخصیت نے اس کے خلاف جو ایک غیر شعوری گھبراہٹ مکمل نفرت پیدا کی تھی اس میں ایک جچی حسد بھی شامل تھا اس کے تحت اسے ایک تحقیر آمیز لقب سے یاد کیا جانے لگا 'گدا ہن'۔ پیٹھ پیچھے اس کی انا نوی پر گفتگو ہوتی اور لوگ تھی تھی کھی کرتے۔ جب بھی امام دین آتا لوگ آنکھوں آنکھوں میں اشارے کرتے اور دبے دبے مسکراتے۔ ایک دن ایک گارا بنانے والے مستری نے کہا۔ کیوں بے، بچے تیرے ہی ہیں نا؟ یہ عربی گھوڑی کہاں سے لے آیا تھا؟ اس دن امام دین نے زیادہ تاڑی پی اور زینب کو اس کی ساری مضبوطی سمیت دھنک کر رکھ دیا۔

مخصوص علاقوں کے مخصوص ذرائع ابلاغ ہوتے ہیں۔ 'گدا ہن' گھومتا پھرتا زینب کے محلے تک پہونچ گیا اور اب محلے والے بھی اس کا ذکر گدا ہن کہہ کے کرتے۔ کوئی جتوا کہتا نہ امام دین کی بہو وہ اب صرف گدا ہن تھی۔ پھر پیٹھ پیچھے کی قید نہ رہی۔ پہلے کسی کے مونہہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا تھا۔ ''اے گدا ہن، دو گدھے بالو پہونچا دینا، دیوار پکی کرا رہے ہیں۔'' لیکن کہنے والا ذرا شرمندہ ہو گیا تھا۔ پھر یہ شرمندگی ختم ہو گئی۔ اسے معلوم تو بہت پہلے ہو گیا تھا۔ پھر بھی مونہہ پر سننے سے بے حد غصہ آیا۔ پھر غصہ جھینپ میں بدلا اور پھر ایک ڈھیٹ بے نیازی میں۔ ذہن کو

چوٹ پہونچتی ہے تو اس میں خراشیں آتی ہیں، زخم بھی بنتے ہیں پھر ہوتے ہوتے گھٹا بن جاتا ہے، گٹے میں اعصاب سو جاتے ہیں، ان میں حس باقی نہیں رہتی۔ زینب عرف جتوا نے جس طرح اپنی زندگی کو قبول کیا تھا زندگی میں پہلے امام دین اور پھر گدھوں کو قبول کیا تھا اسی طرح وہ اس لقب 'گدا ہن' کو قبول کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن رام سنہی سے نہیں۔

امام دین تین دن سے گھر نہیں آیا تھا۔ اماں نے ہائے توبہ مچا رکھی تھی۔

جب پیسے ختم ہو جائیں گے تو آ جائے گا اماں فکر کیوں کرتی ہو۔ آج تک بیٹا بھجو میں نہ آیا تمہاری۔ زینب نے بیزاری سے کہا روٹیاں لپیٹ کر چنگیر میں رکھیں اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ تین بچوں کے بعد بھی وہ ویسی ہی تھی جیسی بیاہ کے آئی تھی اس کا جیسا فگر پانے کے لئے فلم اسٹارز اور ماڈل لڑکیاں گھنٹوں جم جا کر مشقت کیا کرتی ہیں۔ پہلوٹھی کی جڑواں لڑکیاں اب پانچ برس کی ہو چکی تھیں اور لڑکا چار کا۔ تینوں کا نام اس نے حال میں مولوی صاحب کے مدرسے میں لکھوا دیا تھا۔ اس وقت بھر اس نے تینوں کو گدھوں پر سوار کیا اور انہیں مدرسے چھوڑتی ہوئی گدھے لیکر گنگا کی طرف بڑھ گئی۔

رام سنہی ناؤ کھیتا چلا آ رہا تھا۔ ناؤ اس نے کنارے لگائی۔ بالو ڈھونے والی بڑی بڑی چپٹی سی ناویں دور سے ہی دکھائی دے جاتی تھیں اور رام سنہی کے تو بازو اتنے لانبے اور مضبوط تھے اور قد کاٹھی اتنی بلند کہ اور بھی دور سے معلوم ہو جاتا تھا کہ ناؤ رام سنہی کی ہے۔ گنگا اپنی پوری ہیبت، پورے جاہ و جلال، پورے حسن و شباب کے ساتھ رواں دواں تھی۔ موسم موسم تو رنگ بدلتی ہی تھی، دن کے چاروں پہر بھی ایک جیسی شاذ و نادر دکھائی پڑتی۔

زینب کو وہ کبھی کبھی ایک دیو قامت روہو مچھلی لگا کرتی تھی۔ گہرے سرمئی رنگ کی ایک ایسی روہو جس کی ابتدا ہو نہ انتہا۔ کبھی وہ ندی، بالکل ندی لگتی۔ سیمنٹ کی سڑک جیسی نظر آنے لگتی۔ ساکت، پر سکون، ایک ذرا سی لہر کا نام و نشان تک نہیں۔ کبھی کسی حسین و جمیل دوشیزہ جیسے دکھائی دیتی شرمائی، شرمائی، اٹکھیلیاں کرتی، پلٹ پلٹ کر اپنے گھونگھر والے بالوں کو جھٹکتی۔ اور کبھی ایسی غضبناک، غیر مرئی قوت بن جاتی جو پانی کی صورت میں نمودار ہو کر انسانوں کو دھکارتی ہو کہ تم، اپنی اوقات میں رہنا ورنہ دیکھنا ہم تمہارا کیا حشر کریں گے۔ اس وقت اس کا حسین چہرہ

خوفناک ہوالگتا۔ گرچہ یہ خوفناک صورت بھی ایک ایسے جمال کا مظہر ہوتی تھی جس پر جلال غالب آ گیا ہو۔ ایک مبہوت کن کیفیت کی حامل۔ سر جھکا دینے کو مجبور کرنے پر قادر۔ اب سر چاہے سیدھے گنگا کے حضور جھکے یا اس قادر مطلق کے سامنے جس نے گنگا کو یہ صورت یہ سطوت عطا کی۔

ویسے زیادہ تر گنگا ایسی رہتی تھی جیسی ابھی تھی۔ ایک خوش مزاج، مہربان ماں جیسی، پرسکون، ترل رل گاتی، گنگناتی۔ اس کی چھاتی پر تیتری جیسی ناویں چل رہی تھیں۔ ان کے خوش رنگ پال پھولوں کی پنکھڑیوں جیسے نظر آ رہے تھے۔ ہاں رام سینی کی ناؤ اس کی اپنی زندگی جیسی تھی، بدرنگ اور بے ڈھب۔ اور اس پر لدا اسامان اور بھی بے رنگ اور پھیکا۔ کر کرا بالو۔ نظر پڑتے ہی لگتا موہنہ میں آ گیا۔ خواہ مخواہ تھوکنے کو جی چاہے۔

"کیسی ہے ری جنو!؟ ناؤ کنارے لگاتے ہی رام سینی نے بڑے سروکار کے ساتھ اس کی خیریت پوچھی۔ امام دین ٹھیک تو ہے؟ کئی دن سے آیا نہیں اور پھر تیرا موہنہ بھی زیادہ سوکھا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔"

"موہنہ کیا سوکھے گا۔ ایسا ہی ہے۔"

"نہ رے تیرا موہنہ تو بڑا اچھا ہے۔ سلونا سندر، ہمیں ناک کا بڑا دھیان رہتا ہے۔ چپٹی ناک والی عورتیں ذرا نہ بھاتیں ہمیں۔ لیکن تیری ناک تو اتنی ستواں ہے کہ حد نہیں۔ کھڑی، چھوٹی سی۔ تجھے ناک میں بیسر جتنی سوہتی ہے ہم نے کسی کو سوہتے نہ دیکھی۔"

زینب زور سے ہنس پڑی۔ آج اسے کیا ہو گیا ہے؟ پھر بولی "امام دین بڑا ہتھ چھٹ ہے۔ آج کل نشہ زیادہ کرنے لگا ہے لیکن ہوش میں بھی تو رہتا ہے۔ گدھے لیکے آئے گا تو اس کے سامنے ہماری تعریف کرنا۔"

"روپ کو سراہنا پاپ ہے کیا؟" بالو لادنے کے لئے گدھوں کو ہنکا کر قریب لاتی زینب کو اس نے نظر بھر کر دیکھا۔ "سچ سچ بتا کیا ہوا؟ تیرے اس ہتھ چھٹ مرد نے تیرے اوپر پھر ہاتھ چھوڑا؟ عورت کو مارنے والے کو ہم نامرد سمجھتے ہیں۔ جو مرد ہو وہ مرد سے دو۔ دو ہاتھ کرے۔"

"جو جی میں آتا ہے سوچ لیتا ہے اور بولنا شروع کرتا ہے۔ آج اتنا کیوں بول رہا ہے؟ تجھے کیا ہوا ہے؟"

"ہمیں کچھ نہیں ہوا۔ گدھے لادتے لادتے تیرا چوڑا ابھرا ابھرا چہرہ کسی گدھے کی تھوتھن جیسا لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ ارے خوش خوش رہا کر گدھاین۔" اس نے ایسی خوشدلی سے کہا جس میں گہری یگانگت چھلک چھلک پڑ رہی تھی۔

زینب وہیں دھپ سے زمین پر بیٹھ گئی اور رونا شروع کر دیا۔

"اب تے بھی یہی کہے گا۔ تے تو اس پار سے آتا ہے۔ تے کو اس پار کی خبر کہاں سے لگ گئی۔"

رام سینی خاموشی سے بالو لادتا رہا۔ یہ اس پار اور اس پار اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ عورت دکھی ہے دو۔ دو بیٹیاں ہیں۔ اپنا گھر تو ہے لیکن آمدنی کم۔ جوان جہان ہے لیکن مرد نے چودن سے آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی بند کر دیا ہے۔ بہت دن سے وہ امام دین کے گدھوں پر بالو لادتا آ رہا ہے۔ سب جانتا ہے چاہے امام دین آئے یا جنو۔

زینب اب آنسو پونچھ کر ساری کے پلو سے پیسے کھول کر رام سینی کو دینے لگی تھی۔

"بتائے گی نہیں جنو!؟ کیا تیرے میرے بیچ صرف بالو کا سمبندھ ہے؟" اس کے لہجے میں تنی اپنایت تھی کہ زینب کا جی چاہا پھر رونے لگے اور اس بار باقاعدہ بھیں بھیں کر کے۔ لیکن وہ رونی نہیں، رلائی چھپانے کو زور سے ہنس پڑی۔ "نہیں رے صرف بالو کا سمبندھ کا ہے ہوگا۔ گدھوں کا بھی ہے۔" اس کے لہجے میں کاٹ تھی۔

رام سینی بھی ہنسنے لگا، اور دھوتی کی کمر میں سلی چھوٹی سی تھیلی میں روپے رکھ کر تھیلی پھر کمر میں کھونس لی۔ "چلتے ہیں۔ اور رونا دھونا بند کر۔ جیون ایسے ہی چلتا ہے۔" وہ ناؤ میں جا بیٹھا اور موڑ آن کرتے ایک بھرپور نگاہ زینب کی طرف پھینکی۔

ہاں جیون ایسے ہی چلتا ہے۔ زینب نے ٹھنڈی سانس بھری اور گدھے ہنکاتی آگے بڑھ گئی۔

چوتھا دن بھی تمام ہونے کو ہوا۔ امام دین کا آج بھی پتہ نہیں تھا۔ اب زینب کو بھی پریشانی ہوئی۔ اور اماں نے تو رونے دھونے کے ساتھ بہو کو برا بھلا کہنا بھی شروع کیا۔

"تو نے ہی کچھ کہا ہوگا۔ ہم سمجھتے نہیں کیا۔ رات کو پٹھے پہ ہاتھ نہیں رکھنے دیتی۔ آخر

جوان مرد ہے، کسی عورت کے چکر میں پڑ گیا ہوگا۔"

چھوٹے سے گھر میں کوئی بات ڈھکی چھپی رہے بھی تو کیسے۔ بیٹا بہو کی کوٹھری کے سامنے ہی اماں اوسارے میں پلنگ ڈال کے پڑی رہتی تھیں۔ کئی بار امام دین زینب کو گالیاں دیتا ہوا کمرے سے نکلا تھا۔ ایک دن تو یہ تک بول گیا تھا کہ کبھی کبھی تو ہمیں لگتا ہے کہ لڑکے ہمارے نہیں ہیں۔ آخر پورے پانچ سال تک ہمارا بیج کیوں نہیں پھوٹا۔ جب دیکھو تب چارپائی سے دھکیل دیتی ہے۔

دن بھر کی محنت، اب تین چھوٹے بچے، ساس کے ہاتھ پاؤں دبانا، چولہا چکی، گدھوں کی دیکھ بھال، کمرے میں آتی تو جی چاہتا کوئی بات تک نہ کرے۔ چھونا کیسا۔ ویسے بھی امام دین چھچھوندر جیسا لگتا تھا۔ گندا، ملجلا، مونہہ سے دیسی شراب کے بھبکے۔ مرد کہیں ایسا ہوتا ہے۔ اللہ کی قدرت ہے اولاد دینا چاہے تو عورت کو چھونا بھر بہانہ بن جائے۔ ورنہ امام دین اور اولاد۔ شک دراصل زینب پر نہیں اسے خود پر ہے۔ آخر اس نے بچے پیدا کیسے کر لیے۔

پانچویں دن دو ایک ہمدردوں کی مدد سے پولیس میں امام دین کی گمشدگی کی رپٹ درج کرائی۔ یہی خیال تھا کہ گھر گرہستی چھوڑ کے بھاگ گیا ہے لیکن دس پندرہ دن بعد ایک سنسان نالے سے اس کی لاش برآمد ہوئی جو ایک بوری میں بھری ہوئی تھی۔ شاید نشہ خوروں کی ٹولی میں کوئی جھگڑا کسی فوری اشتعال کا سبب بنا تھا۔ اس لئے کہ کسی کو امام دین سے کسی دشمنی کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ وہ کام چور، نشیڑی ذمہ داریوں سے بھاگنے والا، کچھ بھی ہو۔ یوں سیدھا سادا انسان تھا جو ہر نارمل انسان کی طرح بیوی کے علاوہ کسی سے جھگڑا نہیں کرتا تھا۔

سب لوگوں کا خیال تھا کہ بیوی آئے گی تو نشہ چھڑوا دے گی۔ زینب کے گھر والوں کا بھی۔ وہ اچھی بیوی ثابت نہیں ہوئی یہ سب نے مان لیا۔ وہ تو شوہر کو کھا ہی گئی۔ شادی کے بعد تو اس کی شراب نوشی بڑھ گئی تھی۔ یہ تو زینب ہی جانتی تھی کہ اس نے نشہ زیادہ کرنا کیوں شروع کیا تھا لیکن شادی کے بعد کچھ وقت گذر گیا تھا تب یہ بات سمجھ میں آئی تھی۔ اور ایسا نہیں تھا کہ اس نے کوشش نہیں کی تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اس نے شوہر سے بے وفائی کی تھی پھر بھی اب وہ تیز طرار زبان لڑانے والی عورت بجھ کے رہ گئی تھی اور بے چوں چرا سارے الزامات قبول کر رہی تھی

وہ ساری عمر امام دین کی رہی تھی کہ اب وہ اپنے چوں چاپ بھی تھی۔

امام دین کے مرنے کے بعد اس نے جب گدھوں کو ہنکا کر ان کا رزق زندگی کا شرف دیا تو اس نے پوری طرح اپنے لئے گدھا گن کا لقب قبول کر لیا تھا اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر حقیقی زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی تھی۔

OOO

بڑی حویلی کی بیبیاں

حویلی اب کہاں رہ گئی تھی۔ لیکن بیبیاں بھی اب کہاں رہ گئی تھیں۔ جیسی کھنڈر حویلی، ویسی ہی کھنڈر جیسی صرف ایک عدد بی بی۔ چوراسی برس پورے ہو چکے تھے یا ہونے والے تھے۔ ہاں لیکن وہ ایک اور جو تھیں انھیں بی بی کہیں یا نہیں۔ بہرحال ابھی حویلی میں شام پڑے ایک دو بلب ٹمٹما جاتے تھے۔ اور وہ چوراسی برس والی بی بی بھی ٹمٹماتی پھرتی تھیں، دھندلی آنکھوں پر ہاتھوں کا چھجہ بنائے۔ دوسری بی بی جن کے بارے میں شک ہے کہ انھیں بی بی کہا جائے یا نہیں، ستر کے لپیٹے میں تھیں۔ چہرے سے عیاں تھا کہ کبھی نک سک سے درست، جاذب نظر کہلائی جا سکتی ہوں گی۔ اور وہ پہلی بی بی۔ وہ تو خاصی حسین رہی ہوں گی۔ جاذب نظر کہنا تو ان کی صورت کے مرتبے کو کم کرنا ہے۔ اب دونوں میں فرق جو بھی ہو، یا بھی رہا ہو اب ایک قدر مشترک تھی۔ دونوں کے چہرے پر دکھ کے مارے ہوئے کوڑوں کے نشان تھے، بڑے گہرے نشان چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی، ہوا میں تیرتی سی ادھر ادھر جاتیں تو لگتا کوٹھی سے کچھ ہی دور کے آبائی قبرستان سے مردے نکل کر چہل قدمی کرنے لگے ہیں۔

کبھی حویلی جوان تھی (کبھی تو ہر شے جوان ہوا کرتی ہے)۔ اس میں شادی شدہ بال بچوں والی خواتین پاندان کھولے پان بنا بنا کر مردوں کے لیے چاندی کے ڈبوں میں سجاتی، خود گال میں گلوری دبا کے دنیا بھر کے بکھیڑے ادھیڑتیں۔ جوانوں کی شادیاں طے کرتیں، بچوں کے چھٹی، چھلے، ختنے، مونڈن، مکتب کے پروگرام بنتے، رشتہ داروں کی غیبتیں ہوتیں تو اس ساری گفتگو اور غیبت کے درمیان کبھی کبھار ان کلمونہیوں کا ذکر بھی آ جاتا۔ بیبیاں دوپٹے منہ میں دبا دبا

[illegible] مشہور [illegible] تھیں۔

[illegible] شادیاں [illegible]

[illegible] بی اے سال دوم کے طالب علم تھے۔ [illegible]

[illegible] خوش گلو تھیں اور ترنم میں [illegible] بھی کیا کرتی تھیں۔ [illegible] موسیقی کے ساتھ [illegible]

پھر بات کوٹھوں (کوٹھے) نکلی ہونٹوں چڑھی۔ ایسا کچھ غضب نہیں ہوا تھا۔ مرا بچہ تھا آخر لیکن کہیں وہیں رہ نہ پڑے اس لیے پان کی گلوریاں اٹھاتے خواتین اور حضرات نے فیصلہ کیا کہ ان کی شادی ذرا جلدی کر دینی چاہیے۔

چوراسی سال یا اس سے کچھ کم وبیش عمر والی بی بی اس وقت پندرہ یا اس سے کچھ کم یا بیش عمر کی تھیں۔ نگہ انتخاب ان پر پڑی اور وہ دلہن بنا کر لے آئی گئیں۔ وہ قدرے چھوٹے گھر، قدرے کم حیثیت خاندان اور کئی بھائیوں کے درمیان اکیلی بہن کی صورت میں پلی بڑھی تھیں۔ کچے کھیلتیں اور چھپا کر پتنگ بھی اُڑا لیا کرتی تھیں۔ بھائیوں نے انھیں کچھ حرف شناس بھی بنا دیا تھا۔ باقی اقدار اشرافیہ کے دونوں گھروں میں تقریباً یکساں تھیں۔

بی بی نے جگہ زیادہ پائی تو ہرنی کی طرح قلانچیں بھرنے کو جی چاہا۔ میاں سے بولیں
"چھت پر جا کے پتنگ اڑائیں۔ موسم بہت اچھا ہو رہا ہے۔"

"آپ بہو ہیں۔ ہمارے گھر کی تو بیٹیاں بھی پتنگ اُڑانے کی نہیں سوچ سکتیں۔"
آواز میں غراہٹ تھی۔ بے چاری سٹپٹا گئیں۔ ان کے گھر کوئی ان سے کبھی یوں نہیں بولا تھا۔ میاں کچھ الگ الگ کو بھی رہتے تھے لیکن انھیں اس کی سمجھ ہی نہیں تھی کہ میاں کے فرائض میں کیا کیا شامل ہے۔

سال بھر کے اندر گھر کے دو اور بیٹوں کی شادی ہو گئی۔ تب ان پندرہ برس کی بی بی کو جو اَب سولھویں میں لگ چکی تھیں کچھ کچھ احساس ہوا۔ میٹھی نظروں کا، ٹوٹتی چوڑیوں کا، بہانے بنا بنا کر دن میں بھی ایک چکر کمروں کا مار آنے کا جہاں نئی دلہن اکیلی نہ ملتی تو بھی گھونگھٹ کے اندر کی مسکراہٹ چھپی نہ رہ جاتی۔

پُروا بہہ رہی تھی، موسم بڑا سہانا تھا۔ چوڑی والی ٹوکری لے کر آئی ہوئی تھی۔ ادھر آسمان پر ویسی ہی رنگ برنگی پتنگیں رقصاں تھیں جیسی چوڑی والی کی چوڑیاں۔ سبز، سرخ، اودی، گلابی۔ وہ اٹھ کر بھاگیں۔ ننگے پیر کھلے بال۔ ایک بڑا سا کنکوا ٹھیک اپنے آنگن کی چھت پر آ کے گرا تھا۔ لوگ جب تک ہائیں ہائیں کریں وہ اسے لوٹ کر خوش خوش نیچے لے آئیں۔ لیکن یہاں ایک طوفان منتظر تھا۔

بس مار نہیں پڑی کہ بہو بیٹیوں کو پیٹنا شریف گھرانوں کا دستور نہیں تھا ورنہ چار چوٹ کی پڑ جاتی۔ اتفاق سے اس دن میاں گھر نہیں آئے۔ باہر ہی کہیں (اور کہاں، اسی کلموہی کے گھر) شب باش ہوئے۔ بزرگ خواتین نے کہا کہ کسی نے کنکوا لوٹتے دیکھ لیا اور فوراً باہر ہی باہر جڑ دیا۔ (محلے داروں کا نیٹ ورک آج کے موبائل سے کم تھا کیا) غصے میں لڑکا باہر رہ گیا۔ اب سنبھالیں میاں کو۔ عادت پڑ جائے گی باہر رہنے کی۔

وہ گڑی مڑی ساری رات چور بنی جاگتی رہیں۔

میاں دوسری شام کو آئے۔ بولے امتحان نزدیک ہیں، وہ ایک دوست کے یہاں پڑھنے کو رک گئے تھے۔ وعدہ کیا آئندہ بتا کر رکا کریں گے۔ بات بڑھے نہیں اس ڈر سے کسی نے وہ پتنگ والی شکایت نہیں کی لیکن وہ تو خود ہی بول پڑیں۔

"کل ہم بہت بڑا سا کنکوا لوٹ کر لائے۔ آپ نہیں تھے۔ بڑی ڈانٹ کھائی۔ آپ ہوتے تو شاید بچا لیتے۔" وہ روہانسی ہو رہی تھیں۔

وہ پلٹ کر سونے جا رہے تھے۔ سو جاؤ، سو جاؤ۔ بے وقوف کہیں کی۔

اچھا ایک بات بتائیے۔ انھوں نے آنکھ میں آئے آنسو پونچھے۔ یہ آنسو میاں سے بے وقوف کا خطاب پا کر آئے تھے۔

"سینما دیکھنے تو جا سکتے ہیں نا؟ مغل اعظم آئی ہوئی ہے۔ سنا ہے بنے ہوئے بھی دو سال ہو گئے۔"

وہ سونے کی کوشش کرنے والے فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ تقریباً چلا کر بولے "میں تو صرف بے وقوف ہی سمجھ رہا تھا لیکن تم بالکل پاگل ہو۔ تمہیں معلوم نہیں اس حویلی سے کبھی کوئی عورت سینما دیکھنے نہیں گئی۔ میں تو سمجھتا ہوں تمہارے گھر سے بھی نہیں گئی ہوگی۔"

"امی جان کہتی تھیں شادی ہو جائے تو دولہا کے ساتھ جانا۔" اس زوردار آواز نے ان کے حواس سلب کر لیے تھے لیکن پتہ نہیں کیسے زبان چل گئی۔

بھولپن نے غصہ کچھ ٹھنڈا کیا۔ رسان سے بولے۔ ہمارے گھر کی بہو بیٹیاں صرف شادی غمی یا ضروری ملاقات کے لیے جانے کو گھر سے پیر نکالتی ہیں۔ فلم کی تو بات ہی نہ کرنا

پھر وہ آرام سے سو گئے۔

دوسرے دن میاں نے والدہ سے کہا کہ اس بے وقوف لڑکی کو سنبھال کر رکھیں۔ کل رات فلم دیکھنے جانے کو کہہ رہی تھی۔ انھوں نے سر جھکا کر بلکہ نصف گھونگھٹ کھینچ کر سن سفید دادا کی عدالت میں مقدمہ پیش کر دیا۔ وہ بڑی سنجیدہ، عبادت گزار، محترم ہستی تھے۔ اور اتنے معتبر کہ بہو بیٹیوں کو کچھ کہنا ہوتا تو وہی کہتے۔

انھوں نے سر پر ہاتھ رکھ کر ٹھہر ٹھہر کر یہ کہا۔

"بیٹا ہمیں فخر ہے آج تک ہمارے گھر کی خواتین پر کوئی انگلی نہیں اٹھی۔ شہر میں دو سنیما ہال بن گئے ہیں۔ سنتے ہیں تیسرا کھلنے والا ہے۔ ہمارے یہاں سے کسی بیٹی بہو نے قدم نہیں نکالا۔ بال کھول کر ننگے پیر کوئی عورت دہیز دہیز نہیں کرتی۔ ملازمائیں بھی نہیں۔ تم گھر کی عزت ہو۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سن سفید لیکن اونچا پورا سیدھا قد۔

اور مرد؟ اس نے ان کی مڑتی پیٹھ سے سوال کیا؟

انھوں نے پلٹ کر اس گستاخ لڑکی پر نظر ڈالی جس نے ان کے سامنے منھ سے آواز نکالنے کی جرأت کی تھی۔ واقعی احمق ہے۔ وہ آگے بڑھ گئے۔

بعد میں آنے والی دونوں دلہنوں کی شادی کو سال بھر بھی نہیں ہوا تھا کہ دونوں کے پاؤں بھاری ہو گئے۔ دونوں کی بڑی آؤ بھگت ہونے لگی۔ یہ کھاؤ، یوں اٹھو یوں بیٹھو۔ ایک ملازمہ صرف ان کے لیے مختص کر دی گئی۔ دونوں کے چہرے گلنار رہتے۔ آپس میں جانے کیا کھسر پھسر کیا کرتیں۔ کچھ عرصے بعد دونوں کو پہلی زچگی کے لیے ان کی ماؤں کے گھر بھیج دیا گیا۔

ایک دن صبح صبح پتہ نہیں کیا ایسا کام پڑا کہ کسی خاتون نے پگلی ہوئی لڑکی سنبل کو آواز دی۔

"آج کل منجھلی بھاوج کے بیٹے میں لگی رہتی ہے۔" گھر میں رہنے والی بیوہ بیٹی نے کہا۔ "پرسوں رات کسی بہانے سے انھوں نے اسے کمرے میں بلایا تھا۔ ہم نے لپ جھپ جاتے دیکھا لیکن کافی دیر کے بعد بھی نکلی نہیں تھی۔"

"نکلتے ہم نے دیکھا۔ چھوٹی بھاوج بولیں۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ ہم وضو کر رہے تھے۔ جھپ سے نکل کے بھاگی۔ جی چاہا للکاریں لیکن پھر چپ رہے۔"

[illegible]

"[illegible] دونوں [illegible] ہے۔ [illegible] زچگی کے بعد بھی [illegible]"

[illegible] خالہ جان" [illegible] ہوئی تھیں [illegible] پتہ نہیں چلا تھا۔

[illegible] رہتی تھیں بڑی دلہن۔ [illegible] چپ چپ کے بیٹھی؟"

[illegible] خالہ جان۔ [illegible] تھے۔ چپ چپ کے کہاں [illegible] رہے تھے۔"

[illegible] انھوں نے اسی رو میں کہا۔ "ہم بھی اسی [illegible]

[illegible] کی بیویوں ہی کی کھڑی ہوگی۔ [illegible] تمہارا گھر ہے۔ [illegible]"

انھوں نے [illegible] پہلے ہی بند کر دیا [illegible] خوش خبری [illegible] تب بھیج دیں گے۔

"[illegible] خوش خبری [illegible]"

[illegible]

آتے تو پیٹھ موڑ کر سو جاتے۔ سوتے اپنے کمرے میں ہی تھے۔ یہ کبھی کبھی ان کی طرف دیکھتیں تو ان نظروں میں نہ شکایت ہوتی تھی نہ گلہ۔ بس پہچاننے کی ایک کوشش۔ کون ہے یہ آدمی اور اس کو میرا جسم چھونے کا حق کس نے دیا؟ جواب انھیں کبھی نہیں مل سکا۔

پھر اتنا وقت گزر گیا کہ بزرگ ایک ایک کر کے مر گئے اور جوان بوڑھے ہو گئے۔ پتنگوں بھرا آسمان بھی اب انھیں انجانا لگنے لگا تھا۔ وہ ایک پرانے ملازموں کے سہارے زندگی بسر ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی ڈنمارک سے بیٹی کا فون آ جاتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے سے بھی بات کر دیتی تھی جو عجیب سے لہجے میں اردو بولتا تھا اور وہ سوچتی تھیں کون ہیں یہ لوگ؟ کیا ان سے ان کا کوئی تعلق ہے؟

تبھی ایک دن اس اُجڑے آنگن میں اس کا نزول ہوا — وہ جس کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ بی بی تھی یا نہیں۔

تب وہ چوراسی برس کی نہیں تھیں۔ چار برس کم تھیں۔ اور وہ ان سے کوئی بیس برس کم۔

"آپ کو یقین کرنا ہو تو کریں، نہ کرنا ہو تو نہ کریں۔" اس نے بڑی مہذب زبان میں کہا۔ "لیکن ہمیں لگا کہ کہیں جا کر رہنے سے اچھا ہے ایک بار قسمت آزما لیں۔ آپ کی خدمت کر کے باقی زندگی کاٹ دیں۔ اس حویلی پر ہمارا حق کہتے کہتے وہ رک گئی۔ اس نے جملہ بدل دیا۔ اس حویلی سے ہمارا رشتہ ہے۔"

ہمارا تو کوئی رشتہ نہیں۔ انھوں نے دل میں کہا لیکن زبان سے بولیں۔

"ہمیں کسی بات کا یقین نہیں پھر بھی ہر بات کا یقین ہے۔ کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔"

ہم — اس کی زبان لڑکھڑائی۔ اس نے ان کے مرحوم شوہر کا نام لیا۔ ان کا ہم سے تعلق تھا۔ ہماری ایک اولاد بھی تھی۔ وہ ختم ہو گئی۔ تب ہم جوان تھے۔ ہم سے بہت کہا گیا کہ ہم دھندے میں واپس ہو جائیں لیکن ہم میاں کے پابند تھے۔ ہم نے ان سے پہلے یا ان کے بعد کسی سے تعلق نہیں بنایا تھا.....

اور وہ   وہ   بی بی ہکلائیں۔ لیکن انھوں نے اپنے سوال عرصہ ہوا ہمیشہ کے لیے دفن کر دیے تھے۔ اس لیے آگے نہیں بولیں۔

"ہم مجبور ہے ہیں۔ وہ ہماری بڑی بہن تھیں۔ انھوں نے میاں سے بہت کہا کہ نکاح کر لیں لیکن وہ راضی نہیں ہوئے تب وہ کسی کے ساتھ چل دیں۔"

ہوں اوں ---

"وہ تو وہیں پڑے ہی رہا کرتے تھے۔ تب ہم سے   ہم سے   "

"تم سے نکاح کیا؟"

"نہیں۔ جھوٹ نہیں بولتے۔ اللہ کو منہ دکھانا ہے۔"

"آپ کی کنیز بن کر رہیں گے۔" ان کی خاموشی سے پریشان ہو کر اس نے کہا۔

کچھ دیر بعد انھوں نے خاموشی توڑی۔ بوڑھے منشی جی کو بلایا۔

"ان کو ایک کمرہ بتا دیجیے جس میں چمگادڑیں کم لٹکی ہوئی ہوں۔ یہ اپنا صاف ستھرا کر لیں گی۔ پھر اس سے مخاطب ہوئیں۔

"بی بی۔ آپ یہاں رہیں۔ کئی صندوق ہیں۔ ان میں اوڑھنا بچھونا مل جائے گا۔"

○

کبھی پٹنہ سے لکھنؤ جانے والی گاڑی سلطان پور جنکشن سے قریب ہو کر رفتار کم کر رہی ہوتی تھی تو دور ایک اجاڑ، اداس، ویران سا قطعہ دکھائی پڑتا تھا۔ اس میں کائی سے سیاہ ہوتی دیواروں والی حویلی بھی دکھائی پڑتی تھی۔

خاندانی گماشتہ رام نرائن، جو اب نہیں رہے تھے، کے بیٹے دیانرائن، اکثر اس گاڑی سے سفر کیا کرتے تھے۔ خاصے بوڑھے ہو چکے تھے۔ حویلی نظر آتی تو ادھر نظر ضرور ڈالتے۔ وہاں ان کی نوعمری کے کچھ سال گزرے تھے۔ کمزور نظروں کو بس پڑ تو نظر آتا اور ٹیلوں پر چرتی بکریاں۔ آس پاس بکھری قبریں۔ پھر سر ہلا کر کہتے "شاید اب وہاں کوئی نہیں رہتا۔"

○○○

میں اپنی بیوی کو پیٹتا نہیں ہوں

''آج لگتا ہے انجو کے شوہر نے اسے پھر مارا ہے۔'' بیوی نے میری شرٹ استری کر کے ہینگر میں لٹکاتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں تاسف تھا۔

انجو ہمارے یہاں صفائی کے کام پر ملازم تھی۔ جھاڑو پونچھا کرتی اور دونوں باتھ روم دھو دیا کرتی تھی۔ گرچہ کچن صاف کرنا اس کا کام نہیں تھا۔ کام پر رکھے جانے کے وقت ہی انجو نے کہہ دیا تھا کہ وہ باتھ روم میں فرش اور واش بیسن وغیرہ دھو دے گی لیکن ٹائلٹ بول (toilet bowl) نہیں صاف کرے گی۔ ''ہم سویپر (Sweeper) نہیں ہیں۔'' اس نے قدرے فخر سے کہا تھا۔ بیوی نے کہا ''اچھا وہ ہم کر لیا کریں گے۔'' وہ دراصل عرصے سے ایسی عورت کی تلاش میں تھی جو صفائی کا کام کر دے اس لیے ہر شرط ماننے کو تیار تھی۔ دوپہر میں ایک دوسری عورت آتی تھی وہ صفائی نہیں کرتی تھی۔ برتن دھوتی اور کچن کا وہ سارا کام کر دیتی تھی جسے 'اوپر کا کام' کہا جاتا ہے۔ مثلاً آٹا گوندھنا، سبزی کاٹ دینا، دال چاول دھونا اور کچن کا پلیٹ فارم چمکا دینا۔ پھر کام آسان ہو جاتا۔ رہ کیا جاتا ہے۔ بس گھر میں ہم دو میاں بیوی اور دو بچے۔ بیوی نے کئی بار اشارہ کیا کہ یہ دوسری عورت کہتی ہے کہ اسے دو ہزار اور دے دیے جائیں تو وہ کھانا بھی پکا دیا کرے گی۔

دو ہزار اور؟ ابھی وہ دو ہزار لے رہی تھی اور ناشتہ جو دراصل ہم لوگوں کے کھانے کے برابر ہی ہوتا تھا۔ تین سے چار روٹیاں، سبزی یا سالن اور خوب دودھ ڈال کر اوٹائی ہوئی چائے کا بڑا سا مگ۔ دو ہزار ماہوار اور کا مطلب ہے ایک خاصی رقم۔ میں دے تو سکتا ہوں۔ میری تنخواہ

خاصی اچھی ہے لیکن مجھے یہ خرچ بالکل بے وجہ کا لگتا ہے۔ آخر یہ محترمہ کریں گی کیا۔ دن بھر سہیلیوں سے گپ، موبائل پر چیٹنگ یا ناول بازی۔ ویسے کہتی تو ہیں کہ میں نے بیکری کا کورس کیا ہوا ہے۔ گھر پر ہی بیکری کے کلاس کھول سکتی ہوں۔ ٹی وی سے بھی آفر آیا تھا۔ اس کے لیے کئی بار اجازت چاہی۔

ٹی وی؟ ٹی وی پر آئیں تو دماغ خراب ہو جائے گا بھلے ہی کیک پیسٹری بناتی ہوئی کیوں نہ دکھائی پڑیں۔ مجھے یاد ہے ایک شیف صاحب بڑے فخر سے کہا کرتے تھے ''ٹی وی پر آتا ہوں یار'' یہ بھی گردن ٹیڑھی کر کے یہی کہنے لگیں گی۔ عورتوں میں ظرف یوں بھی کم ہوتا ہے۔ خود کو سلیبرٹی (celebrity) سمجھنے لگیں گی۔ جہاں جائیں گی لوگ کہیں گے آپ۔ آپ کو تو ٹی وی پر دیکھا تھا۔ آپ۔ آپ کی ترکیب سے بنایا ہوا کیک نہایت مزے دار تھا.. بس اڑنے لگیں گی۔ اور گھر پر کلاس؟ وہ بھی ایک مصیبت۔ ہو سکتا ہے میں گھر لوٹوں تو گھر کے فاضل کمرے میں، جسے وہ 'ورک شاپ' کا نام دینا چاہتی ہیں، موٹی موٹی عورتیں اٹھلاتی ہوئی دکھائی پڑیں۔ چپڑ چپڑ کرتی، کچھ گھولتی، کچھ کاٹتی چھیلتی، ایپرن پہن کر کچھ یوں لگتی ہوئی کہ ابھی بیلن اٹھا کر سر پر ماریں گی۔ حاصل کیا ہوگا۔ شاید دو چار ہزار بچ جائیں۔ آخر سامان خود دینا ہوگا۔ پھر بنایا ہوا آئٹم اتنا ہونا چاہیے کہ سب چکھ کر دیکھ سکیں۔ گیس یا بجلی کا خرچ الگ ہوگا۔ ہو سکتا ہے ملازمہ کو مزید کچھ دے کر ان کلاسز میں مدد کے لیے روکنا پڑے۔ ابھی تو بچوں کو خود پڑھا دیتی ہیں پھر ہو سکتا ہے کہیں کہ بچوں کے لیے ٹیوشن رکھو۔ پھر تو رہا سہا فائدہ بھی ختم۔ ارے بھائی گھر داری سنبھالو۔ ابھی بچے چھوٹے کلاسز میں ہیں ان کی پڑھائی تم سنبھال لیتی ہو۔ اب یہ اچھی کہی کہ مجھے تھوڑا sense of achievement ہوگا۔ کیا achievement۔ کیک پیسٹری بنا کے کیا خلائی سفر پر نکلو گی؟ کلپنا چاؤلہ بن جاؤ گی۔

''انجو کا چہرہ سوجا ہوا ہے۔ بازو پر نیل بھی ہے۔ ہاتھ پکڑ کر زور سے مروڑا اور پیچھے کی طرف دھکا دیا۔ ادھر کھٹیا پڑی تھی۔ چہرے کے بل اس پر گری۔ بتا رہی تھی۔''

''ایک چین، کلر دے دو۔ اور یہ ملازماؤں سے تمہیں ڈیل کر لیا کرو۔ مجھے کھانا سناؤ۔''

ہاں چائے کے ساتھ دے دیا ہے اور کام بھی ہلکا کرا دیا ہے۔ آج پونچھا نہیں لگائے گی اور باتھ روم بھی نہیں دھوئے گی۔ بس جھاڑو لوا کر واپس بھیج رہی ہوں۔ بے چاری۔

“ارے باتھ روم دُھلوالو۔ پونچھا بھلے ہی چھوڑ دے۔ بچوں والا واش روم روز دھلنا
بہت ضروری ہے۔ یہ عورتیں مار کی عادی ہیں۔ ان پر ایسا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ انجو لڑاکا بھی ہے
چپ رہنا جانتی ہی نہیں۔ شوہر غصے میں ہو تو چپ ہو جانا چاہیے۔ دو باتیں سن لینے میں عافیت ہے
تو عافیت حاصل کرلو۔”

“میں دھولوں گی دونوں باتھ روم۔” اسے بھی انجو سے کچھ زیادہ ہی ہمدردی تھی۔ “چلو
اتنی ہی ہمدردی ہے تو دے دو چھٹی۔ ویسے بھی بین تم ہی دھوتی ہو۔ باقی تو آسان کام ہو جاتا
ہے۔ روز کرلیا کرو تو پانچ سو روپے ماہوار بچیں گے جو انجو الگ سے لیتی ہے۔ تمہارے ہی کام
آئیں گے۔ لیکن بولے کون۔ اب میں بیوی سے زیادہ نہیں الجھتا۔ کچھ سوچتیں تو اسے لگی ہی
چاہئیں۔ کپڑے بھی خود دھوتی اور استری کرتی ہے۔ تو کیا ہوا۔ مشین خریدی ہے نا۔ ہاں پھیلانا،
اٹھانا، زیادہ گندے کپڑے ہاتھ سے ملنا، اور استری کی تو بھائی کوئی مشین ایجاد ہی نہیں ہوئی۔
ویسے ایک بار وہ ایجنسی سے فل ٹائم میڈ رکھنے کا ذکر کر رہی تھی۔ مجھے ٹٹول رہی تھی شاید۔ بول کر
دونوں کی جگہ ایک ہی عورت رہے گی۔ رات کو ساتھ رہے گی تو بہت آرام ملے گا۔ صبح بچوں کے
اسکول کی وجہ سے بھگدڑ ہو جاتی ہے۔ بچوں کا بہت کام ہوتا ہے۔ وہ تو بولتی ہی رہتی ہے۔ بولنے دو
وہ۔ میں اب اس کی طرف سے کان بند کرلینے میں مہارت حاصل کرچکا ہوں۔ کان نہ بند
کرپاؤں تو کوئی ری ایکشن نہ ظاہر کرنے میں تو زبردست ایکسپرٹ بن گیا ہوں۔ اس کی بک
بک کا کوئی نوٹس نہیں لیتا۔

اب یہ ایجنسی والیاں۔ ان کے ریٹ بہت اونچے ہیں۔ اوپر سے الگ رہنے کی جگہ
دیجیے۔ کہنے کو two square meals محاورہ ہے لیکن کھاتی تو چار بار ہیں۔ کپڑے، تیل،
صابن، سارا کچھ۔ میرے ایک واقف کار ہیں جن کے یہاں ایجنسی سے آئی ہوئی فل ٹائم ملازمہ
کام کرتی ہے۔ جھارکھنڈ کے جنگلوں سے آئی ہوئی آدی واسی عورت لیکن مالکن کے ساتھ شاپنگ
کے وقت باسکٹ پکڑنے کو جاتی ہے تو اپنے لیے بھی کاسمیٹکس اٹھا اٹھا کے باسکٹ میں ڈالتی جاتی
ہے۔ ہنس کر کہہ رہی تھیں، کالی ہے اس لیے فیئرنیس کریم ضرور خریدتی ہے۔ شیمپو سے بال دھوتی
ہے، وہ بھی ٹی وی میں دیکھے ہوئے قیمتی برانڈ کے شیمپو سے۔ آپ اجازت کیوں دیتی ہیں تو کا

جواب انھوں نے یہ دیا کہ بھئی خوش رہے گی تو ٹکی رہے گی۔ کام اچھا کرتی ہے۔ اب وہ بھی
انسان ہے نا۔ اب بھائی ہم تو نہ اتنا خرچ کریں نہ گھر میں ایک جھنجھٹ پالیں۔ آخر جوان جہان
عورتیں گھر میں بیٹھ کر کریں گی کیا۔ سوائے اس کے کہ کٹی پارٹیوں میں شرکت کریں، تیری میری
برائی کریں۔ اب یہ جو division of labour ہے یہ تو ہزاروں سال سے چلا آرہا ہے۔ مرد
شکار کرنے جاتے تھے، عورتیں گھر بیٹھ کر بچے سنبھالتی تھیں، کھانا پکاتی تھیں، جانوروں کی کھال
چبا کر نرم کرتیں اور ہڈی سے بنی سوئیوں اور تانت کے دھاگوں سے کپڑے سیتیں، تو آج زندگی
کتنی آسان ہوگئی ہے۔ خیر مرد بھی شکار کرنے نہیں تو سخت محنت کرنے گھر سے باہر جاتے تو
ہیں ہی۔ کہیں کہیں عورتوں نے بھی دماغ خراب ہونے (یا کبھی کبھی ضرورت کے تحت) باہر جانا
شروع کیا ہے تو ان کے گھروں کا حشر دیکھ لیجیے۔ بچے رُلتے ہیں۔ شوہر شام کو آیا تو بیوی
ندارد۔ یا ہے تو تھک کر ہائے ماں ہائے باپ کر رہی ہے۔ شوہر سے امید کر رہی ہے کہ چائے خود
بنا کر پئے۔ بلکہ اسے بھی پلا دے۔ اب ای انجو کو دیکھ لیجیے۔ کیا فائدہ ہے۔ روز تو مار کھاتی ہے۔
پیسے کماتی ہے تو میاں چھین کے پی جاتا ہے۔ نہ کمائے نہ پیسے چھنیں۔ گھر بیٹھ کر شوہر کی کچھ زیادہ
خدمت کرے تو شاید وہ رام ہو جائے۔ پیسہ کمانے کی اکڑ بھی تو دکھاتی ہے۔ لیکن بھائی کچھ بھی ہو،
عورت پر ہاتھ اٹھانا ہے نہایت گھٹیا حرکت۔ میں نے کبھی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ حالاں کہ عورت
کو مارنے کی اجازت مذہب نے بھی دے رکھی ہے۔ گرچہ بہت نافرمانی کرے تب ہی۔ بھائی
ہم نے تو بہت نافرمانی برداشت کرلی۔ ہاتھ نہیں اٹھایا۔

اب کوئی چھ مہینے بھی نہیں ہوئے۔ یہ ہماری محترمہ چل دی تھیں میکے۔ بہت منع کیا
تھا کہ وہاں نہیں جانا ہے۔ پچھلی بار جب ہم گئے تھے تو ہمیں اپنی کچھ ہتک محسوس ہوئی تھی۔ تو اسی
وقت سوچ لیا تھا کہ اب ان کی بیٹی میکے نہیں آئیں گی۔ ان کے ابا بیمار پڑ گئے تو انھوں نے بڑی
منت سماجت کی۔ ہم ٹس سے مس نہیں ہوئے لیکن ایک دن ادھر ہم آفس گئے اُدھر انھوں نے
بچوں کو سمیٹ کر بس کا ٹکٹ کٹایا اور چل دیں۔ چابی پڑوس میں دے گئی تھیں۔ دو دن کے لیے
وافر کھانا فریج میں تھا۔ کپڑے پریس کر کے ہینگر میں لگا گئی تھیں لیکن ہم کو ان چیزوں کی کیا
ضرورت۔ دو دن کھانا ہوٹل میں کھا لیتے۔ کسی دوست کے یہاں چلے جاتے۔ کپڑے دھوبی کو

برا میں کسی کا نہیں چاہتا۔ اپنی بیوی کا تو قطعی نہیں۔ مرگئی تو میرے بچے کون پالے گا۔ دونوں بیٹے
ہیں۔ خاندان چلنا ہے ان سے۔ وہ بے چاری بلڈ پریشر کی مریض تھیں، ایک دن برین ہیمرج
ہوگیا۔ بے ہوش ہوکر گریں تو پھر ہوش میں نہیں آئیں۔ اب ایز صاحب روتے پھرتے ہیں۔
سنتے ہیں پینا کم کردیا ہے اور بچوں کی طرف دھیان دے رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے دوسری کی فکر میں
ہوں۔ یہ ایسے عہدے ہیں کہ لوگ بیٹیاں دیتے ہوئے کچھ نہیں سوچتے۔ پاپا بتاتے ہیں کہ ان کے
وقت میں ایک آئی۔اے۔ایس افسر تھے جنھوں نے بیوی کو قتل کردیا تھا۔ ساری دنیا جانتی تھی کہ قتل
انھوں نے ہی کیا ہے لیکن تگڑم بازی کرکے نہ صرف باعزت بری ہوگئے بلکہ دو چار سال میں
دوسری شادی کرلائے۔ اب یہ ایز صاحب نے ادھر پینا کم کیا ہے یا کیا بھی ہو تو الکوحلک مشہور تو
ہیں ہی۔ اوپر سے بیوی کو آئے دن پیٹنے کے قصے بھی طشت ازبام ہیں۔ بیوی اسی لیے
آئی۔پی۔ایس سرکل میں کم ملتی تھیں، لیکن مل ہی جائے گی کوئی قسمت کی ماری۔ اب بھائی ہم تو پیتے
پلاتے نہیں بس کبھی کبھار کسی پارٹی میں دوستوں کے ساتھ ایک آدھ پیگ لے لیا۔ وہ بھی محترمہ کو
پسند نہیں تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ ایک دوبار سرور میں تھوڑی زیادتی ہوگئی۔ سوچکی تھیں، جگا کر
تو ایسا کیا ہوگیا۔ بیوی ہے کس لیے؟ یہ فیمنسٹ عورتیں تو سوگ منوا رہی ہیں۔ Marital rape
کی اصطلاح ایجاد کی ہے۔ امریکہ میں تو ریپ کے اعداد و شمار میں یہ دردن رشتۂ ازدواج ریپ بھی
شامل ہیں۔ ایک شوشہ اور بھی ہے کہ بیوی جو کام کرتی ہے اس کے لیے اسے کچھ تنخواہ ملنی چاہیے۔
دراصل پیٹنے کی ضرورت تو ان فتوری دماغ والیوں کو ہے۔ میری تو عقل حیران ہے۔ بیوی کو روٹی
کپڑا مکان سب کچھ تو ملتا ہے جو اس کا حق ہے۔ ہم جیسے اونچے متوسط طبقے والوں کے یہاں تو اور
بھی بہت کچھ مل جاتا ہے۔ عمدہ کپڑے، زیورات، ملٹی پلکس میں فلم اور کھانا۔ بیوٹی پارلر... بس
میں نے یہ بیوٹی پارلر والا معاملہ ختم کرادیا ہے۔ اوسط درجے کی صورت اوسط ہی رہے گی۔ اور حسن
ملا ہے تو اسے سنگار کی کیا حاجت۔ پچھلے ماہ بیس تاریخ کو ہی انھوں نے اعلان کیا کہ پیسے سب ختم
ہوگئے۔ میں نے حساب مانگا تو دیکھا پندرہ سو بیوٹی پارلر کا دو مرتبہ کا بل تھا۔ میں جھنجھلا سے اکھڑ
گیا۔ آئندہ یہ خرچ نہ دیکھوں، بالکل بیکار کی مد ہے۔ دوسری عورتیں جاتی ہیں؟ جائیں۔ ان کے
میاں کم توجہ دیتے ہوں گے۔ ہم تو تمھیں روز توجہ دیتے ہیں۔ تمھیں اکثر اڑیل گھوڑی کی طرح

بدکتی ہو۔
کیا کہا؟ حمل کا ڈر؟ ارے تو پلز (pills) لے رہی ہوتا۔ پچھلی بار تم نے کچھ ناغہ ضرور کیا
ہوگا جو حمل ٹھہر گیا۔ ایک تو پریشانی اوپر سے میرا سر کھایا کہ بچہ ہوجانے دو، ڈلیوری کے وقت ہی
آپریشن کرالوں گی۔ ارے بھائی مجھے نہیں چاہیے تھا تیسرا بچہ۔ دونوں بیٹیاں ہوتیں تو شاید سوچ
لیتے۔ وہ بھی جب دوسرا پانچ برس کا ہوچکا ہو۔ تیسرے کا خرچ کہاں سے آتا؟ تمہارے ابا
دیتے۔ پھر وہی نوکری پہ تان ٹوٹی۔ اب تو وہ تمہاری مینٹور (mentor) مسز ایز بھی نہیں رہیں
تھیں۔ پھر بھی تمہارا یہ نوکری کرنے کا فتور برقرار تھا۔ نوکری کروگی اور تین تین بچے پالوگی؟ اب
اگر میں ایز صاحب ہوتا تو دھن کے رکھ دیتا ضد کرنے اور منھ پھلانے پر۔ مشکل یہ ہے کہ میں
شریف آدمی ہوں، بیوی پر ہاتھ قطعی نہیں اٹھاتا۔ اس کا مطلب یہ تھوڑی ہوا کہ سر پہ چڑھ جاؤ۔
میڈیکل ٹرمینیشن اتنا آسان ہوگیا ہے۔ یک لیڈی ڈاکٹر بتا رہی تھیں ---تم بھی تو تھیں
ڈرائنگ روم میں --- کہ لونڈے کہیں بڑا احتیاط کرتے ہیں تو بس لڑکی کو بائیک پہ پیچھے بٹھایا اور
لے آئے۔ اسقاط کرادیا۔ چند گھنٹوں کے بعد ہی واپس پیچھے بٹھایا اور چھوڑ آئے گھر۔ اب اگر تم
نے اسقاط کرایا تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ تمھیں تو سماج کا خوف بھی نہیں۔ دوبارہ چیک اپ کی
ضرورت پڑی، آرام سے چلی گئیں۔ ہم ساتھ ساتھ رہے۔ ٹانک اور دواؤں کے لیے پیسہ دیا۔
اب اس بات کے لیے اتنا منھ پھلانے کی کیا ضرورت تھی۔ مہینوں آفس سے واپسی پر تھوبڑا چڑھا
ہوا دیکھا۔ رانی روٹھیں گی، اپنا سہاگ لیں گی۔ یہ مثل شاید کبھی سنی نہیں تھی۔ کچھ دن تو میں نے
برداشت کیا پھر میں نے آفس کے بعد سیدھا گھر آنا چھوڑ دیا، دیر سے آتا۔ کھانا عموماً باہر ہی
کھا لیتا۔ اب اس گدھے جیسی اداس تھوتھنی کے ساتھ کھانا کھلاؤ گی تو کیسے لگے گی بھوک۔ لگی بھی
ہو تو غائب ہوجائے اور جی چاہے کہ ایسی چار چوٹ کی مار دی جائے کہ دماغ ٹھکانے آجائے۔
لیکن پھر وہی اپنی ہی لگائی پابندی کہ عورت پہ ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ آگے سے حمل سے بچنا ہے تو پلز میں
احتیاط برتو۔ دماغ ادھر ادھر لگا رہتا ہے، یاد نہیں رہتی ہوگی۔
اب یہ ڈبل پروٹیکشن کی بات بیکار ہے۔ کنڈوم کے سارے اشتہار اتنے ہی جھوٹے
ہیں جیسے رنگ گورا کرنے والی کریم کے اشتہار۔ بھلا ہو تمہارا کہ برساتی پہن کے نہانے کو رائے

دو۔ حول ول قوۃ۔ اب یہ حمل اور زچگی عورت کا دردِ سر ہے تو وہ کرے انتظام کر جھیلے مرنہ
پڑے۔ آخر ملک کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ شرحِ صد مانعِ حمل آپریشن عورتیں ہی کرا رہی
ہیں۔ اب بچے دس اور آٹھ سال کے ہو چکے ہیں۔ جاؤ کراؤ آپریشن اگر حمل کا ایسا ہی خوف ہے
مجھے محروم رکھو گی تو باہر عورتیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بیماریوں کا ڈر اور پھر خدا کا خوف بھی۔ حرام
کام کیوں کروں۔ لوگوں کو معلوم ہوا تو باتیں بنائیں گے۔ آخر تمہیں کیوں پیار رکھا ہے۔ دیکھو
مجھے زیادہ غصہ مت دلایا کرو۔ کہیں قابو کھو بیٹھا تو اتنے دن کی ریاضت بیکار جائے گی کہ کبھی بیوی
پہ ہاتھ نہیں اٹھایا۔

ooo

بلّیاں

"جب ہم چھوٹے سے تھے تو ہماری اماں ہمیں جلے پیر کی بلی کہا کرتی تھیں۔ پیر جلا تو نہیں ایک بار مڑ ضرور گیا تھا۔ اصل میں بات یہ تھی کہ گھومنے پھرنے کے لئے آس پاس بہت سے گھر تھے۔ دیوار بیچ ماموں کا گھر تھا اور تین چار گھر چھوڑ کر چچا میاں کا۔ دیوار میں کھڑکی تھی۔ ہم اس سے کود کر نیچے اتر جاتے تھے۔ بس ایک مرتبہ آ گئی موچ۔ ممانی نے پہلے تو بڑی ڈانٹ پلائی پھر گرم پانی میں نمک ڈال کر سنکائی کی۔ ہلدی ڈال کر ایک گلاس گرم دودھ پلایا۔ ہم نے کہا اماں سے مت کہئے گا ورنہ ادھر سے آنا جانا بند کرا دیں گی۔ کیا پتہ جو کھڑکی چنوا دیں۔ دروازے سے نکل کر سڑک سے ہو کر آنے میں بڑی قباحت ہے۔ برقعہ اوڑھنا پڑتا ہے۔ پتہ ہے نوشیرواں، ہم صرف نو برس کے تھے کہ ہمیں برقعہ پہنا دیا گیا تھا۔ اب یہاں اتنے گھر ساتھ ساتھ ہیں لیکن کوئی کسی کے یہاں آتا جاتا ہی نہیں اور تو اور گھر کے لوگوں تک کو فرصت نہیں کہ ہم سے بات کریں۔"

"میاؤں۔" نوشیرواں نے آنکھیں کھینچ کر دُم ہلائی

"ہنستا ہے کم بخت۔" عذرا نے چٹ سے اس کے گول گول سر پر ایک چپت لگائی۔ اگلے جنم میں عورت بن کر پیدا ہوئیو۔ وہ بھی ایسے گھر میں جہاں نو برس کی عمر میں برقعہ اڑھا دیا جائے۔ اسکول جائیں تو پیچھے پیچھے، پنا پاندان سنبھالے ایک عدد ملازمہ چلے۔"

نوشیرواں نے پوری آنکھیں کھول کر اپنی مالکن کو قدرے حقارت سے دیکھا، منہ پھیر کر نکالا اور دھپ سے بیجا اوہ جا۔

"اب تو نے بھی ان سب کا چلن سیکھ لیا ہے۔ بغیر پوری بات سنے بھاگ نکلا۔ بلی کی

اولاد، تیرے پاس بھی وقت کی کمی ہوگئی۔ جب ہم کم عمر تھے جب کسی کو وقت کی کمی نہیں تھی۔ نہ بلیوں کو، نہ انسانوں کو۔"

ہمارے یہاں بہت سی بلیاں پلی ہوئی تھیں۔ کالی، سفید، بادامی، چتکبری، اتنا بڑا گھر تھا، پتہ بھی نہ چلتا۔ اب یہاں سب کو صرف تین بلیوں پر اعتراض ہے۔ اصل میں کریں کیا۔ گھر جیسا گھر بھی تو نہ رہا۔ بس اوسط درجے کے دو کمرے، ایک قدرے بڑا ڈرائنگ کم ڈائننگ اور ایک چھوٹا سا زائد کمرہ جو ہمارے گھر ہوتا تو کمرہ نہیں کوٹھی کہلاتا جس میں جلاون کی لکڑی رکھی جاتی تھی۔ وہ ٹی وی روم کہلاتا ہے۔ اتنی مکانیت تو ہمارے یہاں مردان خانے کے ایک بازو میں تھی۔ جانے بلیاں کہاں کہاں ڈیکی رہتیں۔ کوئی دس بجے صبح منشی جی سودا سلف لے کر آتے۔ کنڈی کھڑکی نہیں کہ کوئی یہاں سے کودی، کوئی وہاں سے اچھلی۔ دُم کھڑی کر کے کچھا سا بنا لیتیں اور منشی جی کا طواف شروع۔ وہ جلتے گوشت الگ کر کے چھیچھڑوں کا دونا نکالتے۔ بڑے بڑے ہرے پتوں کے دونوں میں فالسے، کھرنیاں اور جامنیں ہوتیں اور بھی نہ جانے کیا کیا۔ جیسا موسم ویسی چیزیں۔ جامن کھا کھا کے ہم بچے اپنا منہ اُودا کر لیتے اور نیلی نیلی زبان نکال کے ایک دوسرے کا منہ چڑاتے۔

عنبر ادھر سے گذری تو عذرا جھٹ سے خاموش ہوگئیں۔ بلکہ بڑی سختی سے لب یوں بھینچے کہ دہانہ ایک لکیر جیسا دکھائی دینے لگا۔

ضرور اس وقت یہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہوں گی یا کسی بلی سے، بلی آس پاس تھی نہیں لیکن عنبر یہ چہرہ بخوبی پہچاننے لگی تھی۔ کسی بلی سے باتیں کرتے ہوئے پکڑے جانے کے خدشے کے تحت چہرے کی کیفیت بالکل ایسی ہی ہو جاتی جیسے کوئی بچہ نعمت خانے سے مٹھائی چرا کر بھاگتے ہوئے ڈر گیا ہو۔

پتہ نہیں کیا کیا فضول قصے سناتی رہتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ لوگ سنیں۔ اور تو اور خود ان کا بیٹا جان بچا کر بھاگتا ہے۔ چند دن کی ہی بات ہے بتا رہی تھیں کہ ایک مرتبہ بچپن میں ان کے ماموں نے انہیں پیٹا تھا۔

"محمودہ بُوا ہنڈیا بھون رہی تھیں۔ ہماری ضد تھی کہ بھنتے ہوئے گوشت میں سے ایک

بوٹی اسی وقت نکال کر ہمیں دی جائے۔ تبھی گوالا آ کے بھوری بھینس کا دودھ نکال کے گیا تھا۔ ہمارے حصے کی چھلکتی بالٹی اٹھائے ماموں خود چلے آرہے تھے۔ زمین پر لوٹتے دیکھا تو آؤ دیکھا نہ تاؤ لگائے دو چار کس کے۔"

"ممّا۔ وہ میں نے گیس پر دودھ چڑھایا ہوا ہے۔ آپ کی بھینس سے یاد آیا" معقول بہانہ مل گیا تھا، چپل گھسیٹتی بھاگی۔

وہ دودھ چڑھانے کا وقت نہیں تھا۔ دودھ کے پیکٹ حسب معمول صبح آ کر اُبالے جا چکے تھے۔ عذرا نے بالکونی پر چہل قدمی کرتی بلی کو گود میں اٹھا لیا۔ "دیکھا مہر نگار بہو کے پاس ہمارے لئے وقت نہیں ہے۔ بہانہ بنا کے بھاگی ہے۔ ہم تو دراصل اس لئے وہ واقعہ سنا رہے تھے کہ بتائیں کہ پہلے چچا، ماموں سب مل کر بچوں کی تربیت کیا کرتے تھے۔ آج کی طرح تھوڑی ہی کہ دادی۔ نانی تک کو بولنے کا حق نہیں۔ پیار کرو تو بگاڑنا کہلائے اور تنبیہ کرو تو ناراضگی کہ یہ کون ہوتی ہیں بولنے والی۔ تنبیہ ہم خود اس وقت کریں گے جب غلطی ہمارے حساب سے غلطی کہلائے۔ ارے صاحب اب تو کہانی سنانے کا حق بھی نہیں رہا۔ نوید کو کوے کی کہانی سنائی تھی جو چڑیا کے بچے کھانا چاہتا تھا۔ عنبر کو اعتراض ہوا کہ بچہ الٹے سیدھے الفاظ سیکھ رہا ہے۔ بچہ تو کہانی سن کر بہت خوش ہوا تھا۔ کوے کی شکست میں اسے بہت مزا آیا تھا اور جن الفاظ کو عنبر نے الٹا سیدھا ٹھہرایا ان پر تو وہ بہت ہنسا تھا" بھریں پھٹلو، دھویں چنچلو کھائیں چڑی کے چونگلے، منکائیں اپنی چونچ۔"

"ممّا، آپ تو پڑھی لکھی ہیں۔ عنبر نے احتجاج کیا تھا اور نوید کو بری طرح ڈانٹا تھا کہ کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ اس کی کہانی کی کتاب رکھی ہے اس میں جو کہانیاں ہیں وہ پڑھ کے سنا دیجئے۔ ابھی نوید وہ کہانیاں پڑھ نہیں پاتا۔ آپ یہ کیا سکھاتی رہتی ہیں۔ کچھ دن پہلے ایک چڑیا کی کہانی سنائی تھی تو یہ حضرت سارے میں گاتے پھرتے تھے، نانی میرے بچڑے لک کُروں کُروں ــــــ" کیا مطلب ہوا ان لفظوں کا؟

"بیٹا یہ کہانیاں ہماری تہذیب سے جڑی ہوئی ہیں اس لئے کہ ہماری مٹی سے اگی ہیں۔ اب اس انگریزی کی کتاب میں گولڈی لاک، اسنو وہائٹ، سنڈریلا وغیرہ کی جو کہانیاں ہیں

ان سے پانچ سال کا بچہ کس حد تک خود کو جوڑ پائے گا۔"

"ممّا، آپ کے وقت سے اب تک تہذیب کتنی تبدیلیوں سے گزری ہے، آپ کو تانا پڑے گا کیا؟ اب یہ الفاظ ارے اس کی انگریزی مضبوط کیجیے نہ۔" کہتی ہوئی عنبر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ رکی تو شاید وہ پورا لیکچر پا نے لگتیں اپنی تہذیب اور اپنی مٹی کے بارے میں۔

"کہانیاں بھی کہیں پرانی ہوتی ہیں مہر نگار؟" انہوں نے حیران ہو کر بلی سے پوچھا اس لئے کہ اور کوئی نہیں تھا جس سے پوچھتیں۔ "الف لیلہ کب لکھی گئی تھی مہر نگار؟ اور پنچ تنترا؟ سیکڑوں سالوں سے یہ کہانیاں ہمارے چاروں طرف گھوم رہی ہیں۔ وقت کو شکست دینے والی یہ کہانیاں۔ اب وہ "نانی میرے بچھڑے لے "راجستھان کی چڑیا کی کہانی تھی جس کے بچے کوئی اٹھا لے گیا تھا۔ بین کرتی، گھومتی چڑیا، آخر کو انہیں ڈھونڈ کر لے آئی۔ نوید کی آنکھوں میں کہانی کے انجام پر چمک آ گئی تھی۔ بچے اپنی ماں سے مل لئے۔ نہ دادی ۔۔۔" اس نے تالی بجائی تھی۔

"میاؤں۔" مہر نگار نے منہ اٹھا کر تائید کی۔ ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔

"ہم بری ساس نہیں مہر نگار کہ بہو کی شکایت کریں۔ اب بیٹی کو لندن فون لگایا تھا۔ اس کے وقت کا خیال رکھا تھا۔ وہاں دن کے خاصے بارہ بج رہے ہوں گے۔ جھنجھلا گئی کہ سوتے سے جگا دیا۔ پانچ سات دن ہی تو ہوئے کہ بات کی تھی اور نو نیوز از گڈ نیوز (no news is good news) پریشان مت ہوا کرو۔" اس نے فون بند کر دیا۔ یہاں بھی وہی حال ہے۔ سنیچر اتوار والا ویک اینڈ سسٹم یہاں بھی لاگو ہو گیا ہے۔ میاں بیوی دونوں گیارہ بجے کے بعد ہی اٹھتے ہیں۔ بچہ اٹھ جاتا ہے تو ٹی۔ وی کھول کر کارٹون لگا لیتا ہے۔ اب مجال ہے جو وہاں سے ہل جائے! آنکھیں بھی جھپکا لے۔ چھٹی کے دن تو بیٹا بہو پاس بیٹھتے گپیں کرتے۔ ہم چھٹی کے دن بھی کمرے سے بالکونی، بالکونی سے کمرہ کرتے رہتے ہیں۔ بلی نے دونوں پنجوں سے منہ صاف کیا۔

"ارے چوہا کھا کے تو نہیں آئی؟ کسی بے چاری گوریا کو تو نہیں مارا؟ دیکھیں ذرا۔ موہنہ صاف کر رہی ہے۔" وہ اس کو اٹھا کر آنکھوں کے قریب لے آئیں۔

"ممّا، کیا بلیوں کو گود میں اٹھائے رہتی ہیں۔ ان کے بالوں سے الرجی ہو سکتی ہے۔ گھر میں بچہ ہے، وہ بھی انہیں پکڑتا پھرتا ہے۔" سراج کئی بار جھنجھلایا تھا۔

"ارے تمہاری ماں بلیوں کو گود میں اٹھائے ہی نہیں رہتیں وہ ان سے باتیں بھی کرتی ہیں۔ میرے خیال میں تو انہیں کسی کاؤنسلر کے پاس لے جانا چاہئے۔"

"تم عورتیں شوہر کی ماں میں کوبڑ ڈھونڈنے کی عادی ہوتی ہو۔ لاکھ پڑھی لکھی ہو، انگریزی میں زنقدیں لگاؤ، کمپیوٹر کے کل پرزے فٹ کر دو مگر ۔۔ " وہ زور سے ہنسا تھا۔

"قسم خدا کی۔ گھر میں رہو تو معلوم ہو کہ گھر میں کیا کیا ہوتا رہتا ہے، صبح گئے رات کو لوٹے 'نہ کھیت کی خبر نہ کھلیان کی'۔ یہ تمہاری ماں کا محاورہ استعمال کر رہی ہوں۔"

عنبر نے جلدی سے کھیت کھلیان جیسی دیہاتی بات کرنے کی تاویل پیش کی۔

"اصل بات یہ ہے کہ ممّا کے میکے میں بہت سی بلیاں تھیں۔ ممّا کو بلیوں سے ہمیشہ انسیت رہی۔ پھر یہ کہ پاپا نے بھی ان کے اس شوق پر اعتراض نہیں کیا۔ گھر ان کا بھی خاصہ بڑا تھا۔ تمہیں ان کی محبت کی وجہ سے دھوکا ہوا ہوگا۔"

اس بار ہنسنے کی باری عنبر کی تھی۔ "اور تم مرد! تم ہمیشہ اپنی ماؤں کے کوبڑ چھپانے اور بیویوں کے کوبڑ ابھارنے میں لگے رہتے ہو۔"

"کیوں نہ ابھاریں! تم ڈال ڈال تو ہم پات پات۔" سراج بولا تو ہنس کر تھا لیکن اچانک ہی رنجیدہ ہو گیا۔ یہ محاورہ جو اس نے پہلے کبھی استعمال نہیں کیا تھا پاپا کے آخری جملوں میں سے تھا اور آج اس کے منہ سے بے ساختہ، غیر ارادی طور پر ادا ہو گیا تھا۔

پاپا کو شکایت تھی کہ آج کل نوجوانوں نے محاورے بالکل بھلا دیے ہیں محاورے جو زبان کو دھار اور چاشنی دونوں دیتے ہیں۔ چلئے محاورے نہ سہی زبان بھی کیا بول رہے ہیں۔ ہر چار الفاظ کے بعد پانچواں انگریزی۔ اردو کو ہندی کہنے پر مصر۔ عنبر آئیں بیاہ کے خالہ کو کھالہ کہتی ہوئی۔ رہی بیٹی تو بیاہ کے بعد انگلینڈ چلی گئی اس کے بچے تو اردو سے قطعی نابلد۔ کس کس کا رونا روئیے۔ پاپا زیادہ بیمار پڑے تو سراج انہیں جہان آباد سے اٹھا کر بنگلور لے آیا انہوں نے بہت احتجاج کیا۔ کہا ہمارے فیملی ڈاکٹر علاج کر رہے ہیں انہوں نے ایسا کچھ نہیں کہا ہے کہ مرض ان کے قابو سے باہر ہو گیا ہے آپ کہیں اور لے جائیں۔ بنگلور کے ایک بڑے ہسپتال میں کئی طرح کی جانچ کے بعد ڈاکٹر دوائیں بدل رہے تھے تو پھیکی سی ہنسی ہنس کر وہ بولے۔ "میاں بدلتے رہو

دوا ئیں۔ مرض کہتا ہے تم ڈال ڈال تو ہم پات پات" اور آنکھیں بند کر لیں۔ ہفتہ بھر کو ما میں رہے۔

ان کے انتقال کے بعد سراج نے ماں کو واپس نہیں جانے دیا۔ نہ ماں کو نہ انہیں۔ جسد خاکی وطن پہنچانے میں بڑے جھنجھٹ تھے۔ کوئی ڈائریکٹ فلائٹ نہیں تھی۔

"مما آپ ہی کہتی ہیں کہ نانی کہا کرتی تھیں کہ انسان کو اس کی مٹی بلاتی ہے۔ اب پاپا کی مٹی یہاں کی ہی تھی۔" سراج نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

مما خاموش رہیں۔

بہت دن بعد انہوں نے بیٹے کو گود میں اٹھا کر کہا۔ "انہیں اپنی جگہ، اپنے بنائے مکان، اپنے لگائے چھوٹے سے باغ سے بڑی محبت تھی نوشیرواں۔ تم بلیوں کو تو کوئی بوری میں بھر کر میلوں دور چھوڑ آئے پھر بھی اپنی جگہ واپس آ جاتی ہو۔ گھر سے یہ محبت تمہاری سمجھ میں آتی ہو گی نہ نوشیرواں۔ اب وہ یہیں دفن ہوتے ہوتے تو" نوشیرواں نے ان کی گود میں گھس کر ناک رگڑی۔

"ان بلیوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔" بڑبڑاتی ہوئی عنبر نے زور کے کھٹکے کی آواز سے نیند بھری آنکھیں کھولنے کی کوشش کی پھر سلیپر میں پیر ڈالتی ہوئی بستر سے اتر آئی۔ سراج گہری نیند سویا ہوا تھا۔ ان مردوں کی نیند۔ پورا گھر، مع اماں اور ان کی بلیاں بیوی کے حوالے کر کے آرام سے سوتے ہیں۔ پتہ نہیں کیا گرایا ہے کسی کم بخت بلی نے۔ پہلے تو انہوں نے ایک پالی تھی۔ وہ تھی مادہ۔ کچھ ہی دنوں میں بچے دے ڈالے۔ اب یہ ضد کہ دونوں ہولگڑے بھی یہیں پلیں گے۔ سراج نے کہا مما یہاں رہنے پر راضی نہیں تھیں۔ ہم نے مجبور کیا۔ اب ان کا ایک شوق پورا ہو جانے دو۔ پاپا آنے کے بعد جلد ہی ختم ہو گئے۔ ان کو تنہا وہاں چھوڑنے کا تک نہیں۔ بڑے سے مکان سے فلیٹ میں آ کر رہنے میں تکلیف تو ہو گی ہی۔" مکان کا کیا کرو گے؟" عنبر کے پوچھنے پر اس نے کہا مکان پڑا رہنے کی بھی تک نہیں۔ مما کو راضی کرتا ہے اور فاطمہ سے بھی پوچھ لینا ہے۔ پھر بکوا دیں گے۔ فلیٹ کے لئے لیا گیا قرض پورا نہیں تو بہت بڑی حد تک ادا ہو جائے گا۔ سن کر عنبر بے حد خوش ہو گئی۔ چھ ماہ ہوتے ہوتے سارے کام مکمل ہو گئے۔

مکان بکا تو زیادہ تر سامان بھی اونے پونے بک گیا۔ فلیٹ میں مما کی پینتیس برس کی گرہستی کہاں سماتی۔ نئے مالک نے باغ کٹوا دیا۔ اس جگہ پر کچھ بنوانے کا ارادہ رہا ہو گا۔ پھلوں

کے درخت، پھولوں کی کیاریاں سب روند دیے گئے۔ پنجرے کھول کر چڑیاں اڑا دی گئیں بلیاں تتر بتر ہو گئیں۔ فاطمہ کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ بہت متمول تھی۔ اس نے تو فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ تک کہہ دیا کہ سراج چاہے تو اس کے حصے کی رقم رکھ سکتا ہے۔" مکان بیچنے کے نام سے ہمارا دل ڈوبنے لگتا ہے مہر نگار۔" عذرا نے بلی کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آنسو بھری آنکھوں سے کہا لیکن بیٹے سے کچھ نہیں بولیں۔ اس لئے کہ منطق پر دماغ سے غور کیا جائے تو بالکل صحیح تھی۔ رہا دل، تو دل تو احمق ہوتا ہے۔ صحیح کہا ہے مہا تما بدھ نے کہا کہ ہمارے سارے دکھوں کی جڑ ہماری دنیا سے وابستگی میں پوشیدہ ہے۔ اب بچوں کو مکان سے محبت نہیں تو انہیں دکھ بھی نہیں۔ سچ دو بھائی۔ ہم اپنے دکھ، اپنی محبتیں دل میں لے کر جیتے رہیں گے۔ ہمیں کتنے دن جینا ہے۔ تو بھی کہیں چلی جا نا مہر۔" آنسو ان کے گالوں سے ہوتے ہوئے بلی کے سفید ملائم بالوں میں جذب ہو گئے۔

"پتہ نہیں کیا گرایا ہو گا۔ اب اسی وقت بجلی بھی جانی تھی۔" عنبر نے سرہانے رکھی موم بتی جلائی اور ہاتھ سے لو بچاتی نیند بھرے قدم اٹھاتی بلیوں کو کوستی کچن کی طرف آئی۔ وہاں اس نے جو دیکھا اس پر اسے یقین نہیں آیا۔

"اور جب ہمیں بتایا گیا تو ہمیں بھی یقین نہیں آیا نوشیرواں۔"

"فرج کھلا ہوا تھا اور وہاں آپ کھڑی تھیں۔ بالکل ساکت۔ آنکھیں کھلی تھیں لیکن ان میں کوئی پہچان نہیں تھی۔ آپ نے مجھے دیکھنے سے انکار کر دیا تھا ہاں آپ کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے مما۔ کچھ چاہئے؟ پانی تو سراج نے آپ کے سرہانے رکھا تھا نہ؟ کچھ بولئے تو سہی۔ مجھے بڑی گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ آپ نے پھر بھی جواب نہیں دیا تو شانوں پر ہاتھ رکھ کر ایک ہاتھ سے موم بتی سنبھالتے آپ کو آپ کے کمرے میں لائی۔ نوید بے خبر سویا پڑا تھا۔ آپ کی طرف میں نے آپ کو لٹا دیا۔ آپ خاموشی سے لیٹ گئیں۔"

پھر اس نے دوسرے دن سراج سے کہا" کل رات میں بہت ڈر گئی تھی۔ تمہاری ماں کو نیند میں چلنے کی بیماری ہو گئی ہے۔ بلیوں سے باتیں تو کرتی ہی رہتی ہیں۔ انہیں کسی کاؤنسلر کے پاس لے جاؤ۔ نوید ان کے پاس سوتا ہے۔ دن میں بھی ہم دونوں ملازمت پر نکل جاتے ہیں تو انہیں کی تحویل میں رہتا ہے۔" نوشیرواں یقین کرو ہماری عادت کن سوئیاں لینے کی نہیں ہے۔ یہ

محض اتفاق تھا کہ ہم سن رہے تھے۔ ہو سکتا ہے عنبر نے احتیاطاً جان بوجھ کر نہ بولی ہو۔ جاتی ہو کر ہم سن لیں۔ آخر سچ ہی تو کہہ رہی تھی۔ اور نوشیرواں۔ ذرا تو ہم بھی بہت گئے ہیں۔ ہم ان کے پاس کیوں آئے تھے؟ سجاد کی دوائیں فرج میں رکھی جاتی تھیں۔ کیا انہیں دیکھنے آئے تھے؟ کیا ہمیں لگ رہا تھا سجاد ابھی زندہ ہیں؟ ہم گھر واپس لوٹ جائیں گے؟ گھر اس بار گھر بڑا زور ہے۔ لیکن ہم کہہ کیا رہے تھے؟ نیند میں بول رہے تھے۔ پھر عنبر نے ایک عجیب بات کی۔ سراج سے پوچھا کیا تمہاری طرف ایک لفظ 'بھاجڑ' استعمال ہوتا ہے؟ اس کے کیا معنی ہیں؟

بھاجڑ؟ سراج ہنسنے لگا تھا۔ موزے پہنتے پہنتے بولا تم نے کہاں سے سن لیا؟ ایسا تو کوئی لفظ، میں نے تو نہیں سنا۔

"شاید میں نے کچھ غلط سنا ہے۔ رات کو ممّا جب بیدار ہی تھیں تو میں کان قریب لائی تھی یہ سننے کے لئے کہ انہیں کچھ چاہیے تو نہیں لیکن وہ تو کہہ رہی تھیں ارے بھاجڑ پڑ گئی رے۔"

"دیر ہو رہی ہے عنبر" سراج نے اس کے ہاتھ سے ناشتے کی باسکٹ تقریباً چھین لی اور نکل پڑے لپ جھپ اٹھا کر بھاگا۔ ناشتہ وہ گاڑی میں کرے گا۔ فلیٹ کی قسطوں کی طرف سے راحت مل گئی ہے تو اس نے ڈرائیور رکھ لیا ہے۔

"دیر تو آج مجھے ہو گئی ہے آج ممّا دیر سے اٹھیں۔ نوید کو مجھے تیار کر کے چھوڑنا ہے کالج میں بھی۔"

مکان بکنے کے بعد عذرا کے یہاں مستقل رہنے کی طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد عنبر نے بھی ملازمت پکڑ لی تھی۔ نوید اسکول سے آتا تھا تو وہ اس کی نگہداشت کر لیتی تھیں۔ اب عنبر اپنی گاڑی خریدنے کی بات کر رہی تھی تاکہ آفس آرام سے جا سکے اور شان سے بھی۔ اس وقت وہ ناشتہ کئے بغیر نکل لی۔ عذرا پکارتی رہ گئیں۔ "دیر ہو رہی ہے ممّا تو لینا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی سڑک کے اس پار جانا پڑ جاتا ہے۔"

"ارے ایسی کیا بھاجڑ پڑ گئی ہے ہمیں" شکار کر کے لوگ کھا ناشتہ چھوڑ کر بھاگے چلے جاتے ہیں۔" انہوں نے ریلنگ پر بیٹھی گوریا کو بنکی یلی کو مخاطب کر کے کہا لیکن دوسرے ہی لمحہ ٹھٹھک گئیں۔ یہ انہوں نے ابھی کیا کہا؟

یادوں، صورتوں، واقعات اور باتوں کی طرح بعض الفاظ بھی ذہن کے گہرے کھنڈروں میں جانے کہاں چھپے بیٹھے ہوتے ہیں۔ برسوں تک خیال بھی نہیں آتا کہ ان کو کبھی جانا سنا بھی تھا۔ پر اچانک منوں مٹی کے نیچے سے منہ نکال کر جھانکنے لگتے ہیں۔ اور کوئی کوئی تو زبان پر کود پڑتا ہے۔ جیسے اب ای کو لے لو 'بھاجڑ' جب عنبر نے کہا ہم کہہ رہے تھے ارے بھاجڑ پڑ گئی رے۔ تو ہم نے بھی سوچا تھا کہ نہ جانے کب کا کیا سُنا ہے جو نے یہ بے معنی جملہ ہم کیوں بولے ہوں گے۔ لیکن ابھی تو اپنی پوری بلاغت، پوری امیجری کے ساتھ یہ لفظ ہماری زبان سے ادا ہوا ہے۔

یہ کریہہ الصوت لفظ غالباً مغربی یو پی کے دیہاتوں میں بھگدڑ کے لئے رائج ہے۔ برسوں پہلے سجاد نے ایک قصہ سناتے ہوئے استعمال کیا تھا۔ سجاد خوب گپی تھے اور چائے پیتے ہوئے ہمیں نہ جانے کہاں کہاں کے قصے سناتے رہتے تھے۔ زندگی تب بھی رواں دواں تھی لیکن اس میں سب کے لئے وقت تھا۔

"نانا کے بڑے چچا کو ہاتھی خریدنا تھا" سجاد اس دن اپنے خاندان کے قصے سنا رہے تھے۔

"سچ مچ کا ہاتھی؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا مٹی کا ہاتھی، بے وقوف! جیسے فاطمہ دیوالی پر لائی تھی۔"

"اب ہاتھی خریدنے کیلئے دوسروں پر تو بھروسہ کیا نہیں جا سکتا اس لئے نانا کے تایا خود گئے۔ ساتھ میں دو چار کارندے تھے۔ سیر سپاٹے کرانے کے لئے نانا کو بھی ساتھ لے لیا۔ وہ اس وقت کم عمر لڑکے تھے۔ کوئی مشہور جگہ تھی جہاں لق و دق میدان میں جانوروں کا سالانہ میلہ لگا کرتا تھا۔ بڑی بھیڑ ہوا کرتی تھی۔ کھیل تماشے، دکانیں بھی۔ نہ جانے کیا ہوا کہ اچانک بھگدڑ مچ گئی۔ جانور بھڑک گئے تھے یا کسی خیمے میں آگ لگی تھی۔ یاد نہیں نانا نے کیا بتایا تھا۔ بہر حال بھگدڑ مچی پھر کچھ دیر بعد قابو میں بھی آ گئی لیکن بیشتر لوگ واپس ہو لئے۔ جب نانا کی پارٹی واپس ہو رہی تھی تو ایک ویران سے قطعہ میں ایک چھوٹا سا دیہاتی لڑکا ایک درخت کے نیچے تنہا کھڑا روتا دکھائی دیا جو رونے کے ساتھ ساتھ بین بھی کرتا جاتا تھا۔ "اے او بڈیلے بے۔ اے تو کہاں گیا ہے بے۔ اے بھاجڑ پڑ گئی ہے۔" نانا کے بڑے چچا نے بتایا کہ بڈیلے سے اس کی مراد غالباً بڑے بھائی سے تھی۔ وہ لڑکا اپنے بڑے بھائی کے ساتھ کوئی چھوٹا موٹا جانور از قسم مرغی، بکری، بچھڑے یا

خریدنے آیا ہوگا (اس کے حلیے بشرے سے اس سے بڑا جانور خریدنے یا بیچنے کی سکت اس میں نہیں لگ رہی تھی) ور بھگدڑ میں اس سے چھوٹ گیا تھا۔

''نانا نے ہم لوگوں کو قصہ سناتے ہوئے کہا' سجاد کہہ رہے تھے' مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا کہ ہم لوگوں نے اس لڑکے کی کوئی مدد نہیں کی۔ تایا کو خاطر خواہ بچھیا مل گئی تھی۔ وہ بہت خوش تھے اور گھوڑے پر سوار تیز تیز چلے جا رہے تھے۔ نہ انہوں نے گھوڑا روکا نہ پیچھے چلتی بیل گاڑی رکی جس پر دوسرے لوگ تھے۔ بچھیا کو بعد میں آنا تھا۔ گاؤں کے بڑے ہول انگیز غیر آباد، سنسان علاقے میں شام پڑے ایک پیڑ تلے روتا ہوا چھوٹا سا بے بضاعت لڑکا۔ پاس سے گذرتا ایک مختصر قافلہ جو شاید اس کی مدد کر سکتا تھا مجھے بہت یاد آتا ہے۔' نانا نے یہ قصہ ایک سے زیادہ بار سنایا اور اداسی کے ساتھ''

''نوشیرواں! عذرا نے بلی کو تھپک کر گود میں چھپا لیا۔ ہم نے یہ قصہ سنا تو افسوس تو ضرور ہوا لیکن ہم اس ماضی کا حصہ نہیں تھے۔ دوسرے یہ کہ بات پرانی ہو چکی تھی۔ نہ جانے کس کس پر اس دنیا میں کیا کیا افتاد گذر جاتی ہے۔ جنگوں کا سوچو، فسادات کی سوچو پھر زلزلے، سیلاب، مگر ہمیں اس رات بے خودی کے عالم میں یہ بھولا بسرا قصہ کیوں یاد آیا اور کیوں وہ بین یاد آئے جو ہمارے ذہن میں برسوں پہلے گم ہو چکے تھے؟ گھڑی پر نظر پڑی تو انہوں نے بلی کو گود سے اتار دیا عنبر کے آنے کا وقت ہو چلا۔ اب تو تم سے بات کرنے میں بھی احتیاط کرنی پڑے گی۔ عنبر فون پر اپنی کسی دوست سے کہہ رہی تھی کہ ہمارا تم سے، مہر نگار سے، چنگیز سے باتیں کرنے کا سلسلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اور ہم نے تم لوگوں کے عجیب عجیب نام رکھ چھوڑے ہیں۔ کہہ رہی تھی بس چلے تو تینوں بلیوں کو بورے میں بھر کر جھیل میں ڈال آؤں۔ کیا پتہ کبھی خیال آتا ہو کہ ساتھ میں ہمیں بھی...... نہیں۔ اب ایسا اندھیر نہیں۔ پھر ہنسا کم بخت۔ چل بھاگ مگر گور یہ مت پکڑ بیٹھ کہے دے رہے ہیں۔''

○○○

خرگوش

نانی کے انتقال کی خبر آئی تو اماں بوسٹن میں تھیں اور میری شامت کہ میں ہندوستان آیا ہوا تھا۔ اماں نے فون پر ہدایت دی کہ میں ننھیال ہو کر آؤں۔ وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔

''وہاں اب کون ہے اماں! اس دور افتادہ قصبے میں!''

''نانا ہیں نہ'' انہوں نے رونا بھول کر بے حد سخت لہجے میں کہا اور میں سٹپٹا گیا۔ مجھے اماں سے بے حد محبت ہے۔ میری پیاری، خوبصورت، ذہین، دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرنے والی اماں۔ وہ مجھ سے شاذ و نادر ہی سخت لہجے میں بات کرتی تھیں۔

''تم وہاں ہو کر آؤ۔ پاپا کے گلے لگنا۔ مما کی قبر پر ہاتھ پھیر دینا۔ میں سمجھوں گی میں وہاں ہوں۔'' انہوں نے اپنا معمولی نرم لہجہ اختیار کر لیا تھا اور دوبارہ رونے لگی تھیں۔

میں بڑا ہی احمق نوجوان تھا۔ خود اماں سے اتنی محبت کرتا تھا لیکن ان کی اپنی ماں سے محبت شاید میری سمجھ میں ٹھیک سے نہیں آتی تھی۔ رشتوں کے لحاظ سے میری دنیا بہت چھوٹی سی تھی اور ذہن محدود۔

بہر حال اماں کی بات تو میں ٹال نہیں سکتا تھا۔ با دل نخواستہ میں نے ٹکٹ بنوایا۔ پھر شہر پہنچ کر وہاں سے قصبے کے لئے بس پکڑی۔ ہندوستان میں اب بھی بہت سی ایسی جگہیں ہیں جہاں ریلوے سٹیشن نہیں ہے۔ مجھے سوچ سوچ کر ہی کوفت ہوتی ہے جب اماں کہتی ہیں کہ وہ واپس لوٹ آئیں گی اور مجھے بھی امریکہ میں نہیں بسنے دیں گی۔ کم از کم اپنی زندگی میں تو نہیں۔ لیکن اس دھول، مکھیوں اور حشرات الارض بھرے ملک میں جہاں ایسے دقیانوسی لوگ بستے ہوں جیسے

میرے نانا۔ میرا جی نہیں چاہتا کہ میں آ کر رہوں۔ یہ بات اور ہے کہ اماں کے ساتھ میں کہیں
بھی رہنے کو تیار ہو جاؤں گا۔

اب سے بائیس سال قبل اماں نے اپنی مرضی سے شادی کی تھی۔ وہ کمپیوٹر انجینئر
تھیں۔ ملک کے بہترین کالج سے فارغ التحصیل۔ نانا انہیں بے حد چاہتے تھے لیکن اپنی مرضی
سے شادی کرنے کی پاداش میں چھ سال تک ان کا منہ نہیں دیکھا۔ اور شاید کبھی نہ دیکھتے اگر وہ
شدید بیمار نہ ہو گئے ہوتے اور ایک میلوڈرامہ نہ ہوا ہوتا۔ میں اس وقت تین برس کا تھا۔

نانا ایسے بیمار پڑے کہ اور لوگوں کے ساتھ خود انہیں محسوس ہوا کہ وہ جانبر نہ ہو سکیں
گے۔ انہوں نے اماں کو تو نہیں لیکن مجھے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ جواب میں اماں نے کہلوایا کہ
تین برس کا بچہ بغیر ماں کے نہیں آ سکتا ہے۔ باپ کے ساتھ بھی نہیں۔ (اور نانا کون سا باپ کو دیکھنا
چاہ رہے تھے جو بقول ان کے سارے فساد کی جڑ تھا) بادل نخواستہ نانا نے کہا اچھا وہ بھی آ جائے۔
بلا لو۔ لیکن میرے سامنے نہ آئے۔ اماں ہوائی جہاز سے مارا ماری کر کے نانا کے شہر پہنچیں۔ تب
نانا قصبے کے اس آبائی مکاں میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ ان کی سروس کا ایک سال باقی تھا اور وہ
کمپنی کے دیے ہوئے ایک کشادہ اور خوبصورت فلیٹ میں رہا کرتے تھے۔

اماں ڈر رہی تھیں کہ وہ جب تک پہنچیں گی نانا زندہ ملیں گے بھی یا نہیں لیکن اسپتال کے
پرائیویٹ وارڈ میں موت کے قدموں کی آہٹ کے باوجود ان کی سانسیں چل رہی تھیں اور
آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ اماں خاموشی سے آنسو بہاتی کمرے کے باہر کھڑی رہیں اور
نانی مجھے گود میں اٹھا کر اندر لے گئیں۔ نانا نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ ان کا نحیف ہاتھ ذرا سا اٹھا۔
پھر وہ ساری قوت یکجا کر کے بولے "ارے یہ تو میری مانو ہے۔ بالکل میری ننھی مانو۔"

اماں کے ضبط کا بندھ ٹوٹ گیا۔ وہ بے تحاشہ روتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں اور نانا
کی کمزور، پھولتی پچکتی چھاتی سے چمٹ گئیں۔

اور اس کے بعد ایک معجزہ ہوا۔ نانا، جن کی زندگی کی رتی بھر بھی امید نہیں رہ گئی تھی، بہتر
ہونے لگے۔ اماں نے چھٹی بڑھوالی اور وہاں رک گئیں۔ میں اس وقت 'پلے اسکول' جایا کرتا تھا۔
میرے لئے بھی پرنسپل کو فون کر دیا گیا۔

ادھر ادھر
نانا مجھے ہر وقت اپنے پاس بٹھائے رکھتے۔ نانی خاموشی سے سائے کی طرح
چلتی وہ سارے کھانے تیار کرتی رہتیں جو اماں کو پسند تھے۔ مجھ سے پوچھ پوچھ کر چاکلیٹ،
ٹافیاں، آئسکریم، ورکیک منگائے جاتے۔ ہفتہ دس دن میں نانا مجھے گود میں اٹھانے لائق ہو گئے
تھے۔ ڈسچارج ہو کر گھر بھی آ گئے تھے۔ اکثر اماں کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے
"میں ان چھ سالوں میں زندہ کیسے رہا۔" چلتے وقت انہوں نے مجھے بہت سے کھلونے دیے۔
اماں کو ایک بڑی سی ہیرے کی انگوٹھی دی۔ کہا "اسے رکھنا۔ اسے میرے منو کی دلہن کو میری طرف
سے دینا۔"

"پاپا، آپ رہیں گے۔ آپ اس کی شادی میں آ کر خود اپنے ہاتھوں سے یہ انگوٹھی اس
کی دلہن کو دیں گے۔"

اماں آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ رخصت ہوئیں۔ نانی نے بہت سا سامان ساتھ کیا۔
اچار، مٹھائیاں، طرح طرح کے ناشتے، پھلوں کی ٹوکری، میرے پاپا کے لئے سوٹ۔

یہ ساری باتیں اماں نے اتنی بار دوہرائی تھیں کہ مجھے سارا کچھ ازبر ہو گیا تھا۔ یاد نہ
ہوتے ہوئے بھی وہ سارے منظر اماں کے الفاظ کی صورتیں لے کر آنکھوں میں گھومتے۔
یہ بھی اماں ہی بتاتی رہی تھیں۔ کبھی ہنس کر، کبھی قدرے تاسف کے ساتھ "اس وقت
تمہارے ننھے سے ذہن میں نہ جانے کیا سمایا تھا کہ تم نانی سے خفا خفا سے رہتے تھے۔"

"خفا؟ ایک ننھا بچہ نانی سے خفا؟ نانی محبت تو کرتی ہوں گی نہ؟" میں کہتا۔
"محبت؟ جان دیتی تھیں۔ پاپا کی ناراضگی کے دور میں بھی وہ تمہاری پیدائش کے وقت
آئی تھیں اور چار، پانچ دن ساتھ رہ کر گئی تھیں۔ جتنے دن رہیں تمہیں گود میں لیے بیٹھی رہتیں۔ کچھ دن
اور رہ جاتیں تو تمہیں گود کی عادت لگا جاتیں اور میری مصیبت ہو جاتی۔" انہوں نے ہنس کر کہا تھا۔

میں نے اپنے لیے خاص طور پر بنائے گئے البم میں اپنی زندگی کی ابتدائی تصویروں میں
نانی کو دیکھا۔ ایک جگہ وہ مجھے ٹب میں ڈال کر نہلا رہی تھیں۔

تم سے نانی نے پوچھا "بھیا تم ہماری گود میں کیوں نہیں آتے؟"
"تم چھے دوشتی نہیں ہے" (تم سے دوستی نہیں ہے) لوگ تمہارے جواب پر خوب ہی

تو ہنسے۔

نانا نے نانی کی اتنی کھنچائی کی کہ وہ روہانسی ہو گئیں۔ "تو بھیا کب دوستی کرو گے ہم سے؟"
"تبھی نہیں" ننھے، تین سالہ بچے کے جواب میں اتنی قطعیت۔ لوگ پھر خوب محظوظ ہوئے۔
اماں نے مجھ سے پوچھا۔ کیوں بیٹا، نانی سے کیوں ناراض رہتے ہو۔ میں نے کہا نانی
ڈانٹتی ہے۔ نانی نے تو نہیں مگر اماں نے اس بات پر مجھے میٹھی سی جھڑکی دی "کاہے کو ڈانٹے گی
نانی۔ بس چلے تو کلیجہ کاٹ کر کھلا دے۔"

مجھے یہ باتیں بالکل یاد نہیں۔ ہاں میں نے آخری مرتبہ نانی کو دیکھا تو میری عمر اس
وقت چھ سات برس ہو گئی تھی۔ تب کی یادیں محفوظ ہیں۔ اس وقت ان کے بالوں میں سفید لکیریں
نمایاں ہو گئی تھیں۔ وہ اپنے بال ڈائی نہیں کرتی تھیں۔ ان کا وزن ادھر تیزی سے بڑھا تھا۔ ان کا
بس چلتا تو وہ مجھے اب بھی ہر وقت گود میں بیٹھا کر رکھتیں۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی کا اکلوتا بچہ تھا۔
شاید ان کی توجہ کی زیادتی کی وجہ سے ہی مجھے ان سے چڑ ہوئی ہو گی۔ میٹھا بہت تیز ہو تو مٹھائی نہیں
بھاتی۔ میری یہ چڑ برقرار رہی تھی۔ اس معنی کہ میں ان کے پاس زیادہ دیر نہیں بیٹھتا تھا۔ کھیلنے
بھاگ نکلتا تھا۔ ان کی زیادہ تر باتوں کے جواب میں خاموش رہتا تھا۔ فون پر نانا سے تو گپ ہوتی
تھی، ان سے بات چیت بہت مختصر رہتی۔

اس بار میری طرف تکتے تکتے اکثر ان کی آنکھیں بھر آتیں۔ "اب ہم بھیا کو کب
دیکھیں گے!" وہ بار بار یہ جملہ زیر لب دوہراتیں۔ اماں باہر کچھ عرصے کے لئے جا رہی تھیں۔ اس
عرصے کا ذکر وہ آٹھ دس سال کہہ کر کرتیں ورنہ نانی کہتیں آٹھ دس سال کس نے دیکھے ہیں۔ میری
سمجھ میں ان کا یہ جملہ نہیں آتا تھا۔ اور بھی کئی باتیں سمجھ سے باہر تھیں اور اپنے اوپر ٹکی ان کی آنکھیں
اکثر میرے اندر دبی جھنجھلاہٹ بیدار کرتیں خاص طور پر اس وقت جب ڈبڈبائی ہوئی بھی
ہوں۔ نانی اپنے وقت کی اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت تھیں انہوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے اکنامکس اور
انگلش میں گریجویشن کیا تھا لیکن مجھے وہ بیوقوف لگا کرتی تھیں۔ شاید محبت کی زیادتی اور اپنی محبوب
ہستیوں کے زندگی سے دور جانے کے خوف نے انہیں ایسا بنا دیا تھا۔ مجھے ایک بار ذرا سی چوٹ لگی
تو وہ بولائی بولائی پھرنے لگیں۔ ایسی چوٹیں مجھے کھیل میں اکثر لگتی رہتی تھیں۔ نانا نے ہنس کر کہا

"کرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں" ان کی بات کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا لیکن جس
طرح ہنس کر اور دوستوں کی طرح شانے پر ہاتھ مار کر انہوں نے یہ بات کہی تھی وہ انداز بہت اچھا
لگا اور سمجھ میں یہ آیا کہ معمولی معمولی چوٹوں کو اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ آخر میں ایک مرد تھا۔
رات میں نانی نے میرے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھمایا تو میں بدک ہی تو گیا۔ دودھ
گہرے پیلے رنگ کا تھا۔ انہوں نے میرے چہرے کے تاثرات بھانپ لیے۔
"اس میں ہلدی ڈالی ہے منو۔ ہلدی چوٹ میں فائدہ کرتی ہے۔"
اب نانی تو نانی۔ اکنامکس میں گریجویشن کیا ہو یا کچھ کیا ہو۔ میں نے ہاتھ مار کر
دودھ گرا دیا۔
"اتنا غصہ کیوں کرتا ہے بچہ؟" انہوں نے بڑے تاسف سے اماں سے پوچھا۔
"اب تم بھی تو سر پر سوار ہو جاتی ہو۔ آئیڈکس لگا تو دیا تھا صبح۔" نانا نے میری حمایت
میں کہا۔
اماں ہنسنے لگیں۔ "مما کو ان پرانے نسخوں پر زیادہ یقین ہے۔ اس کی پیدائش کے وقت
مجھے بھی دودھ ہلدی پلاتی رہتی تھیں۔" نادانستہ طور پر مجھے احساس ہوا کہ نانی کو باقی لوگ بھی
بے وقوف ہی سمجھتے ہیں گرچہ اب لگتا ہے کہ میں اس میں حق بجانب نہیں تھا۔
میں جس ملاقات کی بات کر رہا ہوں اس وقت میں نانہال نہیں گیا تھا۔ نانا نانی ہی
ہمارے یہاں آ گئے تھے۔ اماں کو بالکل فرصت نہیں تھی۔ وہ پندرہ دن بعد ہی جانے والی تھیں اور
یہاں انہیں بہت سی چیزیں سمیٹنی تھیں، بہت سے کام نمٹانے تھے، ایک زمین بیچنی تھی۔ ان کا مائیکے
جانا ممکن نہیں تھا۔
"اب ہم بھیا کو کب دیکھیں گے" کے علاوہ نانی نے کئی بار یہ بھی کہا "منو تمہارے خرگوش
اب بھی ہیں۔ اب تو بہت سے ہو گئے ہیں۔ تم آئے ہی نہیں۔ اب نہ جانے کب آؤ گے۔"
ان کے 'بھیا' اور 'منو' کہنے سے بھی مجھے بڑی چڑ تھی۔ مجھے اب لگنے لگا تھا کہ میں خاصہ بڑا
ہو گیا ہوں۔ اماں کی ایک سہیلی کے یہاں دوسرا بچہ ہوا تھا۔ وہ کوئی آٹھ نو مہینے کا تھا۔ مجھے وہ بہت
اچھا لگتا تھا۔ موٹا گورا، پوپلی مسکراہٹ والا۔ اس کے سامنے میں خود کو بہت بڑا محسوس کرتا تھا۔

اب منو، منا جیسے الفاظ تو بس اتنے چھوٹے بچے کو زیب دیتے ہیں۔ مجھے بھیا، منا کہہ کر نانی اسی کی صف میں رکھ دیتی تھیں۔

نانی نے خرگوشوں کا ذکر بار بار کیا تو اماں بھی جھنجلا گئیں۔

''ارے اماں، تب وہ بہت چھوٹا تھا۔ اب اگر بھول پر جاتا بھی تو پتہ نہیں ان سے کھیلا بھی یا نہیں۔ آپ کیوں افسوس کرتی ہیں۔''

تین سال کی عمر میں جب میں پہلی بار ننھیال گیا تھا تو نانا کے کچھ ٹھیک ہو جانے کے بعد نانی نے میرے لیے خرگوش کا جوڑا منگایا تھا۔ باتوں باتوں میں اماں نے ذکر کیا تھا کہ میں نے کہیں خرگوش پلے دیکھے تھے تبھی سے خود بھی خرگوش لانے کی ضد کر رہا تھا۔ نانی نے بے ساختہ کہا۔ ''تو منگا کیوں نہیں دیے۔ خرگوش پالنے میں کیا قباحت ہے؟'' اماں نے بتایا کہ گھر میں دو۔دو کتے ہیں۔ خرگوشوں کی حفاظت مشکل ہو جائے گی۔

نانی مزید کچھ کہے بغیر میری طرف مڑیں ''کون سے رنگ کے خرگوش لوگے منو؟'' میں نے فوراً جواب دیا 'وہائٹ'۔ اس لمحے نانی سے میری دوستی ہو گئی تھی۔ وہ نہال ہو گئیں۔ دوسرے دن صبح سو کر اٹھا تو دو ننھے سفید خرگوشوں کو اپنا منتظر پایا۔ ان کی آنکھیں لال تھیں اور لانبے لانبے کان تھے۔ میں نے خوشی سے کلکاریاں ماریں اور انہیں کانوں سے پکڑ کر لٹکا لیا۔ ننھے ننھے ہاتھوں سے انہیں سبز گھاس اور نارنجی گاجریں کھلائیں۔ اس دن میں نانی کی گود میں بھی چلا گیا تھا۔

خرگوش ہاتھ آنے کے بعد نانی سے میری دوستی پھر ختم ہو گئی۔ میں پھر ان کی گود میں جانے یا ان کے ہاتھ سے کھانا کھانے یا ان سے گپ کرنے سے انکار کرنے لگا۔ وہ میرے ساتھ گیند یا فٹ بال کھیلتیں تو شاید دوستی ہو جاتی لیکن بھاری بدن کی وجہ سے وہ دوڑ بھاگ نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کی ساری محبت مجھے ٹھونس ٹھونس کر کھانا کھلانے اور میرے لیے نئے نئے کھلونے اور کپڑے منگانے میں تھی۔

○

بس دھول بھرے میدانوں سے گزر رہی تھی۔ آم کے درختوں میں ننھے ننھے ٹکورے نظر آ رہے تھے۔ نانی نے مرنے کے لئے اچھا موسم نہیں چنا تھا۔ نانا کے باغیچے کے پیڑوں میں آم

ابھی پکے نہیں ہوں گے۔ وہاں بھی یہی ٹکورے ہوں گے۔ میں نے خود پر لعنت بھیجی۔ میری ماں سے بے حد محبت کرنے والی ان کی ماں یعنی میری نانی نہیں رہیں اور میں آموں کی سوچ رہا ہوں۔ میں نانا کے پاس اماں کے محسوسات پہنچانے جا رہا تھا۔ مجھے ان کی طرف سے نانی کی قبر کو چھو کر آنا تھا۔ ان کا مس پہنچانے جا رہا تھا میں انہیں۔

قصبے میں نانا کا آبائی مکان خاصا بڑا تھا۔ کچھ کمروں پر کھپریل کی چھت تھی۔ سرخ ستونوں پر ایستادہ سرخ کھپروں کی یہ چھت بھی بہت اچھی لگتی رہی ہوگی۔ مکان کے عقب میں ایک چھوٹا سا باغ تھا جس کے بارے میں اماں نے بتایا تھا کہ اس میں آم اور لیچی کے درخت تھے۔ بچپن میں اماں وہاں جاتیں تو ان درختوں میں سے کسی میں جھولا ڈالا جاتا اور وہ خوب پینگیں لیتیں۔ لیکن جب میں کاندھے سے ایئر بیگ لٹکائے گھر میں داخل ہوا تو پورا گھر ایک پراسرار کیفیت میں ڈوبا ہوا لگا۔ موت چند دن قبل ہی جھپٹا مار کر یہاں سے کسی کو پنجوں میں اٹھائے لیے چلی گئی تھی۔ نانا اپنی عمر سے زیادہ بوڑھے لگ رہے تھے۔ دھندلی آنکھیں، جھکے ہوئے شانے اب وہ میرے ساتھ کرکٹ نہیں کھیل سکیں گے یہ صاف ظاہر تھا۔

اچانک مجھے آنگن میں ایک خرگوش پھدکتا ہوا دکھائی دیا۔ پھر ایک اور۔ اور پھر یہ گنتی پانچ چھ تک پہنچ گئی۔ میری نظروں نے ان کا تعاقب کیا تو پتہ آنگن کی دیوار کے ساتھ لگی چلی گئی کچی پٹی میں چمپے کے جھاڑ کے نیچے ان کے بل بھی دکھائی دیے۔ ایک بل سے دو سفید کان جھانک رہے تھے اور نہایت مضحکہ خیز طریقے سے مل رہے تھے۔ میں ہنس پڑا۔

نانا کے بوڑھے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ تمہاری نانی کا خبط۔ انہوں نے ہولے سے کہا۔

نانا جیسا ہی ایک بوڑھا ملازم ناشتے اور چائے کی ٹرے سامنے رکھ کر چلا گیا۔

تمہیں پتہ ہے۔ یہ خرگوش انہیں خرگوشوں کی اولادیں ہیں جو انہوں نے تمہاری پہلی آمد پر میری کمپنی والے کوارٹرز میں منگائے تھے۔ اس وقت تم صرف تین سال کے تھے۔ تم نے اپنی ماں سے خرگوش پالنے کی ضد کی تھی۔

ہاں اماں بتاتی تو ہیں۔ میں نے کہنا چاہا لیکن میرا گلا رندھ گیا۔ نانی کو یاد کر کے نہیں۔ اماں کے خیال سے۔ وہ اس وقت نانی کی خبر سے بہت مضطرب تھیں اور میں ان کے پاس نہیں تھا۔

"تمہاری نانی نے کہا کہ وہ پنجرے میں ڈال کر خرگوش تمہارے ساتھ کر دیں گی لیکن تمہاری ماں نے صاف انکار کر دیا۔ اسی سال میں ملازمت سے سبکدوش ہوا۔ چار چھ مہینے میں ہم لوگ اپنے آبائی وطن اس مکان میں واپس آ گئے۔ تمہاری نانی نے بڑے جتن سے ان خرگوشوں کو پالا۔ انہوں نے وہیں بچے دے لیے تھے۔ وہ ان کا پورا خاندان لے کر یہاں آئیں۔ کہتی تھیں میرا منو آئے گا تو ان سے کھیلے گا۔ یہ میرے منو کے خرگوش ہیں۔ میں انہیں کسی کو نہیں دوں گی۔ کلکاریاں مار کے ان سے کھیلتا تھا۔

"یہاں انہوں نے ان کے لئے بڑا سا پنجرہ بنوا دیا تھا۔ ادھر، کچی پٹی میں انہوں نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "اب میں نے انہیں پنجرے سے نکال دیا ہے۔ وہ آنگن میں بل بناتے رہتے ہیں۔ سب پیڑ پودے کاٹ دیتے ہیں۔ لیکن اب پیڑ پودوں کا کیا کروں گا۔ کسی بھی چیز کا کیا کروں گا۔ سب سے اوپر اٹھ چکا ہوں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ۔" وہ مسکرائے۔ "جیسے تم خرگوشوں سے اوپر اٹھ چکے ہو۔ اب تو تم اوباما کی خارجہ پالیسی پر گفتگو کرتے ہو۔ مسلم ممالک سے اس کے تعلقات کا تجزیہ کرتے ہو۔" وہ ذرا سا رکے۔ میں سر جھکائے خاموشی سے ٹوسٹ کتر رہا تھا۔

"لیکن کہاں اٹھ چکا ہوں میں کسی چیز سے اوپر؟" انہوں نے جیسے خود سے کہا۔ "میں نے ان خرگوشوں کو نہ کسی کو دیا نہ نکال باہر کیا۔ اگر تمہاری نانی کہیں ہیں تو یہ دیکھ کر ضرور خوش ہو رہی ہوں گی کہ تم یہاں آئے ہو تو تمہارے خرگوش موجود ہیں۔ بہت سارے خرگوش۔"

اکنامکس گریجویٹ ہو کر بھی نانی رہیں بے وقوف کی بے وقوف۔ سوچ کر میں دل ہی دل میں ہنسا۔ لیکن تبھی میری آنکھیں بھر آئیں۔

OOO

طمانچہ

وہ چہرہ اسے بڑا جانا پہچانا سا لگا گرچہ اس کی طرف اس کا صرف نصف رُخ ہی تھا۔ وہ تین چار لوگوں کے بعد کچھ دور پر کھڑی اپنی پلیٹ میں کھانا نکال رہی تھی۔ پھر اس کی نظریں اس کے بائیں ہاتھ پر پڑیں اور وہیں جم کر رہ گئیں۔ پورا جسم جیسے سن سن کر اٹھا۔ صاف رنگت کی سڈول مخروطی انگلیاں اور تیسری انگلی میں وہ جڑاؤ انگوٹھی۔ اس کے نورتن پتھر۔ لیکن عورت اب سلاد کاؤنٹر کی طرف مڑ گئی تھی اور سامنے اس کی پشت تھی۔ لانبا قد لیکن جسم چھریرا نہیں بلکہ قدرے گدبدا۔ جانا وقت نشان چھوڑ گیا ہوگا۔ لیکن وہ انگوٹھی۔ ایک سی انگوٹھیاں تو کئی ہو سکتی ہیں۔ کاؤنٹر سے خریدی تھی، الگ سے ڈیزائن دے کر تو بنوائی نہیں تھی کہ اس جیسی دوسری نہ ہوتی۔ لیکن نقوش کی مشابہت؟ اس میں بھی کیا خاص بات ہے۔ اکثر کئی لوگ دوسروں کی یاد دلاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ جس کی یاد دلاتے ہیں، اس سے خوب صورت بھی ہو سکتے ہیں اور اس سے بدصورت بھی۔ طرہ یہ کہ کبھی کوئی ظاہرا مماثلت ہوتی ہی نہیں۔ بس یہ لگتا ہے کہ کسی کو دیکھ کر کوئی یاد آیا۔ کیوں؟ تو نہیں پتہ۔ بس یاد آ رہا ہے۔ تو ہو سکتا ہے اس نصف رخ نے کسی کی یاد دلا دی ہو۔

برابر کھڑی ایک خاتون نے ٹوکا۔ جلدی کیجیے انکل کئی لوگ انتظار کر رہے ہیں۔ وہ کچھ خفیف ہو کر اپنی پسندیدہ ڈش سے سالن نکالے بغیر ہی ہٹ گیا اور جلدی سے سلاد کے کاؤنٹر کی طرف لپکا۔ وہاں وہ دکھائی نہیں دی۔ خاصی دیر تک، ادھر اُدھر بھٹکنے اور بے خیالی میں کئی لوگوں سے ٹکرانے کے بعد وہ جو مختصر کھانا اس وقت پلیٹ میں لے چکا تھا، اسے لے کر ایک گوشے میں جا کر بیٹھ گیا جہاں روشنی کچھ کم تھی۔ لاشعوری طور پر شاید وہ اس بھیڑ سے الگ رہنا چاہ رہا تھا۔ دل و

دماغ میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کھانا بغیر چھوے پلیٹ اس نے برابر کھڑے ایک پتھر کے اسٹول پر رکھ دی۔

سجاوٹ بہت عمدہ تھی۔ ماحول بہت خوب صورت تھا۔ مصنوعی جھیل پر سے گزر کر آنے والی ہوا میں خوش گوار خنکی تھی اور سبزے کی خوشبو۔ سبزہ جو ہر چہار طرف تھا۔ مخمل جیسی دوب، زمرد جیسے پتوں والے درخت، پھولوں کے تختوں میں رنگوں کی نہایت فنکارانہ آمیزش جیسے کسی مصور نے خوب سمجھ بوجھ کر برش چلایا ہو۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے صحرا کو گلشن میں تبدیل کر دیا ہے۔ جہاں چالیس پینتالیس برس پہلے ریت ہی ریت تھی وہاں پانی کی فراوانی ہے۔ پانی ہے تو سبزہ ہے اور سبزہ ہے تو زندگی ہے اور زندگی ہے تو پھر --- تو پھر خوشیاں کیوں نہیں ہیں۔ ہیں تو۔ وہ ایسا کیوں سوچ رہا ہے۔ یہ چمکتا دمکتا ماحول، حسین چہرے، زرق برق لباس، تتلیوں جیسے بچے، کھانوں کی فراوانی --- یہیں کہیں اس کی بیوی انواع اقسام کے کھانوں سے بھری پلیٹ لیے دوستوں اور رشتے داروں کے درمیان گپ کر رہی ہوگی۔ شاید اسے ڈھونڈ ا بھی ہو۔ نوبالغ بچے اپنے ہم عمروں کے درمیان قہقہے لگا رہے ہوں گے۔ ایک وہی ہے جو رہ رہ کر ایسا بیزار ہوا اٹھتا ہے۔ خلا میں کسی کو ڈھونڈتی اس کی نظریں مایوس ہو کر پھر وہیں آ جاتی ہیں جہاں سے وہ چلی تھیں۔ کیا آج ان نظروں نے کسی کو دیکھا یا یہ اس کا وہم تھا۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

کتنے دن ہوئے؟ پورے بیس سال یا اس سے کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ۔ کیا یہ وقت پلک جھپکتے گزرا یا ایک ایک پل کا حساب مانگتا ہوا۔

تب وہ یہاں نہیں ہوا کرتا تھا، سمندر کے آس پاس اپنے دیس میں تھا جہاں اس کا ایک شہر ہوا کرتا تھا جہاں ایک دن ایک وقت ایک جرگہ بیٹھا تھا۔

تب اس نے کچھ دن پہلے ایک اچھے کالج سے ایک اعلیٰ درجے کا پروفیشنل کورس مکمل کیا تھا۔ ملازمت تو جیسے اس کا انتظار کر رہی تھی اور گھر کے لوگ جیسے اس کی ملازمت کا انتظار کر رہے تھے۔ عورتیں اپنے گھر سے نکلیں اور کسی کے گھر جا کر وہاں کی بیٹی کے ہاتھ میں ایک کنگن پہنا آئیں۔ ماں نے ہنس کر کہا "دوسرا بری پہ چڑھا کر جوڑا مکمل کر دیا جائے گا۔"

"خبردار جو کسی ایسی ویسی کا نام لیا۔ تمہاری ماں ایک خاندانی لڑکی کی کنگن چڑھا آئی ہیں۔"
جرگے نے کہا جس میں اس کے بزرگ تھے اور بیاہی ہوئی بہن اور پھوپھی جو کچھ ایسی بزرگ تو نہ تھیں لیکن بیاہی ہوئی ہونے کے سبب جرگے میں شامل ہونے کا استحقاق حاصل کر چکی تھیں۔

"وہ ایسی ویسی نہیں ہے۔" وہ بھنا کر بولا تھا۔

"کون ایسی ویسی ہے اور کون نہیں یہ ہم طے کریں گے۔ تم کل کے چھوکرے۔ تم طے نہیں کرو گے۔" جرگے نے کہا۔ "اور پہلے تو تم نے کچھ کہا بھی نہیں تھا۔"
اس نے سوچا تھا صحیح وقت کا انتظار کرے گا۔ صحیح وقت اتنی جلد آ کر سر سے گزرنے لگے گا اس کا اندازہ لگانے میں اس نے غلطی کی تھی۔ کچھ اشارے ضرور دیے تھے لیکن وہ دورِ جدیدیت کی علامتی کہانیوں کی طرح لوگوں کے سر سے گزر گئے تھے۔ یا انھوں نے سوچا کہ لڑکا ہے کھیل کھا رہا ہے۔ ابھی دن ہیں کھیلنے کھانے کے۔ آخر لڑکے یوں ہی پلتے ہیں کھیل کھا کے۔ شاید اسی لئے لوگ اس ہسپتال والے واقعے کو بھی ہضم کر گئے۔ کسی کے کان پر جوں نہیں رینگی۔
واقعہ کچھ یوں تھا۔
تعلیم کا آخری سال بھی اختتام کو آیا تھا۔ فائنل امتحانوں کے فوراً بعد وہ بہت بیمار پڑ گیا۔ اتنا کہ ہسپتال میں بھرتی ہونا پڑا۔ اس کے پاس بہت قریبی عزیز ہی جا سکتے تھے۔ دوست، احباب، رشتے دار آتے تو باہر ہی سے گلدستے اور کارڈ دے کر واپس ہو جاتے۔ لیکن وہ لانبی، چھریری خوش شکل لڑکی بضد تھی کہ اسے مریض سے ملنے دیا جائے۔ اچھا یہ نہ سہی، ایک نظر دیکھنے دیا جائے۔ گھر والوں نے کہا بی بی تم کون؟ تمہارا دکھ ہم سے زیادہ ہے کیا؟ اس پریشانی میں ہمیں اور پریشان نہ کرو۔

"تمہارا دکھ ہم سے زیادہ ہے کیا" یہ سن کر وہ خاموش ہو گئی اور آنکھیں پونچھنے لگی۔ پھر وہ روز بلا ناغہ آتی۔ باہر آتی جاتی نرسوں اور ڈاکٹروں سے اس کا حال پوچھتی اور سر جھکائے واپس ہو جاتی۔ گھر والوں نے اسے کبھی منہ نہیں لگایا یا دیکھا ہی نہیں کہ ان کے علاوہ کوئی اور بھی ہے جو اتنا فکر مند ہے۔

وہ دس بارہ روز بھرتی رہا۔ وہ دن آئی سی یو میں بھی گزرے۔ اس کی آنکھیں کمرے کے دروازے پر لگی ہوتیں۔ وہ چہرہ نظر نہ آتا۔ مر گیا تو روح بھٹکے گی۔ یہ خیال اس کے ذہن پر منڈلاتا رہتا تھا۔ وہ یہ سوال بھی بھول گیا تھا کہ روح واقعی ہوتی ہے کیا۔ نہیں مرنے پر اسے بڑی طمانیت کا احساس ہو۔ کچھ خجالت بھی ہوئی۔ نہیں مرنے کی خوشی یہ تھی کہ وہ اس کو دیکھ سکے گا۔ ماں نے اس کے ہسپتال کے پورے قیام کے دوران روزے رکھے تھے اور ہمہ وقت سجدے میں پڑی رہی تھیں۔ ان کا خیال اسے بعد میں آیا اور باپ جو راتیں ٹہل ٹہل کر کاٹ رہے تھے ان کے بارے میں تو سوچا ہی نہیں۔

ابھی اسے آرام کی ہدایت تھی گھر کے لوگ ہر ممکن خیال رکھ رہے تھے۔ پھر شکرانے کی دیگیں، میلاد، دوستوں اور عزیزوں کی دعوتیں۔ پورے دو ہفتے بعد اس سے ملاقات ہو سکی۔

لڑکی نے اسے چھو کر دیکھا۔ تم ہو نا؟

وہ ہنسا۔ ہاں ہوں تو۔

"تمہیں کچھ ہو جاتا تو ہم کیا کرتے۔ کہاں جاتے۔" نہایت سادگی سے ادا کیے گئے نہایت سادہ سے الفاظ "اب مرنے کی دھمکی مت دینا۔ ہم تو کمل کے رو بھی نہ پائیں گے۔" وہ آنسوؤں کے درمیان ہنس رہی تھی۔ کبھی کبھی کسی کو دکھ دینے کا خیال خود اپنے دکھ سے مزید اذیت ناک ہو جاتا ہے۔ اس نے ایک دن ہمت کر ڈالی۔

"پاپا، امی سے کہہ دیجیے بات آگے نہ بڑھائیں۔ ہم کہیں اور چاہتے ہیں۔"

کہاں؟ انھوں نے بغیر کسی حیرت یا غصے کے سپاٹ لہجے میں نہایت سپاٹ سا سوال کیا۔

"کہیں بھی۔"

"ارے معلوم تو ہو۔" اب کی وہ قدرے جھنجھلائیں۔

"وہ وہ ہے جو ہسپتال آ کر ہمیں دیکھنے کی ضد کرتی تھی۔"

"او وہاں۔ پھر روز آ کے بیٹھی رہا کرتی تھی۔ چھوٹی بتاؤ، کون ہے کیا ہے۔"

"کیا یہ کافی نہیں کہ ہمیں پسند ہے۔"

"ہمیں پسند ہے تو بھی کافی نہیں ہوتا۔"

لیکن وہ چودھری کیا بتاتا یہی کہ لڑکی ایک یتیم خانے کی پروردہ تھی۔ بہت ذہین تھی اس لیے کچھ عیسائی مشنریوں نے اسے وظیفہ دلوا دیا تھا۔ مسابقتی امتحان پاس کر کے وہ اسی کے پروفیشنل کالج میں پڑھ رہی تھی۔ اسے بھی فوراً ملازمت مل گئی تو ایک ورکنگ وومن ہوسٹل میں منتقل ہو گئی۔

بہن نے سر پر ہاتھ مار لیا۔ "قطعی ناقابل قبول۔ اوپر سے ہی کنگن پہنا آئیں۔"

'امی کو اس سے بھاری کنگن بنوا دوں گا اسے وہیں رہنے دیں۔" پھر وہ قدرے ہکلایا۔ "امی سے پہلے انگوٹھی پہنا چکا ہوں۔"

بہن کی آنکھیں حلقوں سے باہر آ گئیں۔ "ایں! بھیا اس سانپ کے بل میں ہمیں ہاتھ نہیں ڈالنا۔"

"آپا آپ بھی عورت ہیں۔ ایک لڑکی کے جذبات کا خیال کیجیے۔ میری چھوڑیے۔ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ خواب تو میں نے ہی دکھائے نا۔"

بہن قدرے پگھلیں۔ "اشارہ کر کے دیکھ لیتے ہیں گرچہ ہونا ہوانا کچھ نہیں۔"

بچا، ماموں آج کل نئے چچا ماموں رہ ہی نہیں گئے ہیں جتنے پہلے ہوا کرتے تھے لیکن ایسے موقعوں پر جست سے حاضر۔ جرگہ بیٹھ گیا۔ جرگہ جو طے کرتا ہے کہ آپ کس سے محبت کر سکتے ہیں، کس سے نہیں اور اگر کر سکتے ہیں تو کتنی۔

"دیکھو میاں یہ نہیں ہونے کا۔ ہم یہ نہیں برداشت کر سکتے کہ آپ ایسی ویسی لڑکی لے آئیں۔" وہ ایسی ویسی نہیں ہے یہ منطق یکسر مسترد کر دی گئی۔ کون ایسا ویسا ہے کون نہیں یہ طے کرنا بھی جرگے کا کام ہے۔

ذات، خاندان، گھر، سماج امی کی چھاتیوں سے بہی دودھ کی دھاریں، ہاتھ کا پشتینی کنگن، اس کا خاندان کے اکلوتے وارث کا مرتبہ ان سب کی پکڑ اتنی مضبوط تھی کہ جرگہ جیت گیا۔ شاید وہ اپنی گرفت مضبوط کر سکتا تھا لیکن کہیں نہ کہیں اس کے لاشعور میں بھی، کچھ تھا جس نے اسے کمزور کر دیا۔

'کچھ بہت واضح نہیں تھا۔ نہ جانے کن کن باتوں کی ایک مبہم سی قوت تھی جو اس کے

جذبات اور ضمیر کے خلاف صف آرا ہو گئی تھی۔ اس میں والدین تھے، سماج تھا، خود اعتمادی کی کمی تھی، اجنبی انجان راہوں کا خوف تھا جو کہیں ناہموار ہوئیں تو کوئی سہارا دینے والا نہیں دکھائی دیتا تھا۔ ایک لڑکی کے جذبات بے وقعت ہوئے، ضمیر کہیں ڈبک گیا۔

اس نے کئی دن کی ہمت کے بعد فون ملایا۔

''ہم شرمندہ ہیں۔ ہمیں معاف کر دینا'' اس کی آواز زندہ تھی۔

''کر دیا'' سیدھا، مختصر جواب۔ کسی بھی طرح کے جذبات سے عاری۔

''ایک بار ملنا چاہتے ہیں۔ ملو گی؟''

ادھر سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

ایک بار مل لینے، ایک بار اس کی صورت دیکھ لینے، اس سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لینے کے لیے اس نے ہر جگہ تلاش کیا۔ سڑکوں پر، بازاروں میں، اس کے آفس کے آس پاس، اس آفس کی کینٹین میں، پسندیدہ پارک کے پسندیدہ گوشوں میں، ہواؤں میں، بادلوں میں، بارش کی پھواروں میں، چاند سورج، آسمانوں میں۔ وہ یک لخت جیسے پگھل کر فضا میں معدوم ہو گئی تھی، کہیں نہیں ملی۔ گھر میں شادی کی تیاریوں اور مہمانوں کی ہما ہمی کے دوران وہ سخت مضطرب رہا۔ ایک دو رُخی جذبے کا شکار۔ اضطراب کے ساتھ دل میں ہلکی سی مسرت بھی کبھی کبھی کوندہ جاتی اور احساس جرم میں اضافہ کر جاتی تھی۔

دلہن کا گھونگھٹ پلٹا تو وہ اس چہرے میں ڈوبتا چلا گیا۔ پرانی محبت دھیرے دھیرے پس پشت جا پڑی۔ ہاں احساس جرم ڈنک مارتا رہتا تھا۔ وہ کہیں نہیں گیا۔ پھر دو بچے بھی ہو گئے۔ وہ اسکول جانے لگے۔ ایک عام آدمی کی مسرور و مطمئن زندگی ان پٹریوں پر دوڑنے لگی جو جز گے نے بچھائی تھیں۔ ملک چھوڑنے کا خیال اسے کبھی نہیں آیا۔ لاشعور میں ایک موہوم سی خواہش تھی یا امید تھی کہ شاید کبھی کہیں وہ مل جائے۔ کبھی تو دکھائی پڑے۔ اس لیے بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ اس نے بھی شادی کر لی ہو تو ضمیر مطمئن ہو جائے گا، اس کے کچوکے بند ہو جائیں گے۔

وقت بڑی دھول اڑاتا ہے اور زندوں، مُردوں سب پر ڈالتا چلا جاتا ہے۔ اس نے اسے مرا بھی تصور نہیں کیا بس مٹی اس پر بھی پڑتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کے پیچھے سے سرکائی تو

کئی کئی دن اس کا جی خراب ہوتا لیکن اب اس کی تکرار بہت کم ہو گئی تھی۔ اس دوران بیوی کے والدین گزر گئے اور بھائی کسی خلیجی ملک میں جا کر بس گئے۔ انھوں نے اصرار کر کے اسے بھی وہاں بلا لیا۔

یہاں وہ اسے نہیں ڈھونڈتا تھا۔ کبھی خیال آ جاتا تو اب اس نے ضمیر کو سلانے کی ایک اور ترکیب سیکھ لی تھی۔ وہ سوچتا کہ اس نے کہیں شادی ضرور کر لی ہوگی۔ خوش شکل تعلیم یافتہ برسرِ روزگار لڑکی۔ کسی نہ کسی نے تو ہاتھ تھام ہی لیا ہوگا۔ وہ بھی اپنے بچوں میں گھری بیٹھی ہوگی گھر اور آفس کے درمیان توازن بناتی جیسے کوئی نٹ رسی پہ چلے۔ کبھی اس کی یاد آتی ہوگی تو وہ بھی اسے سر جھٹک کر دور پھینک دیتی ہوگی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا ماضی تھے۔ لیکن جب وہ اس کے شوہر اور بچوں کے متعلق سوچتا تو ضمیر کو تسلی تو ملتی لیکن دل کے اندر کہیں رقابت کا خنجر بھی ایک شدید وار کرتا تھا۔

کبھی کبھی بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی چیز کو تلاش کر کر کے مر جاؤ نہیں ملتی اور جب اسے ذہن سے پرے ہٹا دو تو ایسی جگہ سے نکل پڑتی ہے جہاں کبھی سوچا بھی نہ رہا ہو۔ تو کیا ابھی وہی تھی یہاں۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ تقریب بڑی تھی۔ سات آٹھ سو لوگ ضرور رہے ہوں گے۔ رنگ و نور کا سیلاب تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ جو پشت اس کے سامنے آئی تھی اس کے لباس کی سادگی بالکل صاف ظاہر تھی ورنہ یہاں تو عورتیں جھم جھم کر رہی تھیں۔ جو ہاتھ اس نے بخوبی دیکھا اس پر واحد زیور وہ انگوٹھی ہی تھی۔

انواع واقسام کے کھانوں کے الگ الگ گوشے تھے پھر چھوٹی چھوٹی سفید براق ساٹن سے ڈھکی میزوں کے گرد چار چار لوگوں کے بیٹھ کر کھانے کا انتظام تھا۔ وہ ان کے درمیان سے یوں گزرا جیسے اپنے لیے جگہ تلاش کر رہا ہو۔ اس کی بے چین آنکھیں نیچے دیکھ ہی نہیں رہی تھیں اس لیے کئی جگہ وہ کرسیوں سے ٹکرایا۔ کئی جگہ اسے معذرت کرنی پڑی تبھی اس کی بیوی اس کی طرف لپکتی ہوئی دکھائی پڑی۔ ارے آپ کو کہاں کہاں ڈھونڈا۔ چلیے ہمارا گروپ جھیل کے کنارے بیٹھا ہوا ہے۔ ارے آپ نے کھانا نہیں لیا؟ اور یہ چہرہ کیسا ہو رہا ہے۔ وہ چونک پڑی تھی۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟' وہ اسے ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹتی ہوئی وہاں لے گئی جہاں اس نے اپنے

اور بچوں کے بیے یہ منتخب کی تھی۔ بیٹھیے میں آپ کے لیے پہلے گرم گرم چکن سوپ لے کر آتی ہوں۔

وہ گردن گھما گھما کر آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ پھر گرم گرم سوپ کے قیمتی خوش نما پیالے سے نکلتی بھاپ نے ان سب پر جھینا جھینا سا پردہ ڈال دیا اور وہ سب اس کے پیچھے گم ہو گئے۔ تبھی اسے اپنے گال پر ایک بے نام سے لمس کا احساس ہوا۔ کیا بیوی نے اسے پیار سے سہلایا تھا یا کوئی طمانچہ مار گیا تھا۔

ooo

پس نوشت

اسد احمد نہایت خوش تھے۔ خبر ملی تھی کہ کل بھوشن جی جلسے کی صدارت کے لیے راضی ہو گئے ہیں۔ انھیں راضی کرنے میں ان کے دست راست امین الدین نے جو امین دھنگو کے نام سے مشہور تھے، اسد احمد کی بہت مدد کی تھی۔ پہلی بار تو وہ اسد احمد کو ساتھ لے کر کل بھوشن جی سے ملانے گئے۔ پھر بار بار جانے کی زحمت سے بچایا۔ دراصل امین دھنگو نے اپنی چھوٹی بیوہ بھاوج کے حصے کی جو زمین خاندانی جائداد سے ہڑپ لی تھی اس کے مقدمے کو ان کے حق میں فیصل کرانے میں اسد احمد کی صلاحیتوں کا ہی دخل تھا۔ امین الدین کا مقدمہ وہی لڑ رہے تھے۔ بعد میں بیوی سے کہا کہ اس بیوہ عورت کا دعویٰ صحیح تھا۔ لیکن ہم کیا کریں ہمیں تو شہادتوں کے مطابق کام کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ کہ ہم تو کام اسی کے لیے کریں گے جو ہماری پوری فیس دے گا۔ شاید پہلی مرتبہ کسی کھوٹے مقدمے کو جتانے میں اسد احمد کو قدرے پچھتاوا ہوا تھا۔ لیکن پھر وہ جلدی اس کے بارے میں بھول گئے۔ امین دھنگو نے بھاوج کے ساتھ جو بھی بے ایمانی کی ہو لیکن وہ احسان فراموش نہیں تھے۔ انھوں نے وکیل صاحب کی محنت اور صلاحیت کو یاد رکھا اور انھیں ضرورت پڑی تو پھر سے آگے آئے۔ ویسے اس میں ایک پہلو یہ بھی تھا کہ کل بھوشن جی سے بار بار ملے، ان کی اہمیت کا اعتراف کرنے اور انھیں ایک قیمتی تحفہ دلوانے کا موقع بھی مل رہا تھا۔ یہ موقع پھر کبھی کیش کرایا جا سکتا تھا۔ امین دھنگو ان کاموں میں عموماً ہاتھ نہیں ڈالتے تھے جہاں کسی منافع کی امید نہ ہو۔ فوری نہیں تو مستقبل میں سہی۔

کل بھوشن جی ایک قیمتی موبائل پر راضی ہو گئے تھے۔

وہ علاقے کے ایم ایل اے تھے۔ زیادہ تر لکھنؤ میں رہتے لیکن گھر پر کھیتی باڑی تھی۔ ان
کا علاقہ تھا۔ ووٹر تھے۔ اس لیے وطن بھی آتے رہتے تھے جو لکھنؤ سے کوئی سو کلو میٹر دور ایک ضلع
تھا۔ اصل گھر ضلع کے ایک دور افتادہ گاؤں پانچوں پیرن میں تھا۔ بڑے وجیہ اور دبنگ انسان
تھے ورزبان کے میٹھے علاقے میں کام بھی بہت کرایا تھا۔

جس جلسے کی صدارت انھوں نے منظور کی تھی وہ اسد احمد کے ابا کے شعری مجموعے کے
اجرا کے لیے تھا۔ باقی کلیات کا اجرا دھوم سے ہوگا یہ اسد احمد کے ذہن میں بہت پہلے سے تھا۔

ابا کثر تر شاعری کیا کرتے تھے۔ مقامی شاعروں میں پڑھنے کھڑے ہوتے تو اکثر
ہوٹ ہو جاتے۔ مشکل یہ تھی کہ کچھ بھرتی کے مقامی شاعروں کو بلایا جانا ضروری تھا ورنہ وہ ریشہ
دوانیاں شروع کر دیتے تھے۔ کچھ گرگوں کو راضی کر کے اچھے اچھے شاعروں کو ہوٹ کرا دیتے۔
منتظمین کے خلاف مقامی پرچے کے علاوہ لکھنؤ کے چند ہندی اردو اخباروں میں اوٹ پٹانگ
خبریں چھپوا دیتے جن میں سب سے نمایاں خبر ہوتی تھی مشاعرے کے لیے بڑی رقمیں چندہ
کر کے اس رقم کو مل بانٹ کے کھا جانا۔ اسد احمد کے والد شریف انسان تھے۔ وہ اس طرح کی
حرکتیں تو نہیں کرتے تھے لیکن سامعین کی صف سے اٹھ کر زبردستی اسٹیج پر جا بیٹھتے۔ اب ہٹاتے
رہیے انھیں۔ زمین جدید آسماں جدید، نت جدید گل محمد۔ ایک مرتبہ تو ایک نوجوان شاعر کو کہنی مار کر
مائک پر سے ہٹا دیا۔

''میاں آپ کیا غزل کہیں گے۔ جائیے اماں سے کہیے دودھ کی بوتل تیار کر دیں۔''

سامعین نے بے اختیار قہقہہ لگایا اور بس انھیں موقع مل گیا۔ جھٹ اپنی غزل شروع کر دی۔
ناظم مشاعرہ کی چلی نہ اس بے چارے نوجوان شاعر کی۔ ہاتھ جوڑ کر بولا چلیے چچا آپ ہی مشاعرہ
پڑھیے۔ اسد احمد بہت شرمندہ ہوئے لیکن اس دن ابا کے چند شعر ہوٹ نہیں بلکہ نوٹ ہو گئے۔

اب دراصل ہوتا کیا ہے کہ آپ شاعری کو اوڑھنا بچھونا بنا لیں تو کبھی دو چار اشعار اچھے
بھی نکل آتے ہیں۔ اس دن اتفاق سے وہی ہوا تھا۔

''واہ واہ۔ آپ کے والد نے تو دل ہی خوش کر دیا۔'' یہ بھولا بابو ایڈووکیٹ تھے۔ اردو تو
کم کم جانتے تھے لیکن مشاعرہ انجذ کرنے کے بڑے شوقین تھے اور اچھی شاعری کی تمیز رکھتے

تھے۔ اسد احمد انھیں اپنا سینئر جان کر بڑی عزت دیتے۔ ان کی تعریف سے تو ابا کا خون چلوؤں
بڑھ گیا اور ان کی بے تکی حرکت سے جو خفگی ہوتی وہ بھی دھل گئی۔

تکی کچھ زیادہ بھی ہو سکتی تھی اس لیے کہ مشاعرے کی صدارت ذیشان حیدر نے کی تھی
جو شہر میں ایک اعلیٰ درجے کا جنرل اسٹور چلاتے تھے جسے جلد ہی وہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں بدلنے کا
پلان بنا رہے تھے۔ ان کا ایک قصہ پڑھے لکھے حلقوں میں زبان زد خاص و عام تھا جو خاصہ عرصہ
گزر جانے کے بعد بھی دوہرایا جاتا رہتا تھا۔ دراصل اس کے دوہرائے جاتے رہنے میں ان
لوگوں کا بڑا دخل تھا جو ان کی کاروباری کامیابی اور تمول سے چڑتے تھے۔

قصہ کچھ یوں تھا کہ ذیشان حیدر کو پروفیسر کہلانے کی بڑی تمنا تھی۔ ان کے نزدیک
پروفیسر ویسے بھی بڑا باعزت عہدہ ہے پھر سب سے بڑی بات یہ کہ کہیں جاؤ، کوئی نہ کوئی شاگرد
نکل آتا ہے جو جھک کر سلام کرتا ہے۔ اور کسی لائق عہدے پر فائز ہو گیا ہو تو بڑے بڑے کام نکلوا
دیتا ہے۔ انھوں نے انگریزی میں ایم اے کیا تو ایک بار فیل ہوئے، دوسری بار تھرڈ ڈویژن
لائے۔ تو بھی ہمت نہیں ہاری صرف پٹری بدل دی۔ اردو میں ایم اے کیا۔ اونچے درجے کا
سکنڈ ڈویژن ملا۔ ایم فل بھی کر ڈالا اور پھر لکچر شپ کے لیے کوشاں رہے۔ ان دنوں پی ایچ ڈی
کی قید نہیں تھی۔ ہوتی بھی تو کیا تھا لیکن نہیں تھی تو آسانی تو تھی ہی۔

تو یہ اس قصے کی بیک گراؤنڈ ہے۔ دو تین جگہ ناکام رہنے کے بعد وہ اردو لکچرر کی بحالی
کے لیے ایک انٹرویو میں شریک ہونے گورکھپور تشریف لے گئے۔ بورڈ کے صدر کا پہلا سوال تھا،
آپ کا اسم شریف۔ نہایت بشاش لہجے میں فرمایا، ذی سان حیدر۔ سوال کرنے والے صاحب
نے کہا جائیے آپ کا انٹرویو ہو گیا۔ خوش خوش واپس ہو لیے اور سب سے کہتے پھرے کہ وہ منتخب
ہو گئے ہیں۔ جب پروانۂ تقرری نہیں پہنچا تو انھوں نے کہا کہ کسی پیسے والے کینڈیڈیٹ نے
انٹرویو بورڈ کو رشوت کھلا کر ان کا نام کٹوا دیا۔ بعد میں وہ خدا کا شکر ادا کرتے کہ کسی نے ان کا نام
کٹوا دیا تھا اس لیے کہ ایک متمول رشتے دار کی مدد اور بینک سے قرض لے کر انھوں نے جو چھوٹی
سی دوکان شروع کی وہ اب خاصے بڑے جنرل اسٹور میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اردو شاعری میں ان
کی دلچسپی پرانی تھی اس لیے مشاعروں اور دوسرے ادبی پروگراموں میں خاصہ بڑھ چڑھ کر حصہ

لیتے تھے۔ غزل کو گجل تو کبھی نہیں کہا لیکن ان کا نام ہمیشہ ذی سان حیدر رہا اور مشاعرے کو مساعرہ کہنے پر مصر رہے۔ افسوس یہ تھا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ملا جو ان کے لیے شعر کہہ دیا کرتا اور اپنے بس میں شاعری تھی نہیں اس لیے مشاعروں میں بڑھ چڑھ کر صرف شرکت کر کے شوق پورا کر لیا کرتے تھے۔

اسد احمد اور ذیشان حیدر کا رشتہ ایسا رشتہ تھا جس میں دوستی اور رقابت ایک دوسرے میں مدغم ہو کر بڑی کھٹی میٹھی کیفیت پیدا کرتے تھے۔ دونوں اسکول کے وقت سے ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ لیکن اسد احمد وکیل بنے اس لیے ان کا مرتبہ ایک جنرل اسٹور چلانے والے سے بلند ہو گیا۔ کافی دن یہ مرتبہ بلند رہا۔ پھر ہوا یوں کہ اسٹور چل نکلا لیکن وکالت لڑکھڑاتی رہی۔ لکھ پڑھ نہ ملنے والی بات ذیشان حیدر کبھی بھولے نہیں اس لیے کھوئے مرتبے کو واپس پانے کے لیے انھوں نے پیسے کا سہارا لیا اور دنیا کچھ یوں آگے بڑھی کہ پیسہ دنوں دن زیادہ اہمیت اختیار کرتا گیا۔

''اب کی سیرت النبیؐ کے جلسے کے لیے حیدر صاحب نے پورے سات ہزار کی رقم دی ہے۔''

امین دھنگو نے اطلاع دی تو اسد احمد کسمسا کر رہ گئے۔

لڑکا پڑھنے کے لیے لکھنؤ چلا گیا تھا۔ ہوسٹل کے اخراجات کافی تھے۔ وہ سات ہزار کی رقم بطور عطیہ دینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ امین دھنگو پورے لاؤڈ اسپیکر تھے۔ دو چار روز میں سب کو پتہ چل جائے گا کہ وکیل صاحب نے صرف اکیس سو روپے دیے ہیں۔

پھر سنا گیا کہ 'اپنا جنرل اسٹور' والے ذیشان حیدر نے شہر کے مضافات میں آئی کیمپ لگوانے کا اعلان کیا ہے۔ سنا ہے لکھنؤ سے دو بڑے ڈاکٹر آ رہے ہیں۔ آپریشن وہ فری کریں گے لیکن باقی ضمنی اخراجات حیدر صاحب نے اپنے ذمے لے لیے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبان دو دن ٹھہریں گے۔ ان کے عمدہ قیام و طعام کا بندوبست حیدر صاحب کے شاندار مہمان خانے میں رہے گا۔

کہاں آئی کیمپ اور کہاں مشاعرہ۔ لوگوں کی آنکھوں میں روشنی واپس لوٹانا۔ وہ بھی مضافات سے لائے گئے ان ناخواندہ غریب غربا کی آنکھوں میں جنھیں آج کے دور میں بھی

موتیا بند کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ پھر بھی شور شرابے کی اپنی اہمیت ہے۔ آئی کیمپ سے وقتی شہرت ملتی ہے لیکن شاعری سے تو شہرت دوام حاصل ہوتی ہے۔ شور میں بڑی طاقت ہے۔ جھوٹ کو سچ، سچ کو جھوٹ کرا دینا شور کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ رائی کو پربت بنانا بھی شور کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اب یہ رائی شاعری ہو یا بھی کوئی آئی کیمپ لگا دیا۔

''ای کیسی شہرت تک بندی کر لی تو چار لوگوں نے داد دے دی۔ اور داد بھی کیا۔ لے بھی للن دے بھی دھی۔'' ذیشان حیدر سے ان کے ایک مصاحب نے کہا۔

اسد احمد کے والد کو زیادہ تر لوگ وکیل صاحب کے ابا کی حیثیت سے جانتے تھے۔ متقی سے، نیک لیکن شاعری کے معاملے میں ذہیث انسان۔ ان کی شاعری ان سے زیادہ اسد احمد کی شہرت کا سبب بن رہی تھی۔ اس لیے وہ اب گھر پر شعری نشستیں رکھنے لگے تھے۔ لوگوں میں یہ نشستیں گفتگو کا موضوع بن رہی تھیں۔ خاص طور پر عمدہ ناشتہ جو نشست کی ابتدا ہوتا تھا۔ درمیان میں چائے کی پیالیاں گردش کرتی رہتی تھیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ آس پاس کے مردم خیز ضلعوں سے کوئی ادب نواز تشریف لائے ہوئے ہوتے تھے تو ان کے اعزاز میں کوئی کچھ کرے نہ کرے اسد احمد ایڈووکیٹ کے یہاں محفل ضرور آراستہ ہو جاتی تھی۔ وہ شاعر (یا ادیب) بہت خوش ہو جاتے۔ تصویریں کھینچ کر لے جاتے۔ ابھی فیس بک اور دوسرے سوشل میڈیا کا ورود نہیں ہوا تھا۔ تصویریں لکھنؤ اور الٰہ آباد کے کچھ اخباروں میں ضرور شائع کرا دی جاتی تھیں۔ ایسی ایک محفل ابھی حال ہی میں آراستہ ہوئی تھی۔ آنے والے صاحب ایک شاعر تھے جو خاصے معروف تھے لیکن اسد احمد کے والد حاوی رہے۔ پے بہ پے غزلیں سنائیں۔ ایک مقامی شاعر نے آزاد نظم سنائی تو ان کو ڈپٹ بھی دیا، میاں پابند نظم سناؤ تو جانیں۔ یہ کیا کہ نثر کو سیڑھیوں میں لکھ دیا، ہو گئی نظم۔ لوگ نظم کو سیڑھیوں میں لکھنے والی بات سے بہت محظوظ ہوئے۔ بعد میں ان مہمان شاعر کی ایک نظم بہ عنوان 'ٹیرلیس فارمنگ' ایک خاصے معیاری جریدے میں شائع ہوئی جس کا موضوع اسد احمد ایڈووکیٹ کے والد کے کھیت کی طرف واضح اشارہ کر رہا تھا۔ یہاں اس نظم کو ذاتی بیٹھکوں میں خوب پڑھا گیا۔ وکیل صاحب کے ابا اور زور و شور سے شاعری کرنے لگے۔ اب وہ خاصے بزرگ ہو گئے تھے۔ ہندوستان میں عمر کا احترام اب بھی باقی ہے، خاص طور پر چھوٹے شہروں

ملی۔ لوگ بڑھؤ سٹھیا گئے ہیں، ناٹپ کے جملے بھٹے ہی بول لیں لیکن بڑھؤ اور بڑی بی کے زمرے میں آنے والے لوگوں کو بہت سی چھوٹ دیتے رہتے ہیں کہ وہ اپنے سٹھیانے کا بھرپور فائدہ اٹھا لیں۔

والد کے کلام کا مجموعہ شائع کرانے اور پھر اس کا اجرا کرنے کا کیڑا ابھی سے اسد احمد کے دماغ میں رینگ رہا تھا۔ بغل میں مسودہ دبا کر لکھنؤ پہنچے۔ اردو اکیڈمی کے چکر لگائے ایک دو اور ایسی ایجنسیوں سے رابطہ قائم کیا جو اشاعتی امداد دیتی تھیں لیکن کہیں پذیرائی نہیں ہوئی۔ تب انھوں نے بہ حالت مجبوری حساب لگانا شروع کیا۔

کوئی بیس ہزار کا خرچ صرف اشاعت میں تھا۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

لاحول ولاقوۃ۔ ابا کا شعری مجموعہ عاشق کا جنازہ کیسے ہوگیا۔ لیکن یہ ناہنجار ذہن یہی گردان کر رہا تھا۔ سرورق کے لیے انھوں نے آرٹس کالج کے ایک بہ ظاہر ملنگو طالب علم کو پکڑا لیکن اس نے ڈھائی ہزار سے کم پر پیٹھ پر ہاتھ بھی نہیں رکھنے دیا۔ کم بخت ایسا خوب صورت ڈیزائن بنا کر لایا تھا کہ نہ کہتے بھی نہ بنے۔ اب مجموعہ چھپ ہی رہا تھا تو سرورق ایسا ہونا چاہیے کہ فوری طور پر توجہ کھینچ لے۔

بڑھؤ آرام سے چائے کے گھونٹ بھرتے، سعادت مند بیٹے کی کاوشوں پر ٹوٹے دانتوں کے درمیان مسکراتے رہے۔

"دن بھر چائے پیتے اور واہیات خرافات کہتے رہتے ہیں۔ یہ عمر، یہ صورت اور شعر ایسے کہ نوجوان شاعر پانی بھریں۔ مہندی، چوڑی، آنچل، کجراری، آنکھیں۔۔۔ منکر نکیر سے آنکھیں لڑانے کے دن آئے ان پر کہہ کریں کچھ۔۔۔" ایک دن اسد احمد کی بیوی نے زچ ہو کر تبصرہ کیا تھا۔

دراصل انھیں سخت قلق تھا۔ کسی کمزور لمحے میں اسد احمد نے ہیرے کے نالپس دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔ زیادہ نہیں، کوئی پچیس تیس ہزار کے تھے۔ کئی سے بے زیور ستے آجاتے ہیں۔ کو لوو تو خریدنا نہیں تھا لیکن اب رقم بڑھؤ کی گھٹیا شاعری چھپوانے میں لگنے جا رہی تھی۔ اجرا میں بھاری خرچ تھا۔ عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے۔۔۔ و پرسے حضرت اسد احمد تلے ہوئے تھے کہ اجرا کل

بھوشن جی سے کرائیں گے۔ اب ایم ایل اے تو کوڑی کے تین بھی مارے پھرتے تھے لیکن کل بھوشن کی بات دوسری تھی۔ چیف منسٹر کی ناک کا بال، علاقے میں دھاک۔ جلد ہی کیبنٹ میں شامل کیے جانے کی خبر گرم تھی۔ ان کے انتخابی حلقے میں مسلمان خاصی بڑی تعداد میں تھے اس لیے انھوں نے کئی مرتبہ اپنی تقریروں میں اردو سے وابستگی کا اظہار کیا تھا۔ امین ڈھنکو نے کہا تھا کہ وہ چھوٹی موٹی رشوتیں قطعی نہیں لیتے۔ پارٹی کے لیے چندہ دوسری بات ہے اور وہ دینے والے لوگ بھی دوسرے ہی ہوتے ہیں۔ اب ہاں ذرا قیمتی تحفہ دے دیا جائے۔ موبائل اس وقت نیا نیا وارد ہوا تھا۔ مہنگا بھی تھا اور انوکھا بھی۔ لیکن وہ کیا ان کے لیے نایاب تھا؟ ارے سرکا دیں گے کسی چیلے چانٹی کو۔ کیا پتہ امین ڈھنکو کو ہی دے دیں۔ میزان کل پچاس ہزار پر آکر بیٹھتا تھا اور واقعی پچاس ہزار خرچ بھی ہوئے۔

دوسرے دن اخبار میں تفصیلی خبر چھپی کہ کس طرح ایک سعادت مند بیٹے نے اپنے والد کے شعری مجموعے کی اشاعت کرائی اور دھوم دھام سے اس کا اجرا کرکے ایک دُرِ نایاب کو سمندر کی تہہ سے نکال کر عوام کے سامنے پیش کرکے محبانِ اردو پر احسان کیا۔ ایسی تقریبیں شہر میں ذرا کم ہی ہوتی ہیں۔ جناب کل بھوشن کے ہاتھوں مجموعے کی رونمائی سونے پر سہاگہ۔۔۔ جناب کنک جرولوی۔۔۔

"یہ کس چڑیا کا نام ہے۔۔؟ شعر و شاعری سے شغف رکھنے والے ایک صاحب نے خبار پڑھتے ہوئے عینک ناک سے اوپر سرکائی اور قدرے ناگواری کے ساتھ اخبار رکھتے ہوئے منھ ہی منھ میں بڑبڑائے۔۔۔ یہ کل بھوشن جی بھی۔۔۔"

لیکن ذیشان حیدر رضا سے مرعوب تھے اور کچھ پریشان بھی کہ اس کے جواب میں کیا کیا جا سکے گا۔

پس نوشت:

اس سارے گورکھ دھندے میں یہ ذکر کہیں نہیں تھا کہ جناب کنک جرولوی کے سارے اشعار جمع کرنے، مسودے کو بغل میں دبا کر اشاعتی امداد کی امید میں ادھر اُدھر گھومنے اور پھر اپنی

جیب سے شائع کرانے کا فیصلہ کرنے کے دوران جو پورا سال گزر گیا اس کے آخری حصے میں کنک جرولوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ مرحوم کو کینسر ہو گیا تھا جو تیسرے اسٹیج میں تشخیص ہوا۔ لکھنؤ تک تو اسد احمد لے گئے۔ علاج بھی ہوا۔ لیکن جب بمبئی لے جانے کی تجویز سامنے آئی تو انھوں نے ایک بار پھر حساب لگایا۔ پچاس ہزار سے زیادہ کا خرچ تھا۔ ساتھ خود رہنا تھا۔ اس دوران پریس کا جو نقصان ہوتا اسے جوڑنے پر یہ خرچ بہت بڑھ جاتا تھا۔ والد صاحب ستّر سے تجاوز کر رہے تھے۔ چند گنے چنے سالوں کی زندگی (اور کیا پتہ کہ چند ماہ ہی رہ گئے ہوں) کے لیے اتنی صعوبت اور اتنا بڑا خرچ.... کنک جرولوی نے سخت تکلیف اُٹھا کر گھر میں ہی وقت کاٹ کر سات آٹھ ماہ کے اندر انتقال کیا۔ اسد احمد کہتے تھے اس رنج میں ایک راحت یہ ہے کہ انھوں نے زیادہ دن تکلیف نہیں اُٹھائی اور جب مجموعہ جس کا عنوان انھوں نے کنک قلب تجویز کیا تھا، کی اشاعت اور شان دار اجرا پر مبارک باد ملتی تو وہ سر جھکا کر کہتے کہ یہاں پر والد کا قرض تھا جو خدا کا شکر ہے کہ ادا ہوا۔

○○○

ویک اینڈ میں بندھی زندگی

کومی نے استری کرنے والی فولڈنگ میز لا کر جگہ پر بچھائی اور دُھلے ہوئے کپڑوں سے بھری باسکٹ کو دھپ سے فرش پر رکھا۔ دو دن سے استری کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا اس لیے باسکٹ پوری بھری ہوئی تھی۔ جس بچے کی دیکھ بھال پر وہ مامور تھی وہ آج جلدی سو گیا تھا اس لیے کومی نے موقع غنیمت جانا۔ استری اس کے فرائض میں شامل تھی۔ ایسے ہی موقع نکال کر وہ ہر دوسرے تیسرے دن کپڑے پریس کیا کرتی تھی۔ گھر پر صرف چار نفر تھے پھر بھی جانے کیسے اتنے بہت سے کپڑے نکل آتے تھے۔

آج جمعرات تھی۔ پرسوں یعنی سنیچر کو اسے چھٹی ملتی تھی۔ یوں اس کا ویک اینڈ ایک دن کا ہوتا تھا۔ دوسری ملازمتوں میں سنیچر اتوار دو دن ملتے تھے۔ کومی کو کوئی شکایت نہیں تھی۔ گھر کے اندر کام کرنے والی سبھی ملازماؤں کو ہفتے میں صرف ایک دن چھٹی ملا کرتی تھی اور یہ سب کے لیے قابل قبول تھی۔ مالک مالکن جنھیں وہ سر اور مادام کہہ کر مخاطب کرتی تھی، دونوں ملازمت کرتے تھے۔ سنیچر کو، مالکن بچے کو اکیلے ہی سنبھالتی تھیں۔ یوں دیکھا جائے تو انھیں بھی مکمل چھٹی ایک ہی دن ملتی تھی یعنی اتوار کے روز۔

بس ایک دن ہے درمیان میں۔ کل۔ پرسوں اس کی چھٹی ہوگی۔ کومی نے استری کرتے کرتے سوچا۔ جمعرات کے روز سے وہ ایک ایک گھنٹہ گننا شروع کرتی ہے۔

پرسوں۔ پرسوں وہ 'گھر' جائے گی۔

جب اصل گھر چھوٹ جائے تو دوسری جگہ گھر بنانے پڑتے ہیں۔

کوئینی یہاں مختلف نوعیت کے کام کرنے والے ہزاروں لوگوں کی طرح تلچھٹ ہے۔

اس کے ملک کے تین لوگوں نے ایک مختصر سا ہیرک نما مکان کرایے پر لے رکھا تھا۔ یہ دو لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا۔ ان میں ایک لڑکا لڑکی میاں بیوی تھے۔ دوسری لڑکی بھی ان کی رشتہ دار تھی اور کوئینی محض ہم وطن اور ہم مذہب۔ پردیس آکر یہ رشتے بہت اہم ہو جاتے ہیں۔ یہ تینوں کسی کے گھریلو ملازم نہیں تھے۔ لڑکیاں مال میں کام کرتی تھیں اور لڑکا پٹرول پمپ پر۔ تینوں دیر سے سہی لیکن رات کو گھر پر ہوتے تھے۔ کوئینی انھیں کی معرفت آئی تھی۔ پہلے ٹورسٹ ویزا اور پھر کام ملتے ہی ورک ویزا پر۔ ملازمت بہت جلد مل گئی تھی۔ شروع میں ان ہم وطنوں نے اسے اپنے ساتھ رکھا، کھلایا پلایا، اس کے ویزا کی رقم ادا کی۔ یہ سارا قرض اس نے ملازمت ملنے کے کچھ عرصے بعد ہی واپس لوٹا دیا تھا لیکن اپنی چھٹی کے روز وہ انھیں کے پاس جاتی تھی اس لیے کہ اس جگمگ جگمگ کرتے ملک میں اس کا اپنا کوئی اور نہیں تھا۔ یوں تو دبئی میں تلچھٹ بھرے پڑے تھے۔ جہاں دیکھیے محنت کرتے ہوئے۔ فطرتاً نہایت ایمان دار اور بشاش طبیعت والے۔ ان کی زندگی میں جو بھی دکھ ہوں (اور دکھ ہوں نہ ہوں، غربت اور اپنوں کی جدائی تو تھی ہی) وہ چہروں پر دکھائی نہیں پڑتے تھے۔ مالکوں کو ایسے ہی کامگار پسند ہوتے ہیں جو شکایت نہ زبان پر لائیں نہ چہروں پر۔ یہ مالک و ملازم کا وہ رشتہ ہے جو ہمیشہ سے ہے اور (شاید) ہمیشہ رہے گا۔

کوئینی کا سارے دن کا پروگرام کسی کمپیوٹر میں فٹ کیے ہوئے پروگرام جیسا تھا۔ مشینی رفتار سے ایک ڈھرّے پر چلتا ہوا۔ جیسے کسی فیکٹری میں کنوئیر بیلٹ (conveyer belt) پر رواں مصنوعات۔ پیکٹ، ڈبے، بوتلیں، جو بھی ہوں

کوئینی بھی اپنی کنوئیر بیلٹ پر رواں ہے جو کسی ان دیکھے الیکٹرانک پروگرام کے تحت کنٹرول ہو رہی ہوتی ہے۔

علی الصبح وہ ساڑھے چار سے پانچ بجے کے درمیان اُٹھ جاتی ہے، اسے الارم لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ الارم اس کے ذہن میں فٹ ہے۔ وہ اسے چوکنا کر کے آنکھیں کھلوا دیتا ہے جیسے کوڈ نمبر ڈالتے ہی بلڈنگ یا پارکنگ ایریا کا گیٹ چھٹ سے کھل جاتا ہے۔

اپنے لیے اس کے پاس ایک سے ڈیڑھ گھنٹے کا وقت ہوتا ہے کیوں کہ بچہ چھ سے

ساڑھے چھ بجے کے درمیان جاگ جاتا ہے۔ بچہ ابھی بہت چھوٹا ہے اس لیے ماں کے کمرے میں پالنے میں سوتا ہے۔ اگر کسی دن وہ زیادہ پہلے جاگ گیا تو کچھ دیر ماں اسے سنبھال لیتی ہے پھر کوئینی کے باہر آتے ہی اس کے حوالے کر کے خود اپنے کاموں میں مشغول ہو جاتی ہے۔ اس کا دن بھی مشینی احکامات کا پابند ہے، اور اس کے شوہر کا بھی۔ مشین کے یہ سارے پرزے اپنی اپنی جگہ فٹ ہیں۔

فلیٹ میں کوئینی کا کمرہ الگ ہے۔ چھوٹا سا ہے لیکن اس کا اپنا ہے۔ کمرے سے ملحق غسل خانہ بھی ہے جو آج کی لغطیات میں واش روم کہلاتا ہے۔ یہ ٹھاٹھ اپنے ملک میں کہاں۔ ہوتے تو کیا وہ وطن چھوڑ کر غیر ملک میں آتی۔ اس کے مالکن، مالکن کے پاس اپنے ملک میں رہنے کی معقول جگہ اور ملازمتیں تھیں۔ انھوں نے وطن کیوں چھوڑا یہ کوئینی نہیں سمجھ پاتی ہے اسے اگر اپنے وطن میں بھر پیٹ کھانا ملتا، سر پر چھت ہوتی اور بچوں کے مستقبل کی طرف سے اطمینان تو وہ اپنا وطن کبھی نہ چھوڑتی۔

یہاں اُٹھتے ہی وہ حوائج ضروریہ سے فارغ ہوتی اور نہا دھو کر جلدی جلدی کچھ کھاتی ہے۔ اس کا ناشتہ روزانہ یکساں ہی رہتا ہے۔ ڈبل روٹی، مکھن اور کوئی ایک پھل۔ عموماً کیلا یا سیب۔ اس ناشتے کو پکانے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے وقت ضائع نہیں ہوتا۔ یوں تو اس کے مالک مالکن بھی ہفتے کے پانچ دن ایسا ہی ناشتہ کرتے ہیں جسے پکانے کا جھنجھٹ نہ ہو مثلاً دودھ کارن فلیکس، دہی اور پھلوں سے بنی اسموڈی (smoothy) جسے صرف مکسر میں ڈال کر تھم بینا ہوتا ہے لیکن بہر حال ان کے ناشتے میں تنوع ہوتا ہے اور مہنگے پھل شامل ہوتے ہیں۔ اکثر وہ بھی ناشتہ بہت جلدی جلدی کھاتے اور تیزی سے اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ مالکن چلتے چلتے کوئینی کو بچے کے متعلق کچھ ہدایات دیتی ہیں اور اس کی طرف فلائنگ کِس اچھالتی یا کبھی گال تھپتھپا لیتی ہیں۔

خیر تو کوئینی قلیل ترین وقت میں اپنی ڈیوٹی کے لیے چاق و چوبند اور شگفتہ ہوتی ہے۔ پانچ فٹ تین انچ کی سیاہ آنکھوں اور گہرے بھورے بالوں کیسے کہ ہلکے سیہ رنگ کے بالوں اور مکھن جیسی جلد والی لڑکی۔ چھریری، متناسب، کسی مچھلی جیسی ستواں اور لچک دار۔ اس کی ناک عام

فلپینی لڑکیوں کی طرح چپٹی نہیں تھی، پھر بھی مجموعی حیثیت میں اس کے خدوخال اس کی نسل کی طرف اشارہ کرتے تھے اور وہ اپنی ہندوستانی مالکن سے کہیں زیادہ پرکشش تھی۔ صاحب خانہ نہ صرف نہایت شریف تھے بلکہ بیوی سے ڈرتے بھی بہت تھے۔ سب پر مستزاد اس ملک میں عورتیں بے حد محفوظ تھیں اس لیے کوئینی کو کبھی کوئی خدشہ نہیں محسوس ہوا۔

سات ہزار سے زیادہ جزیروں پر مشتمل اپنے سرسبز ملک میں کوئینی اپنے دو بچے چھوڑ کر آئی تھی۔ اسی کی طرح سیاہ آنکھوں اور مکھن جیسی جلد والے چھوٹے چھوٹے معصوم۔ باپ نے ان کی ماں سمیت ان سے پلہ جھاڑ لیا تھا اور بقول کوئینی وہ گناہ کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ان کے ملک میں کیتھولک عیسائیوں کے یہاں طلاق نہیں ہے اور وہ کسی غیر عورت کے ساتھ رہ رہا تھا۔

کہیں یہ کہانی ہندوستان کی تو نہیں؟ یا پھر پاکستان، بنگلہ دیش یا افریقہ یا دنیا کے کسی بھی ترقی پذیر ملک کی؟ بس تھوڑے سے فرق کے ساتھ۔ فلپین غریب ملک ہے، یہاں کے بہت سے لوگ یوں بھی باہر نکل لیتے ہیں۔ دنیا بھر میں ان عورتوں کی تعداد کا کوئی شمار نہیں جو اپنے ہی ملک میں کام ڈھونڈ کر شرابی جواری عیاش شوہروں یا پھر ان کی جدائی کو برداشت کرتی رہتی ہیں۔ کوئینی دوبئی آگئی ہے تاکہ اپنے غریب والدین اور ان کے ساتھ پل رہے اپنے بچوں کو فاقوں سے بچا سکے۔ خود اس کے والدین کے سات بچے ہیں جن میں زیادہ تر یا بیکار ہیں یا اتنے چھوٹے کہ کام کرنے لائق نہیں ہیں۔ دو ایک اور ہو جائیں تو تعجب نہیں اس لیے کہ فلپین میں طلاق کی طرح اسقاط کی بھی قانونی اجازت نہیں ہے اور مانع حمل ذرائع اکثر ناکام ہو جاتے ہیں۔

سات بہن بھائیوں میں کوئینی کا نمبر تیسرا ہے۔ اس سے پہلے اس کے دو بھائی تھے۔ دو لڑکوں کے بعد گڑیا سی بیٹی پیدا ہوئی تو مارے خوشی کے ماں نے اس کا نام کوئینی رکھا۔ جیسے ہندوستان میں کسی لڑکی کا نام رانی یا ملکہ رکھا جائے جسے ہی بعد میں وہ خاک دھول میں رُلے یا اور کچھ نہیں تو سسرال جا کر پٹے یا اپنے بچے چھوڑ کر دوسروں کے بچے پالے۔ اس ملک میں نوکروں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا جاتا ہے لیکن کوئینی کو پتہ ہے کہ وہ ملازم ہے۔ مالکن کبھی نہیں بنے گی۔

صاحب خانہ کی ماں آئی ہوئی تھیں۔

انھوں نے کوئینی میں دلچسپی لی تو اس کا چہرہ بشاش ہو اٹھا۔ کوئی اس سے درشت لہجے

میں نہیں بولتا تھا لیکن کسی کو اس کا حال پوچھنے کی پروا بھی نہیں تھی۔ ان کی مہذب اور شائستہ آوازیں جو اسے کام کی ہدایت دینے کے لیے استعمال ہوتی تھیں بہت دور سے آتی محسوس ہوتیں اور دل کے باہر باہر ہی گزر جاتیں۔ کبھی انھوں نے دل پر دستک نہیں دی تھی۔ وہ سب خود اپنی اپنی زندگیوں میں بندھے اپنے اپنے ویک اینڈز (week ends) کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ ان دو دنوں کے لیے وہ بہت سے ذاتی کام اٹھا رکھتے تھے اور پراگندہ ذہن و جسم کو بحال کرنے کے لیے تفریحی پروگرام بھی مرتب کرتے رہتے تھے۔ اس جمعہ کی شام کو کھانا باہر کھانا ہے، سنیچر کو اسٹور روم کی صفائی کرنی اور سامان کا جائزہ لینا ہے۔ اتوار کے روز شاذ کی شادی کی سالگرہ ہے اس نے بلایا ہے۔ باہر لے جائے گا۔ وہاں ہم ترکی کباب اور لبنانی میٹھے کھائیں گے۔ یہ شاذ اور اس کی بیوی بور بہت کرتے ہیں لیکن اس قدر اصرار سے بلایا ہے کہ ہم قدرتی جھیل پر غروب آفتاب کا منظر دیکھنے کا پروگرام کینسل کر رہے ہیں۔ اگلے ویک اینڈ میں ضرور جائیں گے۔ والدہ کا فون آیا تھا ہاں پاپا سب خیریت ہے۔ کہا نا کہ پریشان مت ہوا کیجیے۔ ہر ہفتے جمعہ یا سنیچر کو فون کرتے تو ہیں۔ پچھلے ہفتے نہیں کیا تھا؟ اچھا ہاں۔ پچھلے ختم ہفتے کچھ دوستوں کے ساتھ ایک پہاڑی مقام پر چلے گئے تھے۔ ابھی میں آفس میں ہوں۔ اس سنیچر کو ضرور فون کروں گا اللہ حافظ۔ اور ہاں آفس کے وقت فون مت کیا کیجیے۔ اچھا اماں نے آپ کو تنگ کیا تھا کہ فون کریں۔ یہ اماں بھی نا پڑھی لکھی ہیں پھر بھی کچھ نہیں سمجھتیں۔ میاں تم سمجھتے ہو کیا کہ ماں باپ ماں باپ ہی ہوتے ہیں تعلیم سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فون ذرا جھنجھلا کر بند کیا جاتا ہے۔ یہ جھنجھلاہٹ سٹیلائٹ کے نظام پر دوڑتی، سات سمندروں کے پانی پار کرتی احساس کے تاروں میں ارتعاش پیدا کرتی ہے۔

کوئینی اپنی مادری زبان کے علاوہ انگریزی بولتی ہے اور ٹوٹی پھوٹی اسپینش بھی۔ دبئی میں اس کا کام انگریزی سے چلتا ہے۔ اپنا مفہوم پوری طرح ادا کر لیتی ہے گرچہ بہت رواں نہیں ہے۔ بزرگ خاتون تعلیم یافتہ ہیں۔ آرام سے انگریزی میں بات کر رہی ہیں۔ ان کے لہجہ میں خلوص ہے۔

کتنے بھائی بہن ہیں کوئینی؟

''سات، مادام'' اس کی آنکھوں میں محبت جگمگاتی ہے۔

"تمہاری شادی نہیں ہوئی اب تک؟"

جگمگاہٹ معدوم ہو کر ایک اداسی اس کی جگہ لے لیتی ہے۔

"میرے دو بچے ہیں مادام، دو بیٹے" آنکھوں میں اداسی کے ساتھ نمی بھی ہے۔

"ارے، بہت جلد شادی ہو گئی تھی؟"

"میں تینتیس برس کی ہوں، مادام۔"

"ذرا نہیں لگتیں" بزرگ خاتون کا لہجہ ان کی حقیقی حیرت کا آئینہ دار ہے کوئی پھر خوش ہو اٹھتی ہے۔ کسی بھی عورت کی طرح، کہیں کی بھی عورت کی طرح۔ بلکہ ترقی پذیر ہی نہیں ترقی یافتہ ملک کی بھی عورت کی طرح۔

پھر وہ لمحاتی خوشی معدوم ہو جاتی ہے۔ بزرگ خاتون کے سوالوں نے اسے بچوں کی یاد دلا دی تھی۔ وہ خاتون بھی باتیں بتاتے بتاتے یک لخت خاموش ہو اٹھی تھیں۔ ان کے بھی دو بچے تھے۔ زندہ رہنے کے لیے انھیں کوئی جیسی جدوجہد نہیں کرنی تھی۔ ان کا تعلق سفید پوش طبقے سے تھا جس کا پیٹ بھرا ہوتا ہے اور بٹوے میں تھوڑے زائد پیسے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا اور کوئی کا کرب لگ بھگ ایک جیسا ہے۔ ان کے بچے اپنے اپنے کنبوں میں مگن رہتے ہیں۔ کبھی کبھار فون کر کے سارے فرائض سے سبک دوش ہو جاتے ہیں۔ چھٹیاں گزارنے غیر ممالک نکل جاتے ہیں۔ بزرگ والدین اپنی محبت میں خود آ گئے ہیں لیکن انھیں ویک اینڈ کی پابندی کرنی ہے۔ وہ دن میں کمرے میں بند رہتے ہیں اور بیٹا، بہو اپنے اپنے آفسوں میں۔ کل دونوں پاس آ کر بیٹھے تھے۔ اماں ابو پرسوں ویک اینڈ ہے۔ آپ دونوں کو لے کر ہم لوگ بلو واٹرز جائیں گے۔ بڑی خوب صورت جگہ ہے۔ دونوں سوچتے ہیں تم لوگ پاس بیٹھو، ہنسو بولو۔ گھر کا کھانا ایک میز پر بیٹھ کر گھر کے اندر کھاؤ۔ ہمارے لیے سب سے خوب صورت جگہ یہی ہو گی۔ لیکن وہ کچھ کہتے نہیں۔ اثبات میں سر ہلاتے ہیں، انھیں بچوں کی خوشی عزیز ہے۔ نوجوان جوڑا پروگرام کی تفصیل بتاتے بتاتے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ شب بخیر امی، شب بخیر ابو۔ آپ لوگ کھانا کھا لیجیے۔ ہم ذرا دیر سے کھائیں گے۔ پہلے نہانا ہے۔ آفس میں دس گھنٹے لگا کر آئے ہیں۔

بزرگ جوڑا میز پر تنہا ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ ویک اینڈ کا سوچ رہا ہے جب وہ

کے دلوں میں جو گہری اذیت کو کس نے دیکھا جو چڑھ چڑھ کر جہازوں میں بھر کر بازاروں میں آ کر خیمہ بستیوں میں غیروں کے ہاتھوں اشیاء صرف کی طرح بک گئے اور ان کے کرب کو کس تاریخ نے اپنے صفحات میں محفوظ کیا جو جنگوں، فسادوں اور انسانی استبداد کے ذریعے پیدا ہوئی آفات کی وجہ سے اپنا گھر اپنے عزیز چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔

گیت گاتے گاتے کوکی اداس ہو جاتی ہے لیکن یہ اداسی صرف اس کی آنکھوں میں آتی ہے چہرے پر نہیں۔ اس کی آنکھیں بشاش چہرے کے ساتھ مسکراتی ہیں۔ یہ تاثرات بڑے پیچیدہ ہیں مہذب قصوں کے پیراشوٹوں کی بے پناہ اداکاری کی گرفت سے بھی باہر۔

جمعہ کی شام کوکی کی آنکھوں اور چہرے میں کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ جمعہ کی رات کو وہ بچے بیچے وہ اپنے ہم وطنوں اور ان کے کچھ قریبی دوستوں کے درمیان ہوتی ہے۔ سنیچر کو وہ ول کر گھومنے جاتے ہیں اور چکن کھاتے ہیں جو ان کے ملک میں مہنگی غذا ہے۔ وہاں اس جیسے غریب لوگ مچھلی کھا کھا کے عاجز آ چکے ہوتے ہیں۔

ناچتے گاتے، چکن اور چاول یا نوڈلز کھاتے سنیچر ختم ہو جاتا ہے۔ اتوار کو علی الصبح اٹھ کر وہ اپنی مشینی زندگی میں واپس لوٹ آتی ہے۔ اگلے ختم ہفتے کے انتظار میں گیت گنگناتے اور یہ امید لیے کہ کبھی وہ بہت سے پیسے لے کر اپنے وطن واپس لوٹ کر اپنے بچوں سے مل سکے گی۔

ooo

ڈولی

لکھنؤ بہت بڑا شہر نہیں ہے لیکن تاریخ و تہذیب نے اسے مالا مال کر رکھا ہے۔ اور لاکھ لوگ کہیں کہ استبداد زمانہ نے تہذیب کو لوٹ لیا، تاریخ کو مسخ کر دیا پھر بھی وہ محاورہ صادق آتا ہے کہ ہاتھی مرا بھی تو سوا لاکھ کا۔ اس طرح کے شہر ڈراتے نہیں ہیں، دل میں احترام اور محبت جگاتے ہیں جب کہ میٹرو اپنی تمام شان و شوکت کے باوجود خوف زدہ کرتے ہیں۔ شاید وہ ایک عام آدمی کو اس کی کم تری اور بے بسی کا احساس دلاتے ہیں جب کہ لکھنؤ بڑے پیار سے سب کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ آج بھی۔

لیکن اس نرم نرم پیارے شہر میں اس وقت بھی جب سڑکوں پر اتنی بھیڑ تھی نہ روز جلسے جلوس نکلتے تھے نہ سکون کی کمی تھی اور گومتی ترل رل کرتی بہتی تھی اور امین آباد میں بیلے کے تازہ مہکتے ہار لیے مالی کھڑے رہتے تھے، ڈولی ہمیشہ خوف زدہ رہا کرتی تھی۔ بس کبھی کبھی ہی اس کے چہرے سے خوف اور رنج و اندوہ کی پرچھائیاں ہٹتی تھیں اور بڑا معصوم سا چہرہ باہر آ جاتا تھا۔ ایک حیرت زدہ بچے کا چہرہ جس نے حال ہی میں دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور اپنے معصوم ذہن میں اتارنا شروع کیا ہو۔ یہ چہرہ لکھنؤ جیسا ہوتا تھا —— مہربانی بکھیرتا، مہربانی ڈھونڈتا، کہتا مسکرایئے کہ آپ لکھنؤ میں ہیں۔

یہ شہر کا ایک بارونق اور مشہور علاقہ لال باغ تھا۔ یہاں ڈولی ظہور بخش گرجا کے احاطے میں بنی وائی ڈبلیو سی اے کی عمارت میں رہا کرتی تھی۔ گرجا ایک عیسائی مذہب اختیار کر لینے والے ظہور بخش صاحب کے نام سے موسوم تھا۔ ظہور بخش صاحب نے مذہب تبدیل کیا لیکن نام

نہیں جو ان کے باپ دادوں نے انھیں دیا تھا۔ شاید انھیں بپتسمہ دینے والے پادری صاحب نے بھی نام بدلنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ بہر کیف یہ نہایت دلچسپ نام تھا۔ اس کی سرخ رنگ کی عمارت کی وجہ سے کچھ لوگ اسے لال گرجا بھی کہہ لیتے تھے۔ عمارت نہایت سادہ، گوتھک طرز کی عمارت تھی۔ اس سے متصل عیسائیوں کا قبرستان تھا۔ وہاں کی قبریں بھی بڑی سادہ تھیں۔ شاید ان میں دفن ہونے والے بھی بے چارے سے مقامی کالے عیسائی ہوا کرتے ہوں گے لیکن گرجا تھا بہت پرانا۔ ۱۸۷۷ء میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی تھی۔

عیسائیوں کے قبرستان عموماً گرجا سے ہی منسلک ہوتے ہیں۔ یہ تصور تو اسلام میں ہے کہ موت کو کثرت سے یاد کیا کرو لیکن مسجدوں سے منسلک قبرستان شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اب یہ ضرور ہے کہ موت کو کثرت سے یاد کرنے یا نہ کرنے کا کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا۔ انسانی فطرت کے کمینے پن کا کوئی تریاق آج تک دریافت نہیں ہوا۔ ہاں کچھ لوگ ہیں جو اپنے اعمال اپنی فطری نیکی کی وجہ سے درست رکھتے ہیں۔ ان نیک روحوں کو موت کو یاد رکھنے یا نہ رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ بے چارے نیک پیدا ہوتے (یا نیک ہونے پر مجبور ہوتے) اور کھاسڑ پاسڑ زندگی گزار کر عموماً نیک ہی مرجایا کرتے ہیں۔ یہ محاورہ کہ گزر گئی گزران، کیا جھونپڑی کیا میدان انھیں لوگوں میں سے کسی کا ایجاد کیا ہوا لگتا ہے۔ عموماً جنگ، فساد، نسل کشی، قتل اور قدرتی آفات میں نقصان اٹھانے یا مرنے والوں کی بیش تر تعداد بھی انھیں لوگوں کی ہوتی ہے۔ اکثر پیغمبروں نے انھیں جنت کی بشارت دی ہوئی ہے۔

بس ایسی ہی تھی ڈولی بھی جس کا پورا نام ڈولی ہیڈنیل تھا۔

ڈولی نہ صرف ہر وقت ڈری سہمی سی رہا کرتی تھی بلکہ وہ ساری دنیا کی آفتوں کا ذمہ دار بھی بڑی آسانی سے خود کو ٹھہرا لیا کرتی تھی۔ مثلاً اس کا کہنا تھا کہ پہلی جنگ عظیم اسی کی وجہ سے ہوئی تھی اور روس پر نپولین نے حملہ ڈولی کے کہنے پر کیا تھا۔ اس وقت ڈولی کو نہیں معلوم تھا کہ ان جنگوں میں کتنے لوگ مارے جائیں گے، کتنے اپاہج ہوں گے اور کتنے بے گھر۔ اس لیے وہ بہت دل گرفتہ اور اداس رہا کرتی تھی۔

''کیوں بھئی ڈولی۔ تمہاری عمر کتنی ہے؟ تم نپولین کے وقت میں بھی تھیں اور پھر پہلی

جنگ عظیم میں بھی۔ اب تم دوسری جنگ عظیم دیکھ کر یہاں ہندوستان تشریف لے آئی ہیں۔''

ایک مرتبہ ہوسٹل میں رہائش پذیر ایک نوجوان لڑکی نے اسے چھیڑا تھا۔

ڈولی نے بڑی سنجیدگی سے اپنی آرام کرسی کو، جس میں وہ اپنا زیادہ تر وقت گزارتی تھی، آگے پیچھے کیا اور کہا تمھیں نہیں معلوم میری عمر پانچ سو سال ہو چکی ہے۔ ''تو؟'' اس کے گرد کھڑی اور دو چار لڑکیاں بدتمیزی سے ہنس پڑیں۔ ''پھر بھی ان جنگوں میں تمہارا دخل کیسے ہو گیا۔''

جب ڈولی کو جواب نہیں دینا ہوتا تھا تو وہ آنکھیں بند کر کے ہونٹ بھینچ لیتی تھی جس کا مطلب ہوتا تھا ''لے اب جاؤ۔ ہم بے وقوفی کی باتوں کا جواب نہیں دیتے۔'' اکثر وائی ڈبلیو سی اے کا نیک دل لیکن چکر کر کرتی لاپنی آنکھوں والا بیرا عبدل ادھر آ نکلتا اور لڑکیوں کو تنبیہ کرتا۔ ''یہ بزرگ ہیں اور اوز کہہ کر وہ قدرے رکتا اور انگشت شہادت کو کنپٹی کے گرد گھماتا۔ انھیں تنگ مت کیا کرو۔''

''نہیں عبدل۔ ہم انھیں تنگ نہیں کرتے۔ بس کچھ ہنسی کھیل کر لیتے ہیں۔ آخر دن بھر اکیلی ہی تو پڑی رہتی ہیں۔''

''نہیں ہم سب ہیں نا انھیں دیکھنے کو۔ بات ضرور کیجیے ہنسی بابا، ہنسی بھی کیجیے بس بحث مت کیجیے۔'' ''ایک دن ہم انھیں کھانا کھلا رہے تھے تو پوچھا --- جنگ ختم ہو گئی عبدل۔'' ہم نے کہا کب کی ختم ہو گئی مادام۔ ڈریے مت۔'' بگڑ گئیں ''کہاں ختم ہوئی؟ تم بہت جھوٹ بولتے ہو۔ سن نہیں رہے اوپر بمبار منڈلا رہے ہیں اور اینٹی ایئرکرافٹ گرج رہی ہیں۔'' وہ ناراض نہ ہوں یہ سوچ کر ایک دن ہم نے کہہ دیا کہ جی، کہاں ختم ہوئی۔ بالکل نہیں ہوئی تو انھوں نے ہاتھ مار کر کھانے کی پلیٹ پھینک دی اور رونا شروع کر دیا۔

ڈولی کے اس سوال سے سب واقف تھے۔ ہوسٹل میں رہنے والے بھی اور اکثر یوتھ کلب کی منعقد ہونے والی تقریبات میں آنے والے بھی۔ ''جنگ ختم ہو گئی کیا؟''

ہندوستان میں کافی عرصے سے رہنے کے باوجود ڈولی صرف انگریزی بولتی تھی (دراصل وہ بولتی ہی بہت کم تھی)۔ ادھر دو لڑکیاں کولمبو سے بھی آ گئی تھیں۔ ان میں سے کئی لڑکیوں کو ہندوستانی بالکل نہیں آتی تھی یا واجبی آتی تھی۔ یہ کولمبو والی لڑکیاں تو عرصے تک گائڈ بک کھول

کروا دینا۔ پایاں ہی بکتی رہی تھیں کہ رکشے والوں کو راستہ سمجھا سکیں۔ سب کا کام انگریزی سے چلتا تھا، صحیح ہو یا واجبی۔ عبدل اور دوسرا اسٹاف جو خالص ہندوستانی ہی نہیں، اردو کے علاقے کا تھا، کٹر مزا انگریزی کو اور کچھ اردو میں پرو کر کام چلاتا تھا۔ خاص طور پر عبدل۔

اس وقت وہ ڈولی کو چھیڑنے والی لڑکیوں کو نصیحت کرتے ہوئے کندھے پر پڑا جھاڑن سنبھالتا پینٹری کی طرف بڑھ گیا اور چلتے چلتے پلٹ کر بولا You all good girl, no bad to Dolly ma'm

لڑکیاں ہنستی ہوئی بھاگ گئیں۔ ڈولی پر نہیں۔ عبدل کی انگریزی سے محظوظ ہو کر لیکن ایک قدرے بڑی عمر کی ہندوستانی عیسائی خاتون آنرس پیتھمن نے انھیں گھور کر دیکھا۔ آنرس پر نظر پڑتے ہی ڈولی نے چیخنا شروع کیا۔

"food, food. I could do with some food. Havn't eaten for last three days."

لندن کے مضافات میں ڈولی نے کچھ اور لوگوں کے ساتھ جو بمباری سے کسی طرح بچ گئے تھے، گل لالہ (tulip) کے بلب کھا کھا کر گزارا کیا تھا لیکن وہ اس طرح چیختی شاذ و نادر ہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی مہربان لڑکی اس کے پاس بیٹھ جاتی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے گپ کرنے لگتی۔ زیادہ تر یہ آنرس جن کا ایمان اتنا پختہ تھا کہ ان کا کہنا تھا کہ انھوں نے 'Hail Mary.' کا ورد کر کے اپنی آنکھوں کا وہ مرض ٹھیک کر لیا تھا جو کئی ڈاکٹروں کے علاج سے بھی ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں خدا ترس تھیں اور خدمت خلق کو اصل عیسائیت تصور کرتی تھیں۔ اس لیے وہ ڈولی کو کبھی چھیڑتی نہیں تھیں۔ ہمیشہ دلجوئی کرتی رہتی تھیں۔ اس کے جسد خاکی کو غسل بھی انھوں نے ہی دیا تھا۔

ہوسٹل کا آفس، اس سے ملحق سکریٹری کا ذاتی کمرہ اس برآمدے سے زیادہ دور نہیں تھے جہاں ڈولی کا کمرہ تھا جو اس کی خصوصی مراعات میں شامل تھا۔ کمرے کے سامنے وسیع و عریض برآمدہ تھا جس میں اس کی آرام کرسی پڑی رہتی تھی۔

چیخیں سن کر راج موہنی خود دوڑی چلی آئیں "What's wrong deary, sweet

heart" ڈیری اور سویٹ ہارٹ ان کا تکیہ کلام تھے۔ وہ لڑکیوں سے لیے جن میں چند عمر خواتین بھی شامل تھیں یہی طرز تخاطب اختیار کرتی تھیں لیکن جب کہ [illegible] سے یہ یا فطرتاً میکانکی طور پر ادا ہوتے تھے، ڈولی کے لیے دل سے نکلتے تھے۔

انھوں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور سہلانے لگیں۔ ڈولی ہاتھ پکڑنے سے بہت خوش ہوتی تھی۔ دورے کی کیفیت میں اسے سکون پہنچانے کا یہ خاصا موثر نسخہ تھا۔

"He used to hold my hands from School days say I had beautiful hands soft and white with tapering fingers and pink nails."

کئی مرتبہ لڑکیاں اس سے پوچھتیں "وہ کون تھا ڈولی؟ اس کا نام کیا تھا۔" جواب ملتا۔ "مجھے نہیں معلوم۔ بس اس نے مجھے ریپ نہیں کیا تھا۔ وہ ہماری طرح سچا کرسچن تھا۔"

راج موہنی دیدی نے ایک مرتبہ ڈنر کے دوران گفتگو میں بتایا تھا کہ ۱۹۴۴ء میں جب دوسری جنگ عظیم شباب پر تھی، ڈولی کو اس کے بچپن کے ہم جماعت دوست منان نے اپنی ماں کی انگوٹھی پہنا کر منگنی کا اعلان کر دیا تھا۔ پھر جلد ہی دونوں کے کنبے لندن پر ہوئی جنگ (biltz) کے دوران مکمل طور پر صاف ہو گئے۔ منان بھی ملبے میں دب گیا۔ اس کے باقیات تک نہیں ملے (باقیات تو کسی کے نہیں ملے)۔ ڈولی دونوں کنبوں کے پچیس افراد میں واحد انسان تھی جو بچ گئی تھی۔ خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے۔ یہ بھی ایک سوال تھا۔

کچھ عرصہ پہلے ان دونوں کے کنبوں کے تین بہت چھوٹے بچوں کو قریب و جوار کے [illegible] بچوں کے ساتھ ایک بس میں بھر کر کسی محفوظ جگہ منتقل کر دیا گیا تھا۔ وہ بھی نہیں لوٹے۔ ڈولی نے ذہن میں جو چھوٹی چھوٹی گڑیاں سکتی رہتی تھیں تو وہ ان دہشت زدہ ننھے بچوں [illegible] کو بس میں سوار کرنے والی [illegible] کے بارے میں بتاتی تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ دیکھ [illegible] چہرے میں جب جاتا تھا۔ وہ [illegible] میں جانتی تھیں کہ شاید وہ اب اپنے بچوں سے کبھی نہیں مل سکیں [illegible] یہ بچے یاد ہوں۔ ڈولی کا پانچ سال بھائی بھی کبھی نہیں [illegible] پتہ نہیں زندہ تھی یا نہیں۔ [illegible] بچوں سے متعلق معلومہ سوال تھا [illegible] دور ہو گئے تھے۔

مشکل دس گیارہ برس کے ہوئے تو انھیں کھیتوں اور فیکٹریوں میں کام پر لگا دیا گیا تھا۔ فوجوں کو کھانا چاہیے تھا اور ہتھیار۔ (یہ قصہ کہاں کا تھا؟ دوسری جنگ عظیم کا یا عراق کا یا ویت نام کا یا افغانستان کا یا تقسیم کے وقت کے ہندوستان کا یا کسی افریقی ملک کا یا چین جاپان میں سے کسی کا --- اس فہرست کو آگے نہیں بڑھانا ہے ورنہ ڈولی کا قصہ تو رہ ہی جائے گا)۔ ڈولی تو جہاں سے آئی تھی وہیں کی کہانی پشت پر بندھی گٹھری کا بے ہنگا بے کھول کر سناتی رہتی تھی۔ لیکن پھر یہ کہ جنگوں میں تباہ شدہ انسانوں کی کہانیاں مختلف بھی کتنی ہوتی ہیں؟ انسانی ظلم و استبداد، بربریت و شقی القلبی، حرص و طمع، کچھ لوگوں کی انا اور برتری سے اُبجی ناقابل برداشت، ناقابل بیان اذیتوں کی کلیجہ شق کر دینے والی کہانیاں، راوی کے زندہ چہرے کو لاش جیسا بنا دینے والی کہانیاں۔

O

اتوار کے اتوار ڈولی کو وہیل چیئر پر بٹھا کر گرجا لے جایا جاتا تھا۔ عبادت ایک تو فرض دوسرے یہ عام خیال کہ عبادت پراگندہ ذہن کو سکون بخشتی ہے۔ چوں کہ ہوسٹل کی عمارت علیہور بخش گرجا کے احاطے میں ہی تھی اس لیے ڈولی کو لے جانا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا سوائے اس کے کہ کبھی کبھی وہ اڑ جاتی اور وہیل چیئر پر بیٹھنے سے صاف انکار کر دیتی۔ یا اگر چلی جاتی تو عبادت میں شریک ہونے سے مکر جاتی۔ ایسے ہی اڑیل موڈ والے کسی لمحے (mode) میں اس نے گھور کر میوالال کو دیکھا، جو وہیل چیئر لیے کھڑا اس کی منت سماجت کر رہا تھا، اور بولی:

"Meva, why did God do what He did?"

میوا ہونقوں کی طرح اس کا منہ تکنے لگا۔ وہ عام فہم انگریزی سمجھ لیتا تھا۔ ڈولی کے لہجے سے بھی اب مانوس ہو چکا تھا لیکن یہ سوال اس کی فہم سے پرے تھا۔

OK. Why does God do what He does?

ڈولی کو لگا کہ صیغۂ ماضی کو صیغۂ حال میں بدل دینے سے بات میوالال کی سمجھ میں آ جائے گی لیکن وہ بدستور خود اپنا منہ بھاڑ کی طرح کھولے ڈولی کا منہ تکتا رہا۔

میوالال کوئی تیرہ چودہ برس کا مسیں بھیگتا ہر یجن لڑکا تھا جب اسے اس کا باپ مس راج

سوتی کے خدمت خلق اور خدا ترسی کے قصے سن کر یہاں چھوڑ گیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ چھوٹی لال کرتی (جہاں وہ رہتا تھا) کے پیکو بھنگیوں کے ساتھ بیٹھنے لگا ہے۔ اسے آپ رکھ لیجیے۔ چاہیں تو چشمہ دلا دیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ رہے گا تو ہمارا بیٹا ہی۔ بس سدھر جائے۔ سنا ہے آپ کے یہاں کوئی ملازم درکار ہے یہ کوئی تین سال پہلے کی بات ہے۔ تب سے وہ یہیں تھا۔ اسے مالی نے ساتھ ملا کر کام سکھا دیا تھا۔ خیر مالی کا کام تو کم وقت کا تھا زیادہ تر وہ کچن میں رہتا اور خانساماں کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ چشمہ تو اسے ابھی تک نہیں دلایا گیا لیکن تین سال کے قیام میں وہ پکا عیسائی بن گیا تھا۔ بات بات پر خود کو کراس کرتا اور پابندی سے گرجا گھر جایا کرتا تھا۔ وہاں جی لگا کر جھاڑ پونچھ کرتا کہ یسوع مسیح خوش ہوں گے۔ یسوع مسیح اکثر پادری صاحب کی وساطت سے اس پر خوش بھی ہوتے رہتے تھے۔ باہر سے آئے کپڑوں کے بکسوں سے عمدہ کپڑے (عموماً مردہ لوگوں کے) ٹائی، ازر جی فوڈ اسے ملتے رہتے تھے۔ اتوار کو چرچ آنے والے کچھ مخیر حضرات اسے الگ سے ایک آدھ روپیہ ٹپ میں دے دیتے۔

"ارے ایسے کیوں کھڑے ہو میوالال۔ کم آن ڈولی، آ جاؤ وہیل چیئر میں۔ شاباش۔"

ایک لڑکی نے سر پر اسکارف درست کرتے ہوئے کہا۔ ڈولی نے میکانکی انداز میں اپنا سوال دوہرایا۔

دیکھیے۔ کرسی میں گھس ہی نہیں رہیں۔ یہی پوچھے جا رہی ہیں۔ میوالال نے کہا۔

لڑکی نے میوالال کو مختصراً بتایا کہ ڈولی کیا کہہ رہی ہے اور کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ "لے آؤ بھائی ڈولی کو۔"

میوالال نے گلے پیٹے۔ ڈولی خدا کی خدائی کا سبب پوچھ رہی تھی۔ کلمۂ کفر۔ "God do only good" میوالال نے اپنی انگریزی میں ڈولی کا ایمان واپس لانا چاہا۔

ڈولی کے دماغ کی کھڑکیاں اس وقت کچھ دیر کے لیے کھل گئی تھیں۔ وہ مراقبے میں نہیں تھی بلکہ گردو پیش پر نظریں دوڑا رہی تھی۔ خدا سب اچھا ہی کرتا ہے پر وہ بھڑک گئی۔ پھر تو زمین جنبد آسماں جنبد نہ جنبد ڈولی بڈنگل۔ اسے کسی بھی طرح چرچ جانے پر آمادہ نہیں کیا جا سکا۔ چرچ سے واپس آنے کے بعد البتہ آرس نیشن نے اسے انگوروں کے ایک خوشے سے انگور چن

کر کھلائے۔

"یہ کہاں سے آ گئے؟ پھل تو پھل یہاں تو بریڈ بھی نصیب میں نہیں۔"

"ذولی، آرس نے ملائمیت سے کہا۔ اب تو سب کچھ ہے اور بہت دن سے ہے۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ زندگی خدا کا انعام ہے اس کے لیے شکر کرو اور جیو۔"

ذولی کا سارا جسم اچانک کانپنے لگا۔

"چلو تمہیں باہر گھما کر لاتے ہیں۔" آرس اس کے لرزتے جسم کو سہارا دے کر باہر لان میں لائیں۔

موسم نہایت خوش گوار تھا۔ درخت سرسبز تھے، چڑیاں اڑتیں، پھر آ کر بیٹھ جاتیں۔ کچھ کی چونچ میں تنکے تھے۔ ایک کبوتروں کا جوڑا رومانس میں مشغول تھا۔ بوگن ولا کی جھاڑی پھولوں سے گہری گلابی ہو رہی تھی۔ خوش گوار ہوا ہولے ہولے ان دو عورتوں کے چہرے سہلاتی ہوئی گزری۔ بادلوں نے اچانک سائے گہرے کر دیے تھے اور بارش کی پیشین گوئی کر رہے تھے۔

"تم عذاب کو انعام کہتی ہو؟" ذولی نے اپنا اسکرٹ جسم کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔

آرس نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ذولی کے ذہن کے شفاف وقفوں (lucid periods) میں اس کی یادیں واپس آنے لگتی تھیں لیکن یہ وقفے اس کے لیے انتہائی اذیت ناک ہوتے تھے۔

"میری ماں نے نو بچے پیدا کیے تھے اور وہ پھر بھی بڑی مضبوط اور محنتی تھی۔ میرے علاوہ سارے بچے مارے گئے۔ پانچ سال کا موٹے موٹے گالوں والا جم اور تین سال کی کیرولین جس کے بال سنہری تھے۔ اچھا یہ بتاؤ آرس کیا دو غلط مل کر ایک صحیح بناتے ہیں؟ تم نے میرے بچے مارے میں تمہارے بچوں کو ماروں گا، تم نے میری ...اس نے جھرجھری لی اور تھوڑے سے وقفے کے بعد بولی۔

ہمارے چھوٹے سے کچن گارڈن میں خوب سبزیاں اُگتی تھیں اور لان میں سبز گھاس کے علاوہ خوش رنگ پھول تھے۔ نہر کے سوتے کے پانی میں چاندی کی مچھلیاں اُچھلا کرتی تھیں۔ میرا باپ آتے ہی ہم سب کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا کرتا تھا۔ ہمارے پڑوسی مہربان

تھے۔

وہ یک لخت چونک [illegible] ... وہ سارے [illegible]

[illegible] نے [illegible] انداز میں سوال کیا: Is is the war over?

چلو ذولی اندر چلتے ہیں۔ دیکھو یہاں کتنی [illegible]

[illegible] گئے۔" ذولی نے [illegible]

[illegible] آرس کا باپ [illegible]

○

[illegible] جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد اس میں شامل ملکوں نے [illegible] [illegible] پروگرام شروع کیے۔ اس کے تحت [illegible] [illegible] بھی شامل تھی۔ [illegible] ذولی بھی دریافت ہوئی تھی۔ اس کا کوئی رشتہ [illegible] [illegible] بعد ایک [illegible] کا پتہ چلا جو ہندوستانی فوج میں اچھے عہدے [illegible] [illegible] انھوں نے پرانے لکھنؤ کی ایک اعلیٰ خاندان [illegible] سے شادی کی تھی جن سے ان کے چار چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ [illegible] میں ۱۹۴۷ کا خون خرابہ [illegible] اور [illegible] قاتل [illegible] کے بعد [illegible] صاحب [illegible] انسان تھے۔ [illegible] قبول [illegible] صدی [illegible] ان کا انتقال ہو گیا۔ ذولی کی طرح [illegible] [illegible] جو ایک بڑے [illegible] تھیں۔ [illegible] (R3) کہلاتی تھیں۔ جنگ عظیم کے بعد [illegible] [illegible] تھیں۔ تھیں تو نہایت [illegible] [illegible]

ذولی [illegible] [illegible]

ایک دن کھانے کی میز پر وہ لندن میں اپنے ریلیف کیمپ کے تجربے بیان کر رہی تھیں۔ ان کے دوران بڑے رنجیدہ لہجے میں بولیں ——— "کون ظالم تھا، کون مظلوم یہ فیصلہ تو کبھی نہیں ہو سکے گا۔ نازیوں کے ظلم کی داستانیں عام ہیں لیکن جب جنگ کے آخری دور میں روسی فوجیں جرمنی میں داخل ہوئیں تو علاوہ اور جاپانیوں کے عورتوں کا جو حال ہوا اس کے تحت ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۸ء کے دوران ہر سال بیس لاکھ اسقاط کرائے جاتے رہنے کی رپورٹ ہے۔"

ایک پختہ عمر خاتون نے جو ایک کالج میں تاریخ پڑھاتی تھیں لقمہ دیا ——— یوں تو ہر ملک میں گم شدہ اور یتیم بچے بکھرے پڑے تھے لیکن صرف یوگوسلاویہ، صرف میں چھوٹے سے ملک میں اس طرح کے بچوں کی تعداد تین لاکھ تھی۔" (ڈولی نے سوال کیا تھا: Can two wrongs make one right?)

○

ادھر ڈولی بہت کم بول رہی تھی۔ پہلے بھی زیادہ تر خاموش ہی رہتی تھی لیکن اب تو وہ اپنے سوال بھی بھول گئی تھی۔ کھانا بہت کم کر دیا تھا۔ کئی مرتبہ تو ایک لقمہ کھائے بغیر پلیٹ اٹھا لینے کا اشارہ کرتی۔ باہر بھی نہیں آتی کمرے میں پڑی رہا کرتی تھی۔ ہاں ایک دن صبح اس نے کمرے سے نکل کر باہر اپنے پسندیدہ واڑے یعنی آرام کرسی میں بیٹھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس میں بیٹھ کر کچھ دیر آگے پیچھے جھولنے کے بعد اس نے آنکھیں مُوند لیں۔ پھر کبھی نہیں کھولیں۔

ظہور بخش گرجے کے قبرستان میں اس کی تدفین ہوئی۔ چرچ سروس کے بعد لوگوں نے اس کی مغفرت کی دعائیں کیں۔ پھر لوگ اپنی اپنی زندگی میں مگن ہو گئے۔ ڈولی کا ذکر شاید ہی کبھی ہوتا۔ بس قبرستان کا کیئر ٹیکر غریب بوڑھا کالا عیسائی سائمن مسیح اس کی قبر پر کبھی کبھی ایک آدھ کبھی کوئی پھول رکھ دیتا۔ عموماً یہ پھول وہ دوسری قبروں پر رکھے گلدستوں سے نکال لیا کرتا تھا۔ وہ ان چند لوگوں میں سے تھا جنہیں ڈولی سے خدا واسطے کی ہمدردی تھی۔

تو کیا اسی لیے سب سے پہلے سائمن نے ہی ڈولی کو دیکھا۔

اس کے انتقال کے بعد پہلا کرسمس قریب تھا۔ جاڑوں کی آمد آمد ہو چکی تھی۔ خنکی

شاموں میں گرجا کے پیڑوں سے اُلو اتر اتر کر کھلے میدان کی گھاس میں چہل قدمی کرنے لگتے تھے۔ دو چار تو ہوسٹل کے آنگن میں بھی چلے آتے۔ ویسے زیادہ تر درختوں کی شاخوں میں چھپے منحوس آوازیں نکالتے رہتے تھے۔ سائمن ان کا عادی تھا۔ سائمن کیا، وہاں رہنے والے سبھی لوگ عادی تھے۔ لیکن اس دن سائمن خواہ مخواہ ڈر رہا تھا۔ اماوس کی رات، گھپ اندھیرا، اس پر سے اچانک لائٹ چلی گئی۔ حجرے کا دروازہ بند کرنے کے لیے اٹھا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور جسم پتھر کا ہو گیا۔

اُلو یکایک خاموش ہو گئے تھے اور تاریکی میں گھنے برگد کے پیچھے سے ایک ہیولیٰ اُبھر رہا تھا۔ گرجا کے میناروں کے متوازی، ہوا میں دھوئیں کی طرح معلق۔ پھر اس ہیولے سے ایک کاغذ جیسا سفید چہرہ نمودار ہوا۔ سیاہ پس منظر میں مِن مِن موت کا چہرہ۔

سائمن نے ڈولی کو پہچان لیا چہرہ ہوا میں تیرتا اس کے قریب آن پہنچا لیکن وہ حرکت نہیں کر سکا۔ بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ "Simon, old man, is the war over?" چہرہ مسکرایا مسرت سے عاری ذرا دُنی مسکراہٹ پھر اگلے لمحے فضا میں تحلیل ہو گیا۔

اگلی صبح سائمن کی بات کا کسی نے یقین نہیں کیا۔ سب نے اسے ایک جاہل ڈرے ہوئے بوڑھے کا وہم قرار دیا۔ لیکن پھر کئی لوگوں نے قسم کھا کر بتایا کہ اماوس کی اندھیری رات کے پچھلے پہر ڈولی اکثر نمودار ہوتی ہے اور جو سامنے دکھائی پڑ جائے، اس کے قریب آ کر پوچھتی ہے کہ کیا جنگ ختم ہو گئی کیا۔ پھر فوراً ہی فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ ہاں اس نے کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

○○○

ایک ٹکڑا غالب

ڈیوڑھی کے باہر کچھ تیز تیز آوازیں محسوس ہوئیں اور کچھ ہلچل بھی۔ گرچہ اس وقت تک مرزا کی سماعت خاصی کمزور ہو چکی تھی لیکن وقت ایسا تھا کہ پتہ بھی ہلے تو سارا جسم کان بن جائے۔ کون ہو سکتا ہے؟ کیا ہو سکتا ہے؟

ڈیوڑھی پر مہاراجہ پٹیالہ کے تعینات کرائے ہوئے محافظ پہرہ دے رہے تھے۔ غالب کے علاوہ اس گلی میں حکیم محمود خاں اور کئی ایسے شرفا کے خاندان آباد تھے جن کا مہاراجہ سے خاص ربط تھا اور پنجاب کمپنی بہادر کا بھی خیر خواہ تھا۔ ادھر ملکہ وکٹوریہ کی جناب میں روانہ کیے گئے قصیدے اور پنشن کی درخواست پر فی الفور کارروائی تو نہیں ہوئی تھی لیکن اس قصیدے نے انھیں ستو دلی کے بعد فرنگی عتاب سے محفوظ ضرور رکھا تھا۔ مہاراجہ نے دراصل پوری گلی کے مکینوں کے لیے محافظ بھجوائے تھے لیکن قتل و غارت گری کا جو بازار گرم تھا اس میں کیا مہ فذ اور کون سے محافظ۔

کچھ عرصہ پہلے ہی گلی قاسم جان کے آخری سرے پر رہنے والے ایک شناسا بلکہ غالب شناس تشریف لائے تھے۔ "حضرت آج تو سنا کہ غضب ہو گیا۔" بیٹھے بھی نہ تھے کہ پھوٹ پڑے۔

"سناؤ بھائی۔ یہ بھی سن لیں، کیا سنا، کیا دیکھا۔"

"حضرت دیکھا تو نہیں اور اللہ کبھی دکھائے بھی نہیں۔ سنا ہے کہ اس افراط و تفریط کے زمانے میں اعلیٰ حضرت ذرا کی ذرا حوض کے کنارے بیٹھے امرا و مصاحبین خاص کے ساتھ دل بہلانے کو باہر تشریف لا ہی رہے تھے کہ کچھ ہی فاصلے پر توپ کا گولا آن کر پھٹا۔ اُلٹے پاؤں اندر کی جانب رُخ کیا۔ پنجتن پاک کا سایہ کہ کسی کو خراش تک نہ آئی۔"

غالب کی دھندلی پڑتی آنکھیں خلا میں کچھ ڈھونڈنے لگیں۔ آج تو ظل الٰہی کو خراش نہ آئی لیکن کل؟ کل کس نے دیکھا ہے۔

(اور ادھر تاریخ نے پلکیں جھپکائیں۔ اُدھر وہ کل آن پہنچا۔ آل تیمور چن چن کر قتل کی جانے لگی۔ ملکہ وکٹوریہ ہندوستان کی بھی ملکہ ہو گئیں۔ بادشاہ پر مقدمہ چلا اور انھیں انتہائی درجے کی ذلت و خواری کے بعد جلاوطن کیے جانے کا فیصلہ سنایا گیا۔ ہاتھی سوار بیل گاڑی میں بیٹھ کر اپنے اجداد کی وراثت پر حسرت بھری نظریں ڈالتا رخصت ہوا یوں کہ بھرے کوئے یار میں دفن ہونے کو دو گز زمین بھی نہ ملی۔)

دروازے پر ہلچل بڑھ رہی تھی۔ تیزی کے سبب مرزا کے نحیف کانوں نے اسے بخوبی محسوس کیا۔ "ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے" دیکھتے ہیں اب کون سا تماشہ ہونے کو ہے، یا ہو رہا ہے۔ کہنے کو تو دنیا کو بازیچۂ اطفال کہہ ڈالا لیکن کیا یہ بازیچۂ اطفال ہے کہ دلی میں جگہ جگہ لاشیں یوں ایک کے اوپر ایک چنی ہوئی ہیں جیسے لکڑی فروش کی دوکان پر ٹکے اوپر کندے چنے ہوئے ہوتے ہیں۔ شاید اب ہماری گردن ماری جائے گی اور دوسرے تماشہ دیکھیں گے۔ کیا ہماری ضعیف بی بی کی تقدیر میں اس عمر میں رنڈاپے کا جوڑا لکھا ہے۔ اچھا ہے اسی کو سہی رہائی تو ملے۔"

کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ ادھر اندر سے خادمہ پیشانی سے کچھ نیچے نصف گھونگھٹ کی صورت آنچل سرکائے، چلمچی آفتابہ لے کر ہاتھ دھلانے کو برآمد ہوئی اُدھر باہر کی جانب سے کچھ گورے بھی دندناتے ہوئے داخل ہوئے۔ پیچھے پیچھے مہاراجہ کے مقرر کردہ محافظ چلے آ رہے تھے۔

فرنگیوں نے کسی سامان کو نہیں چھیڑا۔ اور سامان تھا بھی کیا۔ مرزا کپڑے تک بیچ کے کھا گئے تھے۔ لکھ ہی تھا لوگ روٹی کھاتے ہیں، میں کپڑے کھا رہا ہوں۔ چیل کے گھونسلے سے ماس غائب ہو تو چیل کیا لے جائے۔ بس مرزا، عارف مرحوم کے دونوں بچے، تین ملازم۔ ہاں گلی سے کچھ مکین بھی اُٹھا لیے۔ مرزا بہ وقت تمام چل پا رہے تھے۔ جو ہمیشہ پالکی میں نکلے اسے یہ وقت بھی دیکھنا تھا۔ ایک ملازم نے آگے بڑھ کر سہارا دیا اور ایک ہی دفعہ نے بھی۔ گورے معترض نہ ہوئے۔

چلمچی آفتابہ جوں کا توں واپس لیے، تھر تھر کانپتی ملازمہ واپس اندر آئی اور پورا واقعہ بی بی کے گوش گزار کیا۔ امراؤ بیگم کا قلب ڈوبنے لگا۔ حکیم احسن اللہ خاں کا بھی کا دیا ہوا عرق

بید مشک بچا رکھا تھا۔ وہ تانبے کے قلعی کیے ہوئے نقشین کٹورے میں نکال کر بی بی کے منہ سے لگایا۔ وہ خود بید کی طرح لرزاں تھیں۔ کچھ حلق سے اترا، کچھ باہر چھلک کر کپڑوں پہ گرا۔ وہ زیادہ تر باوضو رہا کرتی تھیں فوراً مصلے پر بیٹھ کر سجدہ ریز ہو گئیں۔ ایسا شاید ہی ہوتا تھا کہ سر سجدے میں ہو اور دماغ سرکش گھوڑے کی طرح یوں بے لگام کہ قابو میں ہی نہ آئے۔ مرزا یوں بھی چٹکیاں لیتے رہتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے مکان بدلنے کا خیال آیا۔ وہ بہ نفس نفیس پالکی میں سوار ہو کر مکان دیکھنے گئیں۔ واپس آئیں تو مرزا نے احوال پوچھا۔ بولیں مکان تو اچھا ہے لیکن ہمسایوں نے بتایا کہ اس میں بلا ہے۔ برجستہ جواب ملا آپ سے بڑی بھی کوئی بلا ہو گی۔ یہ سارا کچھ یہ یک تبسم چٹکیوں میں اڑا دیا کرتی تھیں خواہ دل میں کیسی ہی جلن کیوں نہ ہوتی ہو۔ پھر ظرافت تو میاں کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ سبھی کو چٹکیاں بھرتے رہتے تھے۔ مگر ہاں بلا کہیں یا بلائے جان۔ مذہب کو لے کر ظرافت ذرا کھل جایا کرتی تھی۔ ڈرتی تھیں شوہر کی بخشش نہ ہوئی تو تنہا جنت میں کیسے جائیں گی۔ لیکن وہ جنت دوزخ کے قائل کب تھے کہہ ہی چکے تھے دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ توبہ توبہ کیسے کیسے خیال، کیسی کیسی باتیں۔ ایک بار جھلا کر بولی بھی تھی کہ اس موئی ڈومنی کو بھاتی ہوں گی آپ کی یہ باتیں، اسی سے کیا کیجیے۔ یا مولا مشکل کشا، میرے سر تاج کی خیر۔ میرے باقر، میرے حسین کی خیر۔ میرے بے گناہ ملازموں کی بھی خیر۔ ان کو کچھ ہوا تو ہم بوڑھے کہاں جائیں گے، کیسے زندگی تیر کریں گے۔ آدمی کے بغیر تنہا ہلنا مشکل۔ میرے ہم سایوں کی بھی خیر۔ اچھا ہوا جو وہ کم بخت مرگئی۔ اس نے اور مرزا کی غزلیں گا گا کے ان کا دماغ خراب کر رکھا تھا۔ ہر بات پہ آمنا و صدقنا۔ توبہ توبہ۔ کسی کے مرنے پہ خوش ہونا گناہ ہے۔ یہ نامراد لال منہ والے بندر، یہ فرنگی۔ انھوں نے یکسوئی چھین لی۔ عبادت میں بھی دخل انداز۔ خدا انھیں غارت کرے۔ وہ موئی ڈومنی میرا کیا لے رہی تھی۔ مرزا واپس تو گھر ہی آتے تھے۔ اس جان ہار کو کیوں بُرا کہوں۔ اپنے اعمال اپنے ساتھ لے گئی۔ مرزا کو صدمہ دے گئی۔ دو گھڑی باہر ہی بہلا آتے تھے۔ اس سے بُری تو وہ ہے، وہ ام الخبائث۔ ڈومنی کے گھر جائیں نہ جائیں، ام الخبائث کو منہ لگانا ضروری۔ ایک زمانے میں پیسے کی زیادہ تنگی ہونے پر چھوڑ دی تھی تو کیسے دیوانے بنے پھرتے تھے۔ کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ لیکن گذر گئی گذران، کیا جھونپڑی کیا مکان۔ میرے اللہ اب میں

آخر عمر میں کسی بات کو جی پڑ نہ اوں گی ایک بار خیر سے واپس آجائیں۔ وہ سجدے میں پڑی رہیں۔ جتنی دعائیں یاد تھیں، سب پڑھ ڈالیں۔ جتنے صدمے گزرے تھے سب تصویروں کی طرح نظر کے سامنے سے گزرتے چلے گئے۔ ایک ایک کر کے سات بچے، جوان بھتیجا، مرزا کی جیل، جنگ دتی۔ اس ناتواں جی میں اب سکت کہاں رہی تھی اور صدمے کو اٹھانے کی، لیکن یہ سب صدمے ان کے بھی تو تھے بلکہ انھیں کے تھے۔ ہم ٹھہرے شریک حیات، صدموں کے بھی شریک۔ آنسو گالوں سے گزر کر جانماز پر گیلے دھبے بناتے رہے۔ جھکا ہوا سر جب ہی اُٹھا جب باہر سے خبر آئی کہ مرزا مع بچوں و ملازمین کے واپس آگئے ہیں۔

بیگم کے تردد کا سن کر بلکہ خود ہی محسوس کر کے مرزا مردان خانے میں ذرا کی ذرا ہی ٹھہرے، پھر تکان کے باوجود اندر آگئے۔

"آخر ہوا کیا تھا۔" دونوں لڑکے آن کر پہلو میں کھڑے ہو گئے تھے۔ انھیں لپٹاتے ہوئے بیگم نے رندھے ہوئے گلے سے پوچھا۔

"مکان سے کچھ ہی دور پر حاجی قطب الدین کا گھر ہے۔ اس میں کرنل براون صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں۔ لوگوں کو بلا بلا کر تفتیش ہو رہی ہے۔ انھوں نے طلب کیا تھا۔

بیگم خاموش رہیں۔ صرف سوالیہ نظروں سے گلابی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

"براون صاحب بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ جنھوں نے ہمارے بادشاہ کو بہ یک جنبش ابرو کہیں کا نہ چھوڑا ان کے لیے ہم کیا چیز تھے۔ اندیشہ تھا پھر جیل نہ بھیج دیے جائیں۔ ایک بار کا صدمہ آج تک نہ گیا۔" مرزا نے توقف کیا۔

"تیموری خون رگوں میں دوڑنے کے باوجود آج ہم ڈرے ہوئے تھے اور ڈر ہمیں خود سے زیادہ عارف مرحوم کی ان نشانیوں کا تھا۔ تلنگوں نے انگریز بچے مارے، یہ ہمارے بچے مار رہے ہیں۔ ایک کی جگہ دس۔ انھوں نے پھر توقف کیا۔ پھر رک کر بولے لیکن انگریز بہادر کو شگفتہ چھوڑ کر آئے۔"

"بھلا کیسے؟" امراؤ بیگم کے حواس اب واپس آنے لگے تھے۔

ہماری کلاہ پیاخ پر صاحب نے خاص طور پر نظریں ڈالیں اور قدرے خشک لہجے میں

پوچھا: "ویل تم مسلمان" ہم نے جواب دیا" آدھا" ان کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔" بیگم نے گلوں پر ہاتھ مارے۔" اوئی یہ کیا بات ہوئی۔ ایسے وقت میں بھی کلمۂ کفر۔"

مرزا کے نحیف چہرے پر تبسم کی لکیریں اُبھریں۔" یہی سوال صاحب نے بھی کیا۔ بس آپ کی طرح گلے نہیں پیٹے نہ اوئی کہا۔ قدرے چیں بہ جبیں ہو کر بولے" وہ کیسے۔"

ہم نے جواب دیا" شراب پیتا ہوں، سور کا گوشت نہیں کھاتا۔" ان کے چہرے سے شکنیں غائب ہو گئیں۔ تبسم فرمایا اور دوسرا سوال داغا۔" آپ انگریزی فوج کے دلّی جیتنے پر بانے" پر نہ آئے۔" جواب دیا" تلنگے باہر نہیں نکلنے دیتے۔ دوسری بڑی بات یہ کہ پالکی کے بغیر چل نہیں سکتا۔ اس نحیف و نزار باسٹھ برس کے بوڑھے کو دیکھیے۔ چاروں کہار فوجوں کے ڈر سے بھاگ نکلے۔ دعا کر سکتا ہوں۔ یہیں سے بیٹھ کر آپ کے لیے دعا کرتا رہا۔" براؤن صاحب نے پھر تبسم فرمایا:" کہا جاتا ہے، پڑوسیوں سے مطلب نہ رکھے گا۔"

وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ امراؤ بیگم نے ذرا کی ذرا رکنے کا اشارہ کر کے ملازمہ کو پاس بلایا۔ بٹوے سے نکال کر کچھ سکے اس کے ہاتھ پر رکھے کہ مرزا اور بچوں پر سے وار کے باہر پڑے سائلوں میں بانٹ آئے۔

عورتوں کے بٹوؤں سے نہیں تو پاندان کے نچلے خانے سے ہمیشہ کچھ نہ کچھ نکل ہی آتا ہے۔ مرزا نے پھر تبسم کیا گر چہ دل کو ایک رنج اندر ہی اندر چاٹ رہا تھا۔ کیا انسان صرف اپنے لیے ہی جیتا ہے۔ کیا وہ بنیادی طور پر خود غرض ہے؟ کیا انسانیت کا دم بھرنا ریاکاری ہے۔ کیا آج بچ جانے سے سارے مسئلے حل ہو گئے؟" غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج" کہنے کو تو کہہ دیا۔ موت سامنے دکھائی دی تو ڈر کیوں لگا۔ خبر آئی تھی مال جائے مرزا یوسف کے گھر بھی گورے گھس آئے تھے۔ ان سے بھی کوئی تعرض نہیں کیا لیکن مال اسباب جو بھی ملا اٹھالے گئے۔ ان کی اہلیہ مع عزیز النساء اور اس کے بچوں کے اور سدھار گئی تھیں۔ ہمیں بُرا لگا تھا لیکن اب سوچتے ہیں اچھا ہوا جو سدھار گئیں۔ ہماری ملکہ تو اب زینت محل مرزا جواں بخت کو لے کر لال کنویں والی حویلی چلی گئی تھیں تو ہم تا شا کس گنتی میں ہیں۔ لیکن بادشاہ کے پاس تو پوری فوج تھی۔ انگریزوں کے منہ لگنا عاقبت اندیشی نہیں تھی لیکن اب اس کے لیے ہم کیا کہیں۔ مرزا یوسف رہتے ہیں سرس والی

گلی میں۔ فراش خانہ اور کھاری باؤلی کے درمیان۔ بس جو ہماری بساط میں تھا، کیا۔ ایک بوڑھا دربان اور ویسی ہی بوڑھی تھوڑی کنیز تھی وہ ان کے پاس چھوڑ رکھی ہے۔ وہ راستے میں کہ نہ وہاں جانا ممکن ہے نہ کسی اور کو بھیجنا۔ یہ وہی مرزا یوسف ہے جسے ہم نے یوسف ثانی کہا۔ ہائے ہائے بھری جوانی میں کسی دشمن کے سحر سے دیوانہ ہو گیا۔ سحر کی بات صحیح ہو یا وہم، اس کی دیوانگی میں تو کلام نہیں۔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ غدار کہتے تھے۔ خیالات یلغار کرتے رہے۔

کب خادمہ نے ہاتھ دھلائے، کب سامنے کنگنی میں مونگ کی دال میں بھیگے چھلکے اور ایک پیالے میں ایک انڈے کی زردی پر مشتمل کھانا لا کر سامنے رکھا، انھیں کچھ یاد نہیں مشینی انداز میں ہاتھ چلتے رہے۔ ذہن نے یہ بھی نہ سوچا کہ بے گوشت کے نوالے نہیں توڑتے تھے۔ آج جو چھلکا مونگ کی دال میں ڈوبا ہوا آیا وہ گوشت کے شوربے میں ڈوبا ہوا تھا اور ایک پیالے میں قورمے کی بوٹیاں علاحدہ۔ کھانا تو مختصر ہو گیا تھا لیکن معیار تو تھا۔

وہ کیا کھاتا ہوگا۔ اسے کیا نصیب ہوتا ہوگا۔ سنا کہ گوروں کے گھس آنے کے بعد کہیں سے دو بندو آ نکلے۔ ان کی مدد سے یوسف کے ملازموں نے کھانے پینے کا انتظام کیا ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا تھا" مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو۔ لیکن ان لوگوں نے بھی کیا کیا ہوگا اور کتنا۔ دیوانہ اپنی خبر خود بھی تو نہیں رکھ پاتا کہ اطمینان ہوتا کہ چلو کچھ تو کر لے گا۔

○

دیوانہ ایک دن سڑک پر نکل گیا۔

دربان اور کنیز دونوں نے مل کر روکنے کی لاکھ کوشش کی لیکن وہ انھیں دھکے دیتا، چیختا چلاتا باہر دوڑا چلا گیا۔

ٹھائیں ٹھائیں۔ دو گوری بندوقوں نے ایک ساتھ آگ اُگلی۔

سو پشت سے چلے آ رہے پیشۂ آبا سپہ گری کو مرزا نوقان کی تیسری نسل میں برقرار رکھنے والا واحد شخص مرزا یوسف ہی تھا وہ بھی یوں ہوا۔

ٹھائیں ٹھائیں ٹھائیں۔ تین گورے تمنچوں نے ایک ساتھ آگ اُگلی۔

آل تیمور سے تین حسین جوان شہزادے، مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر خونی دروازے پر یوں میں یوں ہوئے۔ تاریخ نے بتایا تین نیم برہنہ لاشیں تین دن بے گور و کفن پڑی رہیں پھر بغیر کسی نالہ و شیون، نوحہ و ماتم دفن کر دی گئیں۔ شنکر نے اپنی تیسری آنکھ کھولی۔ دلی میں ہر طرف اُلّو بول گیا۔

اس عظیم الشان شہر کے مردوں کے گاؤں میں تبدیل ہو جانے پر لال قلعے کے دیوان خاص میں پادری رَوٹن (Padre Roton) نے عیسائی طریق عبادت کے تحت خدا کے حضور بڑے پیانے پر شکرانہ ادا کرنے کی رسم پوری کی۔

شکرانے کی عبادت کے دوسرے دن دہلی فیلڈ فورس کے سپاہی جو تعداد میں صرف ۲۶۰۰ تھے، بخت خاں اور اس کے ساتھی باغیوں کی تلاش میں آگرہ کی طرف روانہ ہوئے جہاں سے انھیں ہندوستان کی جنگ آزادی کے آخری مورچے یعنی لکھنؤ روانہ ہو کر برٹش ریزیڈنسی کو کمک پہنچانی تھی۔ لکھنؤ ریزیڈنسی بیگم حضرت محل کی قیادت میں ہندوستانی سپاہ کے محاصرے میں تھی۔ یہ دورش نہایت بھیانک تھی۔ انگریز کی نذر رچرڈ بارٹر نے اپنے روزنامچے میں لکھا:

"چاندنی چوک میں پھولی ہوئی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ ہمارے گھڑ سواروں اور توپ خانے کو ان کے اوپر سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ وہ پھولی ہوئی لاشیں گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے آ کر پھٹ جاتی تھیں۔ آلائش اور بدبو ناقابل برداشت تھے۔ گھوڑے تک اس کراہت کو محسوس کر رہے تھے وہ پھنکارتے جاتے اور یوں چلتے جیسے پھسل رہے ہوں۔"

مرزا یوسف کو نہیں معلوم تھا وہ کتنے خوش نصیب تھے کہ لٹھم پٹھم سہی، انھیں گور و کفن نصیب ہوا۔ ان کی پھولی ہوئی لاش کسی گھوڑے کی ٹاپوں کے نیچے آ کر نہیں پھٹی۔

○

حواس باختہ دربان کسی طرح گرتا پڑتا مرزا کی ڈیوڑھی تک پہنچا۔

مرزا نے نظریں اُٹھائیں۔ بد صورت، لا ہیئت بڈھا کون سی سناؤنی لے کر آیا۔ چہرے سے ظاہر ہے کہ کوئی خوش خبری نہیں ہے۔ اور اس دورِ پُر آشوب میں کیا کوئی کسی خوش خبری

کی امید کر سکتا ہے؟ ان لاعلاج غموں اور مرہم بیزار زخموں کے ہوتے ہوئے تو مجھے یہ سوچنا چاہیے کہ میں مر چکا ہوں، مجھے باز پرس کے لیے اُٹھایا گیا ہے اور میرے اعمال کی جزا کے طور پر مجھے دوزخ کے کنویں میں اُلٹا لٹکا دیا گیا ہے۔

"ارے کچھ بول بھائی، منہ تو کھول۔ تجھ سے کیا امید کروں۔"

تبھی اس نے بجلی گرائی۔ وہ گرم رفتار راہ نشہ آدھی رات کے قریب اس دنیا سے رخصت ہوا۔ وہ میرا بھائی جس نے تیس سال ہوش اور باقی تیس سال دیوانگی میں گزارے تھے، وہ جس کے پاس اس وقت بیوی بچے بھی نہ تھے۔ اس اکلوتے جاں باز بھائی کے پاس کیسے جاؤں کہ کم از کم میت کو تو خیر خوبی سے سپرد خاک کروں۔ لیکن وہ بھی کہاں کروں گا، کہاں لے جاؤں گا۔ پانی، رومال، غسال، گورکن کچھ تو نہ ملے گا۔ اینٹ، چونے، گارے کا تو ذکر کرنا ہی بیکار ہے۔ ساری دلی بے گور و کفن مردوں سے بھری پڑی ہے۔

بوڑھا دربان بت بنا کھڑا تھا۔ مرزا کی دھندلی آنکھوں سے بے آواز آنسو رواں تھے۔ انھوں نے ملازم کو اشارے سے بلایا۔ جاؤ بیگم سے کہو، کچھ نہیں تو دو چادریں کسی پرانے صندوق کی تہ سے برآمد کریں۔ میرے دیوانے کے جسد خاکی کو کفن کے نام پر کچھ تو مل جائے۔

پھر انھوں نے اس بوڑھے دربان کو مخاطب کیا جو خبر لایا تھا۔

"مرزا یوسف مرحوم کو ـــــ ہائے ہائے مرحوم" انھوں نے توقف کیا۔

"مرزا یوسف مرحوم کو چار دن بخار آیا..." بوڑھے نے حیرانی سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"وہ تو باہر نکل گئے تھے وہاں..." اس نے کہا۔

مرزا نے بات کاٹ دی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خاموش زبان میں کچھ کہا۔ وہ دھندلی، باسٹھ برس پرانی آنکھیں پتھر کی طرح سخت ہو اُٹھی تھیں اور کہہ رہی تھیں "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" تو چپ ہو جا۔ بوڑھا غالب جیسے ذہین و فطین دماغ کے یہاں پرورش پایا ہوا انسان تھا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ پھر اثبات میں چند سر ہلائے جیسے کہہ رہا ہو "سمجھ گیا حضت۔"

خادمہ کچھ دیر بعد دو پرانی چادریں لے کر برآمد ہوئی اور ایک روپیہ۔

"یہ لے جاؤ میاں۔ آس پاس سے کوئی آ سکے تو بلا لو۔ پانی کہاں سے لاؤ گے یہ تم

جانو۔" انھوں نے آنسو پونچھے۔

اندر آہ و بکا کی آواز بلند ہوئی۔

۱۹ فروری ۱۸۵۷ء کو مرزا یوسف کو مکان کے پہلو میں ایستادہ مسجد تیمور خاں میں گڑھا کھود کر ان چادروں میں لپیٹ کر سپردِ خاک کر دیا گیا۔

زندگی کی شام میں جب حواس خستہ کند ہو رہے تھے، جب باقی ایام گھسٹ گھسٹ کر بسر ہوتے تھے، قضا و قدر نے غالب کو ایک آخری چرکہ اور لگایا۔ دستنبو میں ایک واقعہ اور شامل ہوا۔ آلِ تیمور ختم ہوئی، ایک پورا دور ختم ہوا، غالب ختم ہوئے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

○○○

اڑوس پڑوس میں ایک آدمی

پچھلے کئی دنوں کی طرح آج بھی نصیر میاں اہانت کے اسی شدید احساس کے ساتھ واپس لوٹے تھے۔ لگاتار تیرہ دن سے ایک بڑے آدمی کے یہاں حاضری دے رہے تھے۔ دو دن تو باریابی ہی نہ ہو سکی۔ آج صبح آٹھ بجتے بجتے ہی دربار میں حاضر ہو گئے تھے۔ وہ تو اور سویرے آ جاتے لیکن سوچا کہ کہیں اسٹاف کی تیز تیز نظروں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ایک دن تو معمولی سا دو ٹکے کا خدمت گار آنکھیں نکالتا پاس سے گزر گیا تھا۔ "چلے آتے ہیں سویرے سویرے۔ غرض کے بندے۔" گرچہ کئی غرض کے بندے اور بھی بیٹھے ہوتے تھے، لیکن انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ جملہ تھپیڑ کی طرح ٹھیک ان کے منھ پر پڑا ہو۔ آخر بڑے بابو تھے۔ ان کے آفس کا چپراسی ہاتھ اُٹھا کر انھیں سلام کرتا تھا۔ جونیئر کلرک اور اسٹینو ٹائپسٹ انھیں سر کہتے تھے۔ ریٹائر ہونے میں کچھ ہی عرصہ باقی رہ گیا تھا۔

آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ جاڑوں کی صبح آٹھ بجے بھی خاصا سویرا تھا۔ غضب کی ٹھنڈ پڑ رہی تھی اوپر سے کہرا الگ۔ پھر بھی لوگ اٹھے تھے۔ غرض کے بندے۔ کرسیاں سب بھر چکی تھیں۔ وہ بینچ پر بیٹھ گئے۔ ان کے بالکل بغل میں ایک دھوتی پوش حضرت روئی کی بنڈی پہنے ہتھیلی پر رکھے تمباکو کو مسل کر ہٹاپٹ تالیاں ٹھونک رہے تھے۔ بالآخر انھوں نے تمباکو منھ میں رکھا اور چوپتے ہوئے بولے۔ "مجھتر کے ہیں آپ؟"

نصیر میاں نے قدرے رُکھائی سے جواب دیا۔ "جی نہیں۔"

"تب تو کام ہونا مشکل ہے۔"

جی میں آیا کہیں تھو۔ آپ کے منہ میں خاک۔ کیا مہینوں سے ہم اسی لیے در کی مٹی لے رہے ہیں کہ کام نہ ہو۔ لیکن اجنبی آدمی وہ بھی بزرگ، منہ لگنا مناسب نہیں سمجھا۔ ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد کہیں ان بڑے میاں کا نمبر آیا جو اس دوران سوال کر کر کے نصیر میاں کا دماغ چاٹ چکے تھے۔ ان کے فوراً بعد نصیر میاں کی طلبی ہونے ہی والی تھی کہ ایک چمچماتی ہوئی سیاہ ایمبیسڈر آ کر رکی۔ اس میں سے ایک بڑے باوقار بلند قامت، سفید بالوں والے کھدر پوش صاحب اترے۔ لوگوں نے بڑی مرعوب نظروں سے انھیں دیکھا۔ تمباکو تھوکنے والے بزرگ اندر سے باہر نکل رہے تھے۔ پھسپھسا کر نصیر میاں کے کان میں بولے۔ نرنجن بابو ہیں۔ پھول پور سے جیت کر آئے ہیں۔ ویسے بھی پرانے کھلاڑی ہیں اور اپنے صاحب کے لنگوٹیا یار۔ نرنجن بابو کو دیکھ کر ڈیوٹی پر ایستادہ سارے اسٹاف نے سلام جھاڑا --- اور کائی کی طرح پھٹ کر ادھر ادھر ہو گیا۔ وہ دراتے ہوئے اندر چلے گئے پھر قہقہوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ کچھ دیر بعد ایک ملازم چائے کی کشتی لے کر ادھر سے گزرا۔

نصیر میاں کی بھوک یک لخت چمک گئی۔ صبح سویرے چائے پینے کی عادت تھی، بس وہی پی تھی اور ہاں ایک چٹکی بھگوئے ہوئے چنے۔ اب اس کو ناشتہ کہیے یا بیڈ ٹی اور اب گیارہ بج رہے تھے۔ کیا قسمت ہے۔ ایک نرنجن بابو ہیں کہ اتنی بڑی بڑی ہستیوں کے دربار میں دراتے چلے جاتے ہیں۔ اسٹاف سلامی دیتا ہے۔ چائے کی کشتی سج کر سامنے آ جاتی ہے۔ ایک ہم ہیں اُلّو کے پٹھے --- نادان کے کیڑے --- بیٹھے سوکھ رہے ہیں۔ ان کا جی چاہا ان سب کو بے نقط سنانا شروع کریں۔ نرنجن بابو کا سر توڑ دیں۔ جن سے ملنے آئے تھے، انھیں بے دخل کر کے خود ان کی کرسی پر بیٹھ جائیں، مگر نصیر میاں کے پاس الہ دین کا چراغ نہیں تھا۔ ہوتا تو وہ یہاں بیٹھے یہ ساری اوٹ پٹانگ باتیں کیوں سوچ رہے ہوتے۔ مزے سے روپوں کے پہاڑ اور سونے کے ڈھیر کھڑے کر لیے ہوتے۔ کسی کام کی بھی ضرورت نہ پڑتی۔ دس غرض مند خود ان کے چاروں طرف منڈلاتے۔

اپنی باری آ جانے کے بعد یہ طویل انتظار۔ طبیعت بے طرح مکدر ہو گئی --- فیض آباد جانا تھا۔ دوپہر کی بس چھوٹ گئی۔ اس کی پریشانی الگ۔ خدا خدا کر کے بلاوا آیا۔ اندر پہنچے۔

صاحب نے سنہرے فریم میں جڑے شیشوں کے پیچھے سے غور سے انھیں دیکھا۔ چہرے پر کبیدگی کے آثار نظر آئے۔ ''آپ پھر چلے آئے۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی تو.....''

''جناب کو یاد دہانی کرانا ضروری سمجھا۔ جناب اتنے مصروف رہتے ہیں۔'' نصیر میاں گھگھیائے۔

''یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ ہماری یادداشت ہماری ساری مصروفیتوں کے باوجود بالکل اپنی جگہ پر ہے۔'' انھوں نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔

''میرا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا جناب.....''

''مطلب آپ کا کچھ بھی ہو۔'' انھوں نے نصیر میاں کی بات دو بارہ درمیان سے کاٹی۔ ''آپ یہاں آ کر اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کریں۔ ابھی تو محکمے سے آسامیاں نکلی تک نہیں ہیں۔ جب بھی نکلیں آپ کا خیال رکھا جائے گا۔ آپ رام بھجن سنگھ کی پیروی لے کر آتے ہیں جائیے چپ چاپ بیٹھیے۔''

''جناب یہ پرچہ چھوڑ جاتا ہوں۔ اس میں لڑکے کا نام اور بایو ڈاٹا.....''

اس مرتبہ صاحب کی آواز میں جھنجھلاہٹ بہت واضح تھی۔ ''یہ بھی ہمارے پاس موجود ہے ایک مہینہ پہلے بھی آپ خود آ کر دے گئے تھے۔'' اسی سانس میں انھوں نے چپراسی کو مخاطب کیا۔ اور کتنے لوگ ہیں؟''

''بس دو چار آدمی رہ گئے ہیں سر۔''

چپراسی نے ادب سے جواب دیا اور دروازے کے پٹ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے کہہ رہا ہو ''لیجیے اب اٹھیے۔'' نصیر میاں ایک اضطراری حرکت کے تحت کھٹ سے اٹھ کھڑے ہو گئے۔ جاتے جاتے انھوں نے سنا۔ ''معلوم ہوتا ہے کھوپڑی میں عقل نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ کتنی بار کہا کہ بار بار آنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے صحیح وقت پر ایک بار آ کر مل لیجیے گا، لیکن بعض لوگ تو بس چیچڑی کی طرح چمٹ جاتے ہیں۔'' --- کانوں میں جیسے کسی نے گرم تیل ڈال دیا۔ دوپہر والی بس چھوٹ گئی ہو گی۔ اب تو رات کو ہی جا سکیں گے۔ جاڑوں میں رات کا سفر خاصا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ لیکن جانا بھی ضروری ہے۔ وہاں بھی ایک ملازمت کے سلسلے میں ایک موہوم سی امید

تھی۔ ایک بار سوخ رشتہ دار نے ایک افسر کے نام ایک خط دے دیا تھا۔ شاید قسمت ساتھ دے جائے۔ امید پر تو دنیا قائم ہے۔ یہ گھسا پٹا سا محاورہ بڑا سہارا دیتا معلوم ہوتا تھا اور نصیر میاں کا ذہن وقتاً فوقتاً اس کی گردان کرتا رہا تھا۔ لیکن فی الحال تو گھر واپس جانا تھا۔ رات تک فیض آباد کے لیے کوئی سواری نہیں تھی۔ نہ ریل نہ بس۔ جھولا اور منھ دونوں لٹکائے واپس گھر پہنچے تو دیکھا بڑا سا تالا منھ چڑا رہا ہے۔ بیوی نے سوچا ہوگا کہ نصیر میاں کو دربار کی حاضری دینے کے بعد وہیں سے وہیں فیض آباد نکل جانا ہے، اس لیے خود نکل کھڑی ہوئیں تفریح کو۔ نصیر میاں کا جی چاہا کہ وہ ان کے کھچڑی بالوں کی چوٹی کو، جو اب بھی ویسی ہی لانبی اور گھنی تھی، جیسی پینتیس برس پہلے، پکڑ کر دو چار جھٹکے دیں۔ لیکن نہ تو وہ سامنے تھیں اور نہ نصیر میاں کی مجال ہو سکتی تھی کہ وہ ایسی کوئی حرکت کر گزریں۔ شرافت تو خیر ماں باپ اللہ ان سے سمجھے، ورثے میں دے گئے تھے اوپر سے ایسی ذہین عورت سے شادی کر گئے تھے کہ نصیر میاں خون کے گھونٹ پی پی کر بہت سی چیزوں کو نظر انداز نہ کریں تو دو چار جھانپڑ انہی کو رسید کر دے۔ انھوں نے ذرا کی ذرا سوچا کہ آفس چلے جائیں۔ ویسے بھی گیارہ بجنے سے پہلے کبھی دفتر نہیں پہنچتے تھے۔ کبھی ساڑھے گیارہ، پونے بارہ بھی ہو جاتے --- سرکار وقت کے پابند لوگوں کو کون سا تمغہ دیے جا رہی ہے۔ اور دے بھی تو کہیں تمغوں سے پیٹ بھرا کرتے ہیں۔ انھوں نے گھڑی پر نظر ڈالی ایک بج گیا تھا۔ آج انھوں نے چھٹی لی تھی۔ اب کل بھی لینی پڑ جائے گی۔ لیکن گھڑی پر نظر ڈال کر انھوں نے آفس جانے کا ارادہ بدل دیا۔ دروازے کے تالے کی ایک ڈپلی کیٹ چابی ان کے پاس رہا کرتی تھی انھوں نے جیبی بٹوے سے چابی نکالی اور تالا کھولا۔ اندر گھسے تو سیدھے باورچی خانے کی طرف لپکے، لیکن ان کی شکر ہی پی تو گھر کے اندر سب طرف تالے لگے تھی کہ کوئی چور چکار گھس آئے تو کم از کم آسانی کے ساتھ تو سب کچھ نہ اٹھا لے جائے۔ کچھ تو زحمت کرے۔ یہ نہ معلوم ہو کہ خاتون خانہ خود اس کی خدمت میں سارا سامان حاضر کر گئی ہیں۔ دروازے کا تالا کھولنے کے بعد صرف ایک چھوٹے سے برآمدے میں رسائی تھی --- وہاں ایک آرام کرسی پڑی رہتی تھی اور گھر میں اور کہیں جگہ نہ ہونے کے سبب فریج بھی وہیں رکھا ہوا تھا۔ انھوں نے سوچا اور کچھ ہو نہ ہو، فریج میں دودھ تو ہوگا ہی اور دو چار پھل بھی ضرور پڑے ہوں گے۔

بیوی کی گردن کا تصور کر کے انھوں نے فریج کے ہینڈل کو زرا زور کا جھٹکا دیا، لیکن وہ تو فریج میں بھی چابی گھما گئی تھیں۔ دھم سے وہ وہیں آرام کرسی پر ڈھیر ہو گئے۔ خون ان کی کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ جی چاہا فریج کو دو لاتیں جمائیں۔ لیکن فریج بے حد قیمتی تھا اس کو خریدنے اور پھر ہمہ وقت بھرا پرا رکھنے کے لیے انھوں نے ایمان بیچا تھا۔

نصیر میاں کا ضمیر کبھی کبھی بڑے کچوکے لگاتا تھا۔ خاص کر ایسے موقع پر کہ وہ کنبے کو ساری آسائشیں مہیا کرائیں اور بیوی کا یہ حال کہ ادھر شوہر دفتر گئے ادھر انھوں نے سر پر چادر ڈالی اور نکل کھڑی ہوئیں۔ شاید اسی آزادی کو حاصل کرنے کے لیے لڑکیوں کی شادی کے لیے ادھم مچا رکھا تھا۔ خیر ان کی شادیاں جلد کر دیں یہ تو اچھا ہی ہوا۔ لیکن یہ صاحبزادے، گریجویشن کیے تین سال ہو گئے کتنا سمجھایا پی ایچ ڈی کر ڈالو۔ آج کل لیکچر کے اسکیل بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ پھر جلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ آوے چوکھا۔ بس کبھی کبھار اسکول چلے گئے یا پھر نہیں بھی گئے۔ مہینے کے مہینے تنخواہ حاضر۔ فرمانے لگے لیکچری وکچری ہم سے نہ ہوگی۔ تو افسری کے خواب دیکھ رہے ہو۔ چلو۔ یہی سہی۔ لیکن اس کے لیے ورزشی جسم کو ذرا زحمت تو دو۔ کوچنگ جوائن کرو۔ مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھو۔ افسری یوں تو جھولے میں آ کے گرے گی نہیں --- بولے "افسری کا ہمارا منھ ہے---؟ گردھاری لال اسمارک پاٹھ شالہ میں پڑھایا پھر گورنمنٹ کالج میں۔ یہ نہ ہوا کہ انگریزی اسکول میں پڑھاتے۔ اب کہہ رہے ہیں کہ مقابلے کے امتحان کی تیاری کرو۔ بینک والے امتحان میں بیٹھے تھے کیا ہوا؟"

وہ لونڈے کی اس بدزبانی پر ہکا بکا رہ گئے تھے۔ اب سے پچیس برس پہلے وہ صرف ناپسند تھے۔ اور بہت ایمان دار بھی۔ یہ لڑکا جب پیدا ہوا تھا، اس وقت ان کے طبقے میں انگریزی اسکولوں کا دور دور رواج نہیں تھا۔ خدا بخشے اماں ابا سے۔ لاحول ولا قوۃ وہ کیا کیا سوچتے رہتے ہیں۔ گناہوں میں اضافہ ہوگا۔ والدین کے لیے تو خدا بخشے جیسے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں۔ ہاں تو خدا بخشے اماں ابا کو ان کی شادی کی اس قدر جلدی تھی کہ نصیر میاں کو بائیسواں برس لگا ہی تھا کہ چند بیگھہ کھیتوں کے سہارے بہو بیاہ لائے۔ ڈیڑھ برس میں دو بیٹیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ کچھ عرصہ نہ جانے کیسے قدرت نے خالی رکھا پھر یہ منھ پھٹ، بدزبان، شاہ خرچ، نواب

کے ہی تشریف لائے۔ اماں نے ڈھول پیٹ ڈالا۔ محلے بھر میں لڈو بانٹے۔ خدا بخشے اس وقت زندہ تھیں پوتے کا منہ دیکھ کر پھولی نہ سمائیں۔

منہ میں کڑوے کڑوے سے مزے کے باوجود نصیر میاں مسکرا پڑے۔

وہ بچہ کتنا دلچسپ تھا۔ کتنا من موہنا۔ کیسا پیارا؟ کہاں کھو گیا؟ مسکراہٹ میں آزردگی گھل گئی۔ ایسا لگتا ہے آج کے اس باریک سیاہ مونچھوں، کڑیل جسم اور پانچ فٹ دس انچ کے قد آور نوجوان سے اس بچے کا کوئی تعلق نہیں ہے جس نے ان کے گھر کو خوشیوں سے منور کر دیا تھا۔ جس کی ذرا سی بیماری میں وہ اور ان کی بیوی رات رات بھر جاگتے رہ جاتے تھے۔ جس کی تعلیم مکمل کرانے کے لیے انھوں نے کبھی عمدہ غذا نہیں کھائی تھی۔ اچھے کپڑے نہیں پہنے تھے۔ جسے کلیجے سے لگا کر پیار کرنے سے بڑا سکھ دنیا میں نہیں تھا۔ لیکن اب یہ کون ہے اس کی جگہ جو جنگلی بلے کی طرح غراتا اور انھیں ان کی نااہلی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔

''اب کے جاڑوں میں نیا سوٹ ضرور بن جائے۔ بس کہہ دیا ہاں۔''

''گھر میں فرج نہیں ہے۔ میرے یار دوست آتے ہیں تو بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔''

''پاپا، آپ ذرا اپنا حلیہ درست رکھا کیجیے۔ یہ کیا کہ گلی بنیان پہنے مشتری میں سڑپ سڑپ کر کے چائے پیتے رہتے ہیں۔''

مگر خود اسے دوسروں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اماں بیمار تھیں، مگر پھر بھی کالج کے ٹور میں ملتان چلا گیا۔ چاہنے والی دادی اس کی غیر موجودگی میں گزر گئیں۔ ذرا سی ذرا آنسو پونچھے پھر وہی آوارہ گردی۔ کیا ایم اے جوائن کر لو۔ جواب ملا کیوں کروں؟ بلاوجہ دو سال برباد ہوں گے۔ زیادہ تر نوکریوں کے لیے صرف گریجویشن درکار ہے۔ نصیر میاں نے سمجھایا کہ لیکچرشپ مل سکتی ہے استہزائیہ لہجے میں بولے۔ ''آپ کس دنیا میں رہتے ہیں پاپا۔ اب صرف ایم اے سے کام نہیں چلتا۔ اس کے لیے پی ایچ ڈی بھی چاہیے اور پی ایچ ڈی کے لیے محنت درکار نہیں ہیں پچیس ہزار روپے چاہئیں۔ اب میں ایم اے میں دو سال لگاؤں۔ اس کے بعد ڈاکٹریٹ کا انتظار کروں اور پھر نوکری کا۔ اس سے اچھا تو ہے کہ آپ مجھے بزنس کرا دیں۔

''چھوٹا موٹا کام شوق سے کرو میاں۔ پانچ دس ہزار دے سکتا ہوں۔ بزنس تو ننگ بھی ہے۔''

''دیکھیے پاپا، میں خوانچہ لگانے سے رہا۔ بزنس کا مطلب باعزت بزنس۔ پانچ دس ہزار میں تو پان کی دکان ہی ہو سکتی ہے۔ ساٹھ ستر ہزار روپے کو تیار ہوں تو ہو لے۔''

نصیر میاں کا دل ڈوبنے لگا۔ ''ارے بھائی اتنا پیسہ کہاں سے لاؤں گا۔ ابھی بہت کچھ اور بھی تو کرنا باقی ہے۔'' صاحبزادے کے پاس جواب حاضر تھا اور ترکیب بھی۔ کہنے لگے گاؤں کی زمین بیچ دیجیے کچھ بچا ہوگا ہی کچھ پراویڈنٹ فنڈ سے نکلوا لیجیے۔

نصیر میاں دوبارہ سناٹے میں آ گئے۔ باپ دادا کی چھوڑی ہوئی زمینوں کا ایک حصہ بیچ ہی چکے تھے۔ کچھ وہ رقم تھی کچھ زندگی بھر کی گلی بنیان پہن کے، آلو روٹی کھا کے، پھوڑا جائے سڑپ سڑپ کر کے بیچ کی تھی۔ ان سب کو ملا کے دو بیٹیاں بیاہیں۔ والدین کا بڑھاپا نباہا۔ اب کیرئیر کے آخر میں بے کار صاحبزادے کے سوٹوں اور فرج اور ڈائننگ ٹیبل اور یار باشی کے لیے ایمان بیچ رہے تھے۔ خیر ایمان بیچنے سے رہنے کی تنگی نہیں ہوتی۔ بس سنا ہے کہ قبر تنگ ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے وہ نماز پڑھتے رہے تھے۔ پہلے گنڈے دار اور اب باقاعدگی سے۔ نارمل عمر پائی تو اس وقت تک ثواب کا پلڑا گناہوں کے پلڑے سے بھاری ہو چکا ہوگا۔ لیکن مکان نہ بنا سکے تو کیا ہوگا۔ سوچا تھا ریٹائرمنٹ کے وقت جو پیسہ ملے گا وہ تو ناکافی ہوگا۔ زمینیں بیچ کر ہی مکان بنوائیں گے۔ ورنہ رہیں گے کہاں۔ تیرے میرے گھر میں۔ کرائے تو آسمان کو چھو رہے ہیں۔ قلیل پنشن میں سے کرایہ ادا کریں گے یا کھائیں گے۔ پھر بڑھاپے میں سو طرح کے مسائل۔ بزنس کا کیا ٹھکانہ — صاحبزادے نے رقم ڈبو دی تو کھانے کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔ بالفرض محال شیخ چلی کے خواب پورے بھی ہو جائیں اور بزنس چل نکلے اور صاحبزادے مکان بنوائیں تو کیا اس میں نصیر میاں جیسے حساس انسان کو احساسِ ملکیت ہو سکے گا؟ صاحبزادے اپنا خون ہو کر یہ برتاؤ کر رہے ہیں تو بہو تو نہ جانے کیا کچھ کرے گی۔ شاید گھر سے نکال باہر ہی کر دے نہ ہا ہا۔

نصیر میاں کے سامنے اپنی نااہلی اور شقی القلبی کا داغ دھونے کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ دوڑ دھوپ کر کے صاحبزادے کو کسی ایسی ملازمت سے لگوا دیں جو ان کی نظروں میں نامعقول نہ ہو۔ ورنہ ابھی تو صرف وہ پوچھتے ہیں کہ پاپا کیا کیا آپ نے ہمارے لیے۔ مستقبل میں آنے والی اولادوں

کی نسلیں نصیر میاں کی نالائقی کو بطور مثال پیش کرنے لگیں گی۔

اچانک کسی نے زور سے دروازہ بھڑ بھڑایا۔ وہ چونک کر اُٹھے۔ شاید بیگم سارے محلے میں چلے پاؤں کی بلی کی طرح گھوم کر واپس آ گئی ہوں اور باورچی خانہ کھلے، لیکن دروازہ کھولا تو بیٹا تھا۔ سگریٹ پھونک رہا تھا۔ شاید اسے یہ امید نہیں تھی کہ دروازہ کے پیچھے سے پاپا نمودار ہوں گے۔ جلدی سے سگریٹ والا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ نصیر میاں کو بے حد طمانیت کا احساس ہوا۔ کم از کم اتنا لحاظ تو باقی ہے۔ وہ نہال ہو گئے۔

''منسٹر صاحب کے یہاں سے آ رہا ہوں۔'' کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد انھوں نے خود ہی بیٹے کو مخاطب کیا۔

''نہ جانے کب سے چکر لگا رہے ہیں۔ آج کون سا تیر مار آئے؟'' اس نے بے رخی سے کہا۔

''کتے کی دُم --- ہمیشہ ٹیڑھا رہے گا اور ٹیڑھا ہی بولے گا۔'' نصیر میاں نے سوچا لیکن غصہ قابو میں کر کے نرم آواز میں بولے --- ''آج انھوں نے پورا اطمینان دلایا ہے۔ جگہیں ابھی نکلی نہیں ہیں۔ نکلیں تو کارروائی پوری ہونے کے بعد تمہیں سپروائزر کا عہدہ مل جائے گا۔''

لڑکے کے چہرے پر تمسخر اور استہزا بہت واضح تھے۔ بغیر کوئی جواب دیے اس نے جیب سے ڈپلی کیٹ چابیوں کا گچھا برآمد کیا۔ اور اپنے کمرے کا دروازہ کھولنے لگا۔

''تمہاری والدہ کہاں مر گئیں۔'' ذہن میں آنے والے اس جملے سے انھوں نے ایک لفظ کاٹ دیا۔ اور لڑکے سے پوچھا۔ ''تمہاری والدہ کہاں گئیں؟''

''کیا پتہ؟'' اس کے لہجے میں بیزاری تھی۔ ''بازار میں ماری ماری پھر رہی ہوں گی۔ چھوٹی آپا کے یہاں چوتھا بچہ آنے والا ہے۔ اسی کے لیے کپڑے لتے بنانے کی تیاری میں مصروف ہیں۔'' پھر وہ کمرے میں چلا گیا۔ یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ کب آئے۔ کب سے برآمدے میں پڑے ہیں۔ فیض آباد جانے کا کہہ کر گئے تھے، وہاں کیوں نہیں جا سکے۔ ایک پیالی چائے اور ایک پھنکی چنوں کے بعد کچھ کھایا نہیں۔

نصیر میاں کے گلے میں کچھ پھنسنے لگا --- بھوک سے آنتیں الگ قل ھو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ کچھ دیر وہ ساکت بیٹھے رہے۔ پھر خود ہی اُٹھ کر لڑکے کے کمرے میں گئے اور شکست خوردہ سی آواز میں بولے۔

''باورچی خانہ کھول دو۔ صبح سے کچھ کھایا نہیں ہے۔''

OOO